آبلۂ دِل کا

(ناول)

ڈاکٹر احسن فاروقی

ام، اے۔ پی، ایچ، ڈی

اُردو اکیڈمی سِندھ

رحمت بلڈنگ، بندر روڈ، کراچی

مطبوعہ.......... مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی
پہلی بار............ دسمبر ۱۹۵۵ء

قیمت
چار روپے

پنجاب آفس
اُردو مرکز
گنپت روڈ، لاہور

ماشے اللہ سے ایم-اے

ناظرین!

یوں سمجھیے کہ ایک زمانے میں ایک شہر تھا۔ کوئی شہر تصور کر لیجیے۔ ارے لکھنؤ ہی تصور کر لیجیے اس شہر میں لاکھوں گھر تھے جیسے ہر شہر میں ہوتے ہیں مگر پانچ گھر مخصوص تھے اس لئے مخصوص کہ اگر آپ تخیل کے ہوائی جہاز پر اڑ کر اس شہر کو دیکھیے تو یہی پانچ گھر نمایاں دکھائی دیتے اور اگر آپ بیس برس تک (فرض کیجیے سنہ ۳۰ء سے سنہ ۵۰ء تک) متواتر اڑتے ہی رہتے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ بیس برس تک زمین پر اترتے ہی نا۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ کافی وقفوں کے بعد کسی کسی دن اوپر اڑ گئے اور نیچے دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے تو آپ کو ان گھروں میں نہایت معمولی اور پھر بھی نہایت عجیب واقعات گزرتے ہوئے دکھائی دیتے۔

پھر یوں سمجھیے کہ یہ بیس برس کا عرصہ گزار چکنے کے بعد کسی رات کو اکیلے گھر میں پلنگ پر لیٹے تارے گنتے ہوئے آپ پر خدانخواستہ خبط سوار ہو جاتا۔ جی ہاں یہ خبط ہی ہوا کہ آپ کو آسمان پر ایک پنشاخہ دکھائی دیتا۔ ارے جناب پرانے زمانے والوں کو ایسے خبطوں کے ماتحت نہ معلوم کیا کیا چیزیں دکھائی دے چکی ہیں اگر آپ کو پنشاخہ دکھائی دیتا تو کیا بڑی بات تھی۔ اور اس پنشاخے کی ہر شاخ اپنی جگہ مکمل اور الگ اور پھر بھی پورے پنشاخے سے ملی ہوئی دکھائی دیتی۔ ہر شاخ الگ الگ شعلہ دے رہی ہوتی جس کا دوسری شاخ کے شعلے سے کچھ تعلق نہ ہوتا اور سب شعلوں کی روشنی مل کر اگر تاریکی کو کم نہ کر رہی ہوتی تو آپ کے خبط کو بڑھا ضرور رہی ہوتی تو آپ کیا کرتے؟

کیا کرتے! کچھ بھی نہ کرتے۔ آپ کو اپنے پر قابو ہی کب ہوتا جو آپ کچھ کرتے۔ جو خبط آپ کے سر پر سوار ہوتا اس کے ماتحت جو کچھ بھی ہو رہا تھا کم تھا۔ آپ گانے بجانے لگتے۔ ناچنے کودنے لگتے یا آپ کے ہاتھ میں برش ہوتا اور صفحۂ قرطاس پر چلنے لگتا یا قلم ہوتا اور صفحۂ کاغذ پر چلنے لگتا۔ غرض ایسی ہی کچھ مجنونانہ حرکتیں آپ سے سرزد ہوئے بغیر نہ رہتیں۔

آپ برا نہ مانیے آپ کو نہیں خبط ہوا مجھے۔ پنشاخہ دیکھا میں نے۔ اور کیونکہ قلم خواہ مخواہ

چلاتے رہنے کا عادی ہوں میں اس لئے اس "جنون پنشاخہ" میں گرفتار ہوتے ہی میرے قلم نے ایک پنشاخہ بنایا۔ دیکھئے اس صورت کا کہ ہر شاخ کا الگ نام۔ آپ کو زحمت تو ہوگی مگر آپ پنشاخے کا تصور رہا ندھیں اور میں ہر شاخ کا نام لیتا ہوں :۔

پہلی شاخ "آبلہ دل کا" رقیبان گوش بر آواز و او در ناز و من ترساں — سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

دوسری "وہ سنگ گراں اور" جہاں بگشتم و درد ایچ شہر و دیار — نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

تیسری "یہ وہ بہاریں تو نہیں"

چوتھی "زخمہائے زنداں" رگ دیے ہیں جب ... ہر غم تو دیکھئے کیا ہو — ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

پانچویں "تازہ بستیاں آباد" حریم کعبہ شکست و اساس قبلہ بریخت — بطرح تازہ یکے قصر بے قصور نہیم

واضح رہے کہ ہر شاخ الگ ہے۔ اس کا کلیتہ الگ ہے۔ اس کا شعلہ الگ ہے۔ فرض کیجئے آپ کی نظر پہلے تیسرے پر پڑی تو یہ ضروری نہ ہوگا کہ آپ پہلی یا دوسری کو بھی دیکھ لیں تب تیسری سے دلچسپی لے سکیں۔ ہرگز نہیں۔ یا یہ کہ پہلی کو دیکھکر آپ جھجک جائیں اور کہیں "یہ کوئی مسلسل ایک چیز ہے ایک کو دیکھا تو پانچوں کو دیکھنا پڑیگا" ہرگز نہیں۔ یہ جھجک آپ دل سے نکال دیں!

اب رہی اس پنشاخے کی روشنی تو اُس کے بابت کیا کہوں۔ کیا کہوں ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ عام سرخ روشنی جو ہوا کرتی ہے وہ تو مجھے دکھائی نہ دی تھی۔ رنگوں میں تحلیل کی ہوئی روشنی عالموں کو صحیح دماغ کی حالت میں دکھائی دیتی ہے جنوں کے عالم میں تو مرکب سفید روشنی ہی نظر آتی ہے۔ آفتاب کی روشنی!

آفتاب کی روشنی جی ہاں! وہ چاہے آفتاب سے براہ راست آئے یا ماہتاب سے ہوکر آئے وہ ہی روشنی ہے جس میں سب رنگوں کی روشنیاں موجود ہوتی ہیں وہی روشنی جنون پیدا کرتی ہے۔ وہی جنون جس میں آکر فن کار پیر رومی کا مرید ہوکر چیخ اٹھتا ہے :

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

آبلہ دل کا

I

II

III

IV

V

اِس شہرِ نگار کی یاد میں جو بغیر لُٹے مِٹ گیا

جو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم
غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے

(اقبال)

I

بی-اے ہوئے......

(۱)

جب نواب میرزا منظور حسین خاں صاحب بہادر کے صاحبزادے مسٹر سید محبوب عالم رضوی، بی-اے ڈگری کی چونگی ہاتھ میں لئے گون جھلاتے اپنے گھر کے اندر داخل ہوئے تو سب میں پہلے ان کی چھوٹی بہن افسر کی نگاہ ان پر پڑی- وہ ڈیوڑھی کے پاس بیٹھی کھیل رہی تھی بھائی کو ایک عجوبہ شان سے آتے ہوئے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور تالیاں بجا بجا کر کہنے لگی-

"اوہو- ہو- بھائی صاحب تو تولوبن یاتے- اوے- اوے- اوے"

محبوب عالم اس وقت فاتحانہ شان سے گھر میں داخل ہوئے تھے- ان کے کپڑے تو وہی تھے جو وہ صبح کو پہن کر گئے تھے، وہی ایرانی ٹوپی جس کی نگمردوں پر دو دو انچ جما ہوا میل ایک دن پہلے صاف کرایا گیا تھا، وہی کالے کشمیرے کی شیروانی جس پر استری کرائی گئی تھی، وہی سفید دھلا ہوا پے جامہ جس میں چرسیں نمایاں تھیں، وہی نوکدار بادامی جوتا جس کو پالش سے خوب چمکایا گیا تھا- مگر اب ان سب پر منگے سیاہ الپاکے کا گون شاہانہ زینت دے رہا تھا- وہ بہت کچھ بدلے ہوئے ضرور نظر آ رہے تھے- ان کی گردن جو عموماً داہنے شانے پر تینتیس درجے پینتالیس منٹ کا زاویہ بنایا کرتی تھی، اس وقت مستقل ساٹھ درجے سے بھی کچھ زیادہ تک اٹھی ہوئی تھی- ان کی ریڑھ کی ہڈی جو قدرت نے ٹیڑھی ہی بنائی تھی اس وقت تعجب انگیز حد تک سیدھی ہو گئی تھی- ان کی چال میں جب پر غور سے دیکھنے والوں کو لنگ کا شبہ ہوا کرتا تھا اس وقت

ایک خاص متوازن لڑکھڑاہٹ نمایاں تھی۔ ان کے چہرے کی کھلتی ہوئی رنگت کچھ اور کھل گئی تھی اور ان کی روتی ہوئی شکل اس حد تک ضرور بدل گئی تھی جیسے کہ ابھی ابھی آنسو پونچھے گئے ہوں ان کی ناک پر رکھی ہوئی نِکل کے فریم کی عینک اس وقت اتنی ترچھی نہیں تھی کہ بائیں آنکھ آدھی شیشہ سے اوپر ہوتی اور ان کی آنکھوں کی بھینگی دکھائی میں اتنا فرق ضرور ہو گیا تھا کہ بجائے ایک آنکھ اُترا ور ایک دکھن دیکھنے کے داہنی آنکھ سامنے شہ نشین کی طرف اور بائیں شہ نشین کے داہنے رُخ پر باورچی خانہ کو دیکھ رہی تھی۔

افسر کی تالیوں نے نوبت کا کام کیا اور گھر کے سب لوگوں کو محبوب عالم کی طرف متوجہ کر دیا۔ باورچی خانے میں ماما پستہ ہنڈیا بھونتے بھونتے جلدی سے اٹھیں اور ہاتھ میں مرچیں لیکر محبوب عالم کی طرف نذر اتارنے کو لپکیں۔ ان کی لڑکی مکّو نے جلدی سے چلم اُٹھائی اور اس پر آگ رکھنے لگی۔ شہ نشین کے دالان میں نواب صاحب تو گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے پینک میں غائب ہی رہے مگر بیگم صاحب نے مُنہ اٹھا کر لڑکے کو شان سے آتے دیکھا اور اُن کی باچھیں ایک کان سے دوسرے کان تک کھل گئیں۔ محبوب عالم کی جوان بہنیں قیصر اور انور اپنے پلنگوں پر سے اُٹھ کر محراب کے نیچے آگئیں۔

محبوب عالم نے آدھی انگنائی پار کی ہو گی کہ ماما پستہ ان کے پاس آگئیں اور اپنی مٹھی کو سات بار ان پر سے اُتار کر باورچی خانے کو واپس چلی گئیں۔ اسی وقت محبوب عالم کی دولہن اپنی لڑکی کو کندھے سے لگائے ہوئے شہ نشین کے بائیں رُخ پر کمرے کے دروازے پر آگئیں اور اپنے دولہا کو اس طرح دیکھنے لگیں جیسے کوئی عجائب خانہ کے نئے جانور کو دیکھے۔

وہ دالان کے پاس پہونچ گئے۔ ان کی منجھلی بہن قیصر جہاں کے بجھے بجھے۔ بلے چہرے پر ایک ہلکا سا رنگ دوڑ گیا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمایاں ہوئی۔ ان کی منجھلی بہن نور جہاں کے کتابی چہرے کی چھپٹی رنگت پر گلابی رنگ چھا گیا۔ وہ کچھ کھلکھلا کر جھٹ سے بولی وہ

"اے ہٹیئے بھائی صاحب۔ یہ کیا انحانخ بہن آئے۔ ہم نی اچھی لگتی ہو"

بیگم صاحب نے نواب صاحب کو چونکانے کے لئے زور سے کہا "اے ہے نواب۔ خدا غارت کرے اس افیم کو۔ اے دیکھئے جتو نواب وہ فی معلوم کیا نام ہے اس کا وہ پہنے ہوئے آرہا ہے"

نواب صاحب نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ جتو نواب اپنی والدہ کے پلنگ کی پائنتی کے پاس پہونچ گئے اور جھک جھک کر دادا اور والدہ کو تسلیمیں کیں۔

والدہ نے دعا دی "سلامت رہو میرے لال ایک یہ اور ہزار اور پہننا نصیب ہو پس کے اترے"

اور نواب صاحب نے گون کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "اماں خلعت ملا ہے تم کو واللہ۔ سیاہ اور سفید گوٹ اور یہ تھیلا کندھے پر پڑا ہوا انگوچھے کی طرح یہ کیا؟ قسم قرآن کی یہ انگریز بھی مذاق کرتے ہیں سچے۔ خلعت بھی دینے چلے تو سیاہ رنگ کا۔ اما تم یہ لیتے ...... اور جمین تو خوب ہی گرمیوں کی نکالی ہے۔ واہ"

جتو نواب کا سراب شرمانے سے تیس ۳۰ درجہ کا زاویہ بنانے لگا۔

نواب صاحب نے ایک لمحہ سکوت کے بعد فرمایا "ارے کھڑے کیا ہو۔ پھوپھی اماں کو تسلیم کے لئے نہیں جاتے"

محبوب عالم کی ریڑھ کی ہڈی کی تمام سکت جاتی رہی۔ انھوں نے اپنی دونوں آنکھوں کو اپنی والدہ کے چہرے پر فوکس کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے لڑکھڑا کر کہا "دادی اماں۔ اونھ...... " اور ان کی والدہ نے فوراً ان کی مدد کرتے ہوئے کہا "پھوپھی اماں۔ پھوپھی اماں۔ کوئی چاہنے والی ہوتیں تو نی معلوم کیا کرتے۔ اے وہ جا کے کیا کرے گا۔ وہ دیکھتے ہی بولیں گی ہٹو ہٹو نجس۔ بابا جان نجس لنگور گھسے آرہے ہیں میرے گھر میں۔ بابا جان۔ وہ کیا جانیں قدر پڑھنے لکھنے کی"

"اونھ۔ تم کیا سمجھو۔ ناقص العقل عورت۔ آؤ جتو" کہکر نواب صاحب پلنگ پر سے

اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی کمر میں کچھ قدرتی خم تھا ورنہ ان کا سن کافی ہونے پر بھی وہ ٹانٹھے تھے۔ وہ آگے آگے اور جگنو نواب ان کے پیچھے پیچھے انگنائی میں ہو کر باورچی خانے سے آگے ایک دروازہ تھا اس کی طرف بڑھے۔ باورچی خانے کے پاس سے گزرتے ہوئے جگنو نواب نے ایک حسرت بھری نگاہ تمو پر ڈالی جو حقہ تازہ کرتے کرتے ان کی طرف دیکھ کر کھل گئی۔ تمو کے کھپچی ایسے جسم اور کھپٹا ایسے داغدار چہرے میں ان کو ہمیشہ کی طرح اب بھی عجیب پراسرار حسن دکھائی دیا۔

دونوں ملحق مکان میں آ گئے۔ یہاں شہ نشین میں ایک مسہری پر گاؤ تکیہ سے لگی ہوئی ایک بوڑھی پھونس بیگم صاحب بیٹھی تھیں جن کے چہرہ پر بے شمار جھریوں میں گوری کھال کے نیچے خون جھلکتا دکھائی دیتا تھا اور جن کے تیور سے ایک خاص آن بان نمایاں تھی۔ ان بیگم صاحب نے اپنے بھتیجے اور پوتے کی تسلیموں کا جواب دیا "جیو بابا جان جیو" اور پھر جگنو نواب کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی ناک پر انگلی رکھی اور کہا "ائی۔ منجھو نواب۔ یہ کیا بابا جان۔ یہ لڑکے کو کیا لنگور بنا لائے بابا جان"

"حضور پھوپی اماں یہ خلعت ملا ہے آپ کے پوتے کو سرکار انگریزی سے اور حضور ملاحظہ تو فرمائیں بالکل عبا کی طرح ہے۔ میں نے کہلوا دیا تھا کہ لڑکے کی دادی نہایت درجہ پابند صوم و صلات ہیں اس لئے اپنے پوتے کو عبا پہنے دیکھ کر خوش ہوں گی۔ چنانچہ وہاں سے جواب آیا کہ آپ کی خاطر ہر طرح منظور ہے۔ آخر آپ کی دادی صاحبہ مرحومہ سے ملکہ وکٹوریہ نے دوپٹہ بدلا تھا کہ نہیں"

"اچھا بابا جان اچھا۔ یہ بات ہے بیٹے منجھو...... اچھا آبادی خانم میرا صندوقچہ تو لانا"

آبادی خانم نے صندوقچہ لا کر مسہری پر رکھ دیا۔ بیگم صاحب نے صندوقچہ کھول کر تین روپے نکالے اور بولیں "لو یہ ڈھائی روپے کی پنچ میل مٹھائی منگا کے گھر اونا دو اور ایک پیسے میں ہرت پھرت کی پڑیا منگا لینا۔ بابا جان اور باقی پیسے فقیروں کو دے دینا"

"اور پھوپی اماں انعام بھی تو مانگ رہے ہیں سپاہی۔ اُن کے لئے؟"
بیگم صاحب نے ایک روپیہ اور نکالا اور کہا "اچھا یہ لو اُن کو دیدو نہیں تو ملکہ کے پوتے تک بات پہونچے گی بابا جان کہ اس ڈیوڑھی سے خالی ہاتھ واپس ہوئے۔ بابا جان۔ ہاں"
نواب صاحب اور رجو نواب اپنی طرف واپس آئے۔ نواب صاحب تو سیدھے ڈیوڑھی کی طرف چل دئے اور رجو نواب اپنے کمرے میں آئے جہاں ان کی بیوی پلنگ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو دودھ پلا رہی تھیں۔ وہ اسی پلنگ پر بچھونے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ مُکّو ان کے سامنے حقہ رکھ کر چلی گئی۔ وہ حقہ پینے لگے۔ ذرا دیر کے بعد ان کی بیوی نے پوچھا "تو یہی نگوڑا ملا ہے تم کو ڈیڑھ روپیہ؟"
"ملا؟" رجو نواب نے حقہ کو مُنہ سے ذرا ہٹا کے کہا۔
"تو کیا ملا نہیں ہے یہ! میں نہیں جانتی میرا ڈیڑھ روپیہ بجا بھو اماں سے لے کے مجھے دے دینا۔ مجھے ڈلی۔ کتھا۔ پیپرمنٹ سب منگانا ہے"۔
"ارے بھئی ڈیڑھ روپیہ تو اس کا کرایہ ہوا"
"آئیں۔ اس موئے میں کیا ہے۔ ڈیڑھ روپیہ کا یہ کالا کپڑا بھی نہ ہوگا"
"تم کیا جانو ساٹھ روپیہ تو اس کی خالی سلائی کے جاتے ہیں"
"ساٹھ روپیہ! تین بیسی!" اور وہ زور کا قہقہا مار کر ہنسیں جس کی آواز سن کر دالان سے انور اور باورچی خانہ سے مُکّو دوڑی آئیں۔
"اے دولہن بھابی یہ کاہے پہ ہنسی ہو رہی ہے" انور نے پوچھا
"کیا بات ہے دولہن بیگم" مُکّو بولی
دولہن بیگم ہنسے ہی جا رہی تھیں اور اپنے تئیں سنبھال ہی نہ پاتی تھیں۔ رجو نواب کچھ ترش رو ہو کر حقے کے دم پر دم لگاتے چلے جا رہے تھے۔ دولہن بیگم نے پہلے تو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ٹھہر کر وہ بتائیں گی کہ کیا معاملہ ہے اور پھر ہنسی روک کے کہا "یہ کالا چیتھڑا" اور پھر ہنسنے لگیں اور ہنستی رہیں۔ پھر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں "کہتے ہیں

کہ ساٹھ روپئے اس کی سلائی ہوتی ہے" اور پھر ہنس دیں۔

"ساٹھ یا سات؟" انور نے ایک بھولے انداز سے مسکرا کر پوچھا

"سات بھی بہت ہوئے بیگم" ممّو بولی

"ساٹھ۔ تین بیسی" دولہن بیگم نے کہا اور اب آگے وہ نہ ہنسیں کیونکہ ان کی ہنسی کا اسٹاک اب ختم ہو گیا تھا۔

"اف۔ فوہ۔ غضب خدا کا لوٹ ہے۔ کیوں بھائی صاحب۔ ساٹھ سلائی کے ہوئے تو تیار کتنے میں ہوتا ہوگا"

"سوا سو۔ ڈیڑھ سو۔

اسی پر دولہن بیگم کو قہقہہ لگانے کی پھر سے طاقت آگئی۔ انور اور ممّو بھی ہنسنے لگیں۔ اس وقت نواب صاحب مٹھائی کا دونا بائیں ہاتھ پر رکھے اور داہنے ہاتھ کی مٹھی بند کئے ہوئے شہ نشیں کی طرف جاتے دکھائی دئے۔ سب خاموش ہو گئیں۔ جو نواب حقہ چھوڑ کر کمرے کے دروازے پر آگئے۔ نواب صاحب نے دالان میں اپنے پلنگ کے پاس جا کر داہنے ہاتھ سے پیسے تکیہ کے نیچے رکھے اور دونے کو داہنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنی پھوپھی اماں کی طرف چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد بیگم صاحب نے تکیہ اٹھا کر پیسے دیکھے اور قیصر کی طرف رخ کر کے بولیں "ایک روپیہ اور پونے چھ آنے بچائے۔ سوا روپیہ کا دونا ہوگا۔ ایک پیسہ کی پڑیا۔ اور چھ آنے کی یہ ہوئی افیم"

قیصر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیگم صاحب نے پیسے پھر تکیہ کے نیچے رکھ دئے۔ جو نواب پھر آکر حقہ پینے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد نواب صاحب بائیں ہاتھ پر دونا رکھے اور داہنے ہاتھ سے کھاتے ہوئے واپس آئے اور بولے "آؤ بھئی سب چکھو" افسر دوڑ کر آئی اور ان کی ٹانگوں میں لپٹ گئی۔ انہوں نے دونا نیچا کر دیا اور افسر نے ایک امرتی نکال لی۔

بیگم صاحب دالان سے کڑک کر بولیں "ملے ہٹے نواب۔ یہ ندیدا پن۔ اے پھٹکار۔ اونہہ۔ بیچ انگنائی میں کھڑے ہو گئے"

"اونہہ۔ تم سے تو پلا نہ جائیگا پلنگ پہ سے۔ آخر کھڑا دونا ہے۔ کھڑے ہو کے کھایا جائیگا"
نواب صاحب اپنے منہ میں مٹھائی رکھتے ہوئے دالان میں آگئے۔ بیگم صاحب نے کھڑے ہو کر دونا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا "آؤ سب لوگ دونا چکھنے کے لئے" سب لوگ آکر دونا چکھنے لگے۔

نواب صاحب اپنے پلنگ پر بیٹھ گئے تھے اور اپنی بیگم کے ہاتھ میں دونے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے "بھیا ابھی کا نہیں ہے۔ نہ معلوم کہاں لونڈوں میں مارا مارا پھرتا ہے"

دولہن بیگم نے یہ سن کر اپنے بائیں ہاتھ میں کچھ مٹھائی دبالی

قیصر نے چپکے سے کہا "اور دولہا بھائی"

انور بولی "ارے اس کی پسلی ضرور پھڑک گئی ہوگی۔ آتا ہی ہوگا۔ یہی وقت ہو اسکی چھٹی کا"

اتنے میں ڈیوڑھی سے آواز آئی "ہم آتے ہیں"

سب ہنسنے لگے۔ جو نواب کی گردن نے جنبش کھائی اور ان کے ہونٹ خاص انداز سے کھل گئے۔

انور بولی "دیکھا" اور پھر زور کی آواز میں کہا "ابھی نہ آئیں۔ ہم لوگ کھڑا دونا ختم کرلیں تب آئیں"

"تو انور بڑی تیز ہوتی جاتی ہے" بیگم صاحب نے ڈانٹ کر کہا اور پھر زور سے بولیں "آؤ۔ نواب دولہا۔ آؤ"

دولہا بھائی اندر داخل ہوتے ہی بولے "اتنا۔ یہ معاملے ہیں" اور لپکتے ہوئے دالان کی طرف آئے

"جلدی جلدی کھالو۔ یہ بندر آرہا ہے۔ پورا دونا لے بھاگے گا" انور نے کہا

"پھر وہی بدتمیزی"، بیگم صاحب نے جھڑکا

دولہا بھائی نے پاس آتے ہی اپنی ساس کے ہاتھ سے دونا لے لیا اور الگ لے جا کر بولے

"ارے غضب شفا کر دیا"

"دیکھو ہے نہ پورا بندر فقط دم کی کسر ہے۔ جا کسی ٹہنی پر بیٹھ کر کھا"

"تجھ سے ہزار دفعہ منع کر چکی ہوں۔ اوئی۔ آخر بڑا بہنوئی ہے"

"تو وہ ہے ہی بندر کی قطع تو کوئی کیا کرے بھابھو اماں"

دولہا بھائی کے چھوٹے قد کا انداز وہی طرح کا تھا جیسے کوئی بڑا بندر کھڑا ہو جائے اور وہ بائیں ہاتھ میں دونا لئے ہوئے داہنے ہاتھ سے اسے جھاڑ جھاڑ کر کھا بھی بندر کی طرح رہے تھے غور سے دیکھیے پر ان کا چیچک داغ چہرہ۔ بڑا سا دہانا۔ چھوٹی آنکھیں اور اس پر ایک چھوٹی سے ناک چپکی ہوئی بہت کچھ بندر سے مشابہ معلوم ہوتیں۔ ہاں ان کی لمبی مروڑی ہوئی مونچھیں ضرور آدمیوں کی سی تھیں۔ مگر ان کے پیروں میں گر پیچ کا حد سے زیادہ میلا جوتا ان کی پنڈلیوں پر پٹیاں، ان کا دھبے دار خاکی نیکر اور اس پر کشمیرے کا زرد ہنٹنگ کوٹ جس کی داہنی طرف کی اوپر والی اور بائیں طرف کی نیچے والی جیبیں ندارد اور ان کے سر پر کپڑا ہاوی کنٹوپ یہ تمام وضع اُن کو انسان اور بندر کے درمیان کی کڑی ضرورت ثابت کرتی تھی۔

سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے۔ دولہا بھائی اپنے کوٹ سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اپنی ساس کے پاس آئے اور بولے "ایک پان کا ٹکڑا دیجیے بھابھو اماں اور میں چلوں۔ آپ کی شاہزادی انتظار کر رہی ہونگی"

بیگم صاحب پان لگانے لگیں اور وہ پلنگ پر جھک کر اس طرح بولے جیسے کوئی راز کی بات کہہ رہے ہوں "بھابھو اماں۔ آج بڑا غضب ہو گیا تھا!"

"آئیں۔ کیا ہوا۔ خدا نہ کرے۔ دشمنوں دور پار"، بیگم صاحب نے پان لگاتے لگاتے رک کر پوچھا۔

"غرب ہو گیا تھا" اور دولہا بھائی نے اپنی گول گول آنکھیں مٹکائیں اور پھر رازدارانہ لہجہ میں بولے "آج شبھوں کو آپ کی شاحب ژادی نے دیر کر دی کھانا دینے میں۔ جب میں یہاں آیا تو دیر ہو چکی تھی۔ درشاپ پہونچا تو شاحب آچکا تھا۔ چپراشی نے کہا۔ شاب پوچھ رہا تھا۔ بش دم ہی تو نکل گیا۔ مگر دیکھئے دیکھئے" دولہا بھائی تن کر کھڑے ہو گئے اور اپنے داہنے ہاتھ کو اس طرح چلایا جیسے کہ کسی کمرے کی چق اٹھا رہے ہوں "بش اسی طرح میں نے کمرے کی چک اٹھا اور کہا کم ان شر۔ بولا یش"۔ "پھر وہ اکڑ کر دو قدم آگے بڑھے" میں اس طرح چلا گیا۔ شاحب بولا تم دیر میں آتے ہو۔ میں نے کہا آپ جانتے ہیں میرا خود چالیس روپیہ کا وثیقہ ہے مجھے نوکری کی پرواہ نہیں ہے ...."

انور ان کی بات کاٹتے ہوئے بولی "جھوٹ۔ یہ کہنے کی ہمت ہی نہیں"

"دیکھئے بھابھو اماں۔ پوری بات نہیں کرنے دیتی کوئی تُک ہے یہ"

"میں ایک دن مارتے مارتے اُلّو کر دوں گی انور۔ خبردار"

انور اٹھ کر قیصر کے پاس چلی گئی اور دولہا بھائی نے اپنا بیان پھر جاری کیا "تو بھابھو اماں میں کہہ رہا تھا کہ میں نے یوں ہی جواب دیا اور پھر میں نے کہا دیر کو کہئے تو آج میرے شالے کو ماشے اللہ سے بی۔ اے کا دہ ملنے والا ہے۔ بش دیر ہو گئی۔ شاحب بولا۔ اشا۔ خوش ہو گیا شاحب واللہ قشم جناب امیر کی کیسی ترکیب لگائی میں نے۔ نہ کہئے گا واللہ شاحب بولا ہم بھی جائے گا آج نی معلوم کیا اس میں ہمیں بلایا گیا ہے۔ میں نے کہا میرا شالا تو ہو بنچ بھی گیا۔ بش یوں شلام کر کے" دولہا بھائی سلوٹ کرنے کا پورا انداز بنا کر کھڑے ہو گئے "اور میں اپنے کام پہ چلا گیا۔" یہ کہہ کر وہ سر پر اپنا کنٹوپ سنبھالتے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف جانے لگے۔

بیگم صاحب بولیں "کل صبح ہی سے سب بچے باولے آجائیں اور تم بھی چھٹی لے لینا"

دولہا بھائی لوٹ آئے اور بولے "ہاں یہ تو میں بھول گیا۔ شاحب آج دو بجے جانے لگا

میں نے موٹر کا دروازہ کھولا۔" انھوں نے دروازہ کھولنے کا انداز بنایا "اور سلوٹ کیا۔ دیکھئے یوں" وہ سلوٹ کئے کھڑے ہوئے "بولا۔ کیوں۔ کیا ماجھٹ۔ میں نے کہا کل حضور مہلیش ہے شالے کے بی۔ اے ہونے کی۔ تو شیٹی مل جائے۔ مسکرا دیا دادا اللہ۔ انشا انشا۔ کل تمہیں شیٹی۔ انشا بھابھو اماں تسلیم۔ آداب عرض بھائی ابا۔"

قیصر نے کہا "تسلیم دولہا بھائی"

دولہا بھائی نے کہا "جیتی رہو"

انور بولی "ہم تو نہیں تسلیم کرتے اس ٹینچو کو۔ نہیں تو ہمیں ڈانٹ کھلوا دی نے کے" بیگم صاحب نے اس کو پھر گھرکا۔ دولہا بھائی ڈیوڑی کے پاس پہونچے مگر ایک عورت کو سر پر خوان رکھے آتا دیکھ کر اس کے ساتھ ساتھ پلٹ آئے۔

"اب یہ نہیں ٹل سکتے" انور نے کہا "نصیبا حصہ سلئے آ رہی نا"

نصیبا بیگم صاحب کے پلنگ کے پاس آئی۔ دولہا بھائی نے اس کے سر پر سے خوان اتروا کے پلنگ کی پائنتی رکھ دیا۔ نصیبا نے نواب صاحب اور بیگم صاحب کو سلام کیا اور بولی "یہ حصہ ہے مولود سر پھو کا۔ منیر میاں پاس ہو کے آئے ہیں نا۔"

خوان میں بہت سے طباق تھے جن میں سے ہر ایک پر پانچ پانچ عمرتیاں رکھی ہوئی تھیں بیگم صاحب نے ایک طباق اٹھا کر کہا "لو دولہا۔ ایک ذرا چکھو" اور دولہا تو منتظر تھے ہی فوراً طباق ہاتھ میں لے کر گپ گپ کھانے لگے۔ باقی طباق قیصر اور انور نے اٹھا اٹھا کر رکھ لئے۔ نواب صاحب پینک میں تھے۔ ان کو ہلا کر بیگم صاحب نے کہا "اے نواب دونی دو اسے نصیبا کو حصے کے آئی ہے گی۔"

نواب صاحب نے تکیہ کے نیچے سے نکال کر نصیبا کو دونی دی۔ بیگم صاحب نے اسے پان دیا۔ دولہا بھائی نے خالی خوان اس کے سر پر رکھوا دیا اور وہ چلی گئی۔ ججو کے کمرے کے پاس سے جاتے ہوئے اس نے کہا "ججو میاں منیر میاں نے کہا ہے ہم انتجار کر رہے ہیں"

جتو نے کہا "کہدیجئے ہم آرہے ہیں۔"

جتو اپنے کمرے سے نکل کر باہر کی طرف جانے لگے۔ بیگم صاحب نے ان کو متوجہ کر کے کہا "دیکھو بیٹا۔ آخر نور میاں کا لڑکا تمہارے ساتھ ہی پاس ہو کے آیا۔ بس فوراً مولود ہوا اور یہ حصہ بھی بٹ گیا۔ تمہارے باپ ہیں کہ کل مجلس کریں گے اور علموں کی جوڑی پر جو ملمع کرانے دی آئے ہیں اس کی کانوں کان خبر نہیں۔ میں کہتی ہوں کہ یہ سنت جماعت لوگ اپنے مذہب کے کتنے پکے ہوتے ہیں گے۔ اسی سے تو خدا ان کو دے رہا ہے گا کہ لٹا رہے ہیں گے ایک تمہارے باپ ہیں گے کہ پھوپھی اماں سے پیسے کاٹ کاٹ کے دے اے افیم اور کوئی فکر ہی نہیں ہے گی نہ دنیا کی نہ عقبے کی۔"

نواب صاحب پلنگ سے چونکے ہوئے یہ سب سن رہے تھے مگر آنکھیں بند کئے ہوئے تھے تا کہ بیگم صاحب بات پوری کر لیں چنانچہ اب وہ کڑک کر بولے "اف۔ اف۔ ایسی گدھی عورت سے پالا پڑا ہے۔ کہدیا۔ کہدیا کہ وقت پر علم نہ آئیں تو کہنا۔ مگر نہیں۔ رٹ ہو گئی۔"

اس دو میان میں دولہا بھائی دبے پاؤں کھسک گئے۔

جتو سوالیہ علامت بنے ہوئے ایک آنکھ سے ماں کے اور دوسری آنکھ سے باپ کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ آخر گھبرا کر بولے "میں ابھی جا رہا ہوں۔ لئے آتا ہوں اگر مل گئے۔"

(۲)

جتو نواب اپنے خاص انداز میں لہراتے ہوئے میاں نور الدین کے احاطے میں پہونچے اس احاطے کے باہر والے حصہ میں بہت سے چھوٹے لوگ مزدور وغیرہ کرایہ پر بسے ہوئے تھے ان میں ایک کسگر کی سانولی، گدبدی، چلبلی لڑکی اُن کو بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کی اگر دونوں آنکھیں نہیں تو ایک آنکھ ضرور اسے ڈھونڈھ رہی تھی۔ وہ نہ دکھائی دی اور یہ بڑھتے ہوئے سامنے بڑے پھاٹک کے اندر چلے گئے۔ یہ حصہ ایک کشادہ کچا صحن

تھا جس کے چاروں طرف دو منزلی عمارت تھی۔ یہاں ان کے دوست منیر الدین صدیقی صاحب اپنی پرانی موٹر کا بانٹ کھولے ہوئے انجن پر جھکے ہوئے نظر آئے۔ جو ان کے پاس پہونچ گئے۔ وہ پلٹ کر بولے: "تم آگئے..... ابھی والدہ اور باجی کو شاہ مینا صاحب سے واپس لایا ٹھیک چل رہی تھی۔ اب اسٹارٹ ہی نہیں ہوتی۔"

جو نے اپنی گردن کچھ اونچی کی اور پھر ٹیڑھی کی اور کچھ نہ کہا۔

اتنے میں داہنی جانب کے کوٹھے پر سے آواز آئی "ارے بھئی اب کل پینتالیس منٹ رہ گئے ہیں۔"

منیر میاں بولے "بس اب۔ چلتے ہی ہیں۔ ذرا کپڑے بدل آئیں۔"

منیر نہایت عمدہ سرج کی شیروانی اور سفید چوڑی دار پے جامہ پہنے ہوئے تھے۔ یہ لباس ان کے گورے گورے شگفتہ اور عمدہ نک سکھ والے چہرہ پر بہت ہی زیب دے رہا تھا۔ مگر اس لباس کو بدلنے کی ضرورت ان کے لئے اہم تھی کیونکہ یہ کپڑے پہن کر وہ شاہ مینا صاحب کے مزار پر گئے تھے اور اب سنیما جانے کے لئے انگریزی کپڑے پہن لینا بڑا ضروری تھا۔ دوسرے لوگ اس لباس کے تبدیل کرتے رہنے کے راز کو شاید نہ سمجھ سکتے۔ مگر جو تو اب اس کے پورے محرم تھے۔ چنانچہ اپنی مخصوص کج ادائی سے منیر کو وہ جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور دیکھتے ہی رہتے اگر دو صاحبوں کے قریب آنے کی آہٹ نہ ان کو چونکا دیتی۔

ان کی پشت کی طرف کے کوٹھے سے دو صاحب اتر کر ان کے پاس آگئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب جن کا نام مرزا بسم اللہ جان بیگ تھا نہایت گورے، چوڑے چکلے آدمی تھے۔ دوسرے جن کا نام مصباح الدین تھا نہایت سبلے، ساؤنلے رنگ کے دبلے پتلے انسان تھے۔ پہلے صاحب کا چہرہ قریب قریب چوکور تھا اور اس پر طوطے کی چونچ کی سی ناک اور چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں ایک عجیب بے خبری کے عالم کا تاثر پیدا کرتی تھیں۔ دوسرے صاحب کالو کی کی طرح لمبا چہرہ اور اس لمبان کے موافق ناک اور آنکھیں ان کو بڑا سیانا شخص

ثابت کرتی تھیں۔ جّو نے ان دونوں کی طرف رخ کیا اور ایک آنکھ سے ایک کو اور دوسری سے دوسرے کو دیکھا۔

مرزا نسیم اللہ جان بیگ نے موٹر کے بانٹ کو اٹھا کر دیکھا۔ گردن ٹیڑھی کرکے مشین کو جھانکا۔ اپنی آنکھیں مٹکائیں اور بولے "یہ چلے گی بھی" اور اپنے خاص انداز میں مُسکرائے۔ پھر جّو اور مصباح صاحب کی طرف رخ کرکے بولے "اگر نہ چلے گی تو دھکیل لیں گے" اور اپنے بائیں ہاتھ پر اپنا داہنا ہاتھ مارتے ہوئے ایک نہایت ہی مختصر ہنسی ہنسے جو محض "دھی" سے زیادہ نہ تھی۔ مصباح کی بھویں چڑھ گئیں جیسے کہ وہ غصّہ کرنے ہی کو تھے اور جّو کا چہرہ اسی بے تاثری کے رنگ پر رہا جیسا کہ وہ ہمیشہ رہا کرتا تھا۔

جّو نے اپنی گردن کا زاویہ بدلتے ہوئے کہا "کل ہمارے یہاں مجلس میں آپ لوگ آئیں"

مصباح بولے "میں نہ آسکوں گا۔ محض ویسٹ آف ٹائم (تضیع اوقات)

مرزا کہنے لگے "چائے تو مجلس سے پہلے پلادی جائیگی۔ میں آؤں گا اور چائے پی کر چلا جاؤں گا"

اور ایک انہوں نے دو یا تین بار "دھی" والی ہنسی ہنسی۔

اتنے میں گھر کے اندر سے ایک مہترانی کمر پر ٹوکرہ رکھے نکلی۔ مرزا صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر اپنے ہونٹ سکوڑے۔ وہ مسکرائی یہ بھی مسکرائے اور پھر ایک فاتحانہ انداز میں مصباح کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیوں نہ ہو" مصباح بولے "تم ہو ہی ایسے حسین کہ ہر لڑکی تم پر دیکھتے ہی عاشق ہو جاتی ہے"

دھی، مرزا کے مُنہ سے نکلی۔

"اس لونڈیا کی جوانی اچھی ہوگی۔ اب کیا ہے۔ نہ معلوم . . . . " مصباح بولے

جّو نہایت متعجب ہو کر دونوں آنکھوں سے بیک وقت مرزا کے چہرہ کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اس میں کیا مقناطیسی قوت ہے کہ ہر لڑکی کا دل یہ کھینچ لیتا ہے۔ مرزا کے بشرے سے ایک فاتحانہ اور بعر یبانہ شان نکلی اور انہوں نے جّو سے سوال کیا "ہاں محبوب میاں

سینما میں وہ بھی تو ہوں گی تر ملا اور ان کے کرنٹ (اس وقت کے) دھگڑ پر مانگ "

"وہ بھی تو تم پر مرتی ہے" مصباح بولے

"اس سے تو میں بہت بچا مجھے پھانس ہی لیا ہوتا اس نے۔ یہ سب سنٹ پرسنٹ کرپٹ (صوفی صدی بدمعاش) ہوتی ہیں.... اور محبوب صاحب آپ کے عشق کے تو کیا ہی کہنے...."

وہ بات ختم بھی نہ کرنے پائے تھے کہ منیر نمودار ہو گئے۔ شیروانی اتار کر وہ نہایت عمدہ نیلی چیک ڈزائن سرج کا سوٹ پہنے ہوئے سامنے آئے۔ ان کے بال نہایت نفیس طریقہ پر چپکے ہوئے تھے۔ ان کے گورے چہرہ پر پوڈر کی سفیدی اور ہونٹوں پر لپسٹک کی سرخی نمایاں تھی اور ان کا پورا انداز معشوقانہ تھا۔ مرزا ایک سکنڈ کو محو حیرت بنے اور پھر اپنے منہ سے ایک "اف۔ فوہ" نکالی۔

منیر نے ان کے پاس آکر بالکل زنانے انداز میں جھڑکا اور جلدی سے موٹر میں اسٹیرنگ پر بیٹھ گئے۔ مرزا اور مصباح پیچھے سے اور جو داہنی طرف سے موٹر کو دھکیلتے ہوئے احاطے کے باہر گئے اور سڑک پر کافی دور جانے کے بعد موٹر چلی اور یہ تینوں حضرات اس میں لپک کر بیٹھ گئے۔

رستہ میں ایک دوکان کے پاس موٹر روک کر منیر نے کہا "جو ذرا اس ٹارچ میں سیل تو رکھوا لو قمر سے"

قمر نے اپنی دوکان ہی میں سے منیر کی آواز سن لی تھی اور سیل الماری سے نکالنے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔ جو ٹارچ لئے ان کے پاس پہونچے اور وہ ٹارچ لے کر اس میں سیل رکھنے لگے اور جو سے کہتے گئے "میں بھی دوکان بند کر کے آتا تم کو اور خالہ اماں اور خالو ابا کو مبارکباد دینے"

"اب کل سویرے سے آئے گا دوکان بند رکھئے گا مجلس ہے"

قمر نے ٹارچ ان کو دیتے ہوئے کچھ زور کی آواز میں کہا "نہیں میں اس وقت بھی ہو لونگا"

مرزا صاحب نے یہ بات موٹر میں سنی اور بولے "اس وقت کیا۔ آپ ہر گھنٹہ کے بعد وہاں ہو لیا کیجئے!" اور ان کے منہ سے متعدد بار دکھی ہکلی۔

قمر نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا

جو نے موٹر میں چڑھتے ہوئے پلٹ کر کہا "قمر بھائی۔ گھر میں آپ کہہ دیجئے گا کہ علم ابھی نہیں ملے اور مجھے منیر میاں بائیسکوپ لئے جا رہے ہیں"

منیر نے موٹر کا انجن تو چلنے ہی دیا تھا کہ پھر دھکیلنا نہ پڑے اور جو کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی بڑھا دی۔ کوئی دس منٹ میں یہ سب سینما پہونچ گئے۔ منیر نے جو کو ایک دس روپیہ کا نوٹ دیا کہ چار ٹکٹ لے آئیں اور وہ بھیڑ میں گھس پل کر ٹکٹ لے آئے۔

ایک ہاتھ میں ٹکٹ اور دوسرے میں باقی رقم، سر پر ایرانی ٹوپی پیچھے کی طرف اتنی ہٹی ہوئی کہ آگے کے بالوں میں سے کچھ ٹوپی کے اوپر اور کچھ ماتھے پر بڑے ہوئے۔ جو نواب ٹکٹ گھر کی بھیڑ سے باہر آئے۔ اِدھر اُدھر اپنے ساتھیوں کو دیکھنے لگے۔ سامنے سے ایک صاحبزادے لمبے دبلے عینک لگائے اور گہرے رنگ کا معمولی کوٹ پہنے گرم رفتاری سے ان کی طرف مسکراتے ہوئے آتے دکھائی دئے۔ جو نے بوکھلا کر ان سے پوچھا۔

"بھئی۔ عارف۔ منیر میاں وغیرہ نہیں دکھائی دئے؟"

"اچھا۔ تم ان کے لئے ٹکٹ لے آئے۔ خوب یار۔ اس بھیڑ میں سے۔ قدرت نے تمہیں اسی کام کے لئے بنایا تھا۔ آخر ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ تم کو ٹکٹ گھر کی بھیڑ میں گھس پل کر ٹکٹ لانے کے لئے خلق کیا گیا تھا بس"

جو عارف کو دیکھ رہے تھے اور عجیب مخمصہ میں تھے کہ اس کے فلسفہ سے کس طرح بچیں کہ ان کے شانے پر ایک ہاتھ پڑا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو منیر کہہ رہے تھے "ہم لوگ اِدھر ہیں" انہوں نے گردن موڑی تو عارف کا کہیں پتہ نہ تھا۔ غرض منیر کے ساتھ وہ سکنڈ کلاس کے دروازے کی طرف بڑھے جس کے قریب مرزا اور مصباح موجود تھے۔ چاروں سینما ہال میں داخل ہو گئے

آدھا سکنڈ کلاس بھر چکا تھا۔ بیچ کی ایک لائن میں یہ لوگ بیٹھ گئے۔ مرزا نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی اور جبو کے شانے کو ہلاتے ہوئے بولے "دیکھا آپ نے پیچھے"

"یہ پہلے ہی دیکھ چکے آخر۔ ٹیپکھے ہونے کا یہی تو بڑا فائدہ ہے کہ ہم سب سے پہلے یہ چیز دیکھ لیتے ہیں" منیر بولے کچھ طنزیہ لہجہ میں۔

"کیا دیکھ لیا؟" مرزا بولے۔

"وہ نرملا بیٹھی ہے پیچھے۔ اُنھوں نے آتے ہی دیکھ لیا اور مجھے بیٹھنے سے پہلے ہی دکھایا"

"اور وہ رقیب روسیاہ"

"اونھ" مصباح نے ایسی باتیں نہ برداشت کرتے ہوئے کہا "نہ معلوم کتنے ہیں۔ آجکل یہ پرمانند ہے"

جبو کچھ نہ بولے۔ بار بار منہ موڑ موڑ کر پیچھے دیکھے جا رہے تھے۔ نرملا نیلی ساری باندھے شانوں پر زرد رنگ کا کوٹ لگائے پرمانند کی طرف رخ کئے مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کر رہی تھی جبو کو پرمانند کے نہ تو سیاہ چہرے میں اور نہ اس کے نفیس ہرے سوٹ میں کوئی ایسی بات دکھائی دیتی تھی جو ان کی رائے میں کسی عورت کو موہ لیتی۔ مگر ان کا دل اپنی جگہ پر یہ شعر پڑھ رہا تھا۔ ؎

ہیں ایک وہ بھی کہ جن سے ہے تم کو راز و نیاز
اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

مرزا کو جبو کی یہ حرکت پسند نہیں آ رہی تھی لہٰذا وہ بول ہی اٹھے "یہ محبت بھی خوب ہے کہ ان کو کوئی خیال نہیں اور یہ مرے جا رہے ہیں"

اتنے میں ایک لڑکا نہایت اُٹنگا سا کشمیرے کا کوٹ اور خاکی پینٹ پہنے کوٹ کے کالر پر قمیص کے کالر چڑھے ہوئے دروازے کے اندر آیا۔ منیر نے اس کو پکارا "کمار۔ کمار۔ یہاں" کمار آ کر منیر کے پاس بیٹھ گیا مصباح اور جبو ایک ایک کرسی کھسک گئے۔

"کمار صاحب" مرزا نے کہا "وہ نرملا کو بھی دیکھا"

کمار نے پیچھے دیکھ کر کہا "ہونگی۔ تم کو کیا فکر۔ اچھا۔ آج طور بُرے ہیں۔ آج تمہیں پھانس ہی

لے جائیگی - دیکھ ہی رہی ہے نگاہ بد سے تمہیں"

"نہیں - وہ پرماتما کے ساتھ محو ہے اور آج - ع "نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں"

"خیر تمہیں کیوں رشک آتا ہے - تمہاری تو یہ لائن ہی نہیں ہے - تم تو عشق حقیقی میں عقیدہ

کرتے ہو - ارے وہ ساتھ نہیں - وہی تمہارا عزیز ہوتا ہے جسے تم پڑھاتے ہو"۔

"وہ آج آیا ہی نہیں" مصباح نے اطلاع دی -

"اُف - تو اُن کی کنووکیشن نامبارک رہی"۔

منیر کھل کھلا کر ہنسے - جتو چونک پڑے - مرزا نے بات چیت کا موضوع بدلنے کے لئے

کہا "محبوب عالم صاحب ہادآر یو (آپ کا کیا حال ہے ؟)

"کمانے لگے کہنے" کمار بولا "اپنی کہو - محبوب کا جو حال ہے وہ ہم سب پر روشن ہے"۔

"میں کوئی جواب دیدوں گا تو آپ یہاں سے اُٹھ کر چلے جائیں گے "

"پرماتما کے لئے آپ کبھی کوئی جواب دیں تو - آج پانچ برس سے میں منتظر ہوں کہ کاش

آپ کوئی ایسا جواب دیں کہ میں بھاگتا ہی نظر آؤں"۔

"ارے - جانے دو بھئی - یہ کیا گڑبڑ میں پھنس گئے" منیر نے کہا -

مرزا صاحب بہت سنجیدہ صورت بنا کر بیٹھ گئے - منیر اور کمار میں باتیں ہونے لگیں -

"عارف کہاں رہ گیا - باہر تو تھا"

"وہ ادھر ہے - راجہ کے ساتھ - آئیگا یہاں بھی "

"راجہ کو آج دیکھا تو کئی دفعہ مگر بات نہ ہو سکی "

"آج ہی تو آیا ہے دیہات سے - اس کی دادی بیمار ہے تو اسے ولایت میں فکر لگی کہ کہیں

مر مرا جائے تو اس کے پاس سونا چھونا جو ہے وہ سب اس کے متعلقین لے بھاگیں گے - مگر وہ

بڑھیا پرانی ہڈی ہے ایسی آسانی سے تھوڑے مرے گی - تو راجہ ایک ہفتہ سے تھا دیہات میں

کل چلا جائیگا انگلینڈ واپس - وہاں ایک میم سے کورٹ شپ چلا رہا ہے نا ...... لو وہ عارف آ گیا"

عارف دروازے میں داخل ہو کر پھرتی سے قدم بڑھاتا ہوا ان کی طرف آیا۔

"میں تمہیں پوچھ ہی رہا تھا" منیر نے کہا۔

"میں تم سے کہنے آیا ہوں کہ انٹرول میں تم سب کو ہم چائے دے رہے ہیں۔ باہر رسٹوران میں سمجھے۔ آپ مرزا کلاڈ آف ارتھ (مٹی کے تودے) آپ مصباح ببول (مٹی کے بانس) اور تم جو ٹکٹ لانے والے ہیرو۔ اس بھیڑ میں گھسنا اور کامیاب واپس آنا تم بالکل ہیرو ہو۔ کمار پونگے پنڈت تم تو ہو ہی۔ ..... اچھا میں نیرا اور ریمو سے بھی کہہ دوں"

یہ کہکر عارف نرملا کے پاس گیا اور بولا "تم دونوں انٹرول میں چائے پینا ہمارے ساتھ باہر رسٹوران میں"

نرملا کھل گئی اور پرمانک بولا "اچھا"

"سیدھے آجانا۔ بلانے کی ضرورت نہ پڑے۔ وقت کم ہوتا ہے انٹرول کا"

"ہم بھلا چوکنے والے ہیں" نرملا بولی اور مسکرائی۔

انٹرول میں سب لوگ رسٹوران میں جاکر بیٹھے اور چائے اڑانے لگے۔ کئی چھوٹی میزیں ملا کر ایک بڑی میز کا کام دے رہی تھیں اور ایک کونے پر راجہ بیٹھے ہوئے تھے۔ لندن کا سلا ہوا ڈنر سوٹ اور ٹوپ ہیٹ پہنے تھے۔ چہرہ پر ایک بناوٹی نفاست نمایاں تھی۔ گردن ضرورت سے زیادہ اٹھی ہوئی تھی اور آنکھیں کچھ اس انداز سے ادھر ادھر چلتی تھیں کہ ریاست والوں اور ریاست والوں ہی کی آنکھوں کو چلنے کا حق ہے۔ ان کے داہنے منیر تھے اور بائیں جو میز کے دوسرے کنارے پر نرملا تھی۔ اس کے داہنے پرمانک تھا اور بائیں عارف نے کمار کو بٹھایا تھا۔ عارف کمار کے بعد بیٹھا تھا اور باقی سب لوگ درمیان میں ادھر یا ادھر بیٹھے تھے۔

عارف نے نرملا کی طرف رخ کر کے کہا "نیرا۔ تم کمار کو تو جانتی ہی ہو!"

"ہاں ہمارے ساتھ ہیں۔ تم دونوں پاس ہی پاس بیٹھتے ہو کلاس میں"

"مطلب یہ کہ تم سے اور اس سے فارمل انٹروڈکشن (باقاعدہ تعرف) نہیں ہوا کبھی تو

یہ تم سے بات کرتے جھجکتا تھا۔" اور رکمار کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا "اب نہ جھجکنا بے رکمار"

"یہ کون سی بات تھی۔" نرملا نے کہا اور اپنی کرسی کو ذرا کج کرکے رکمار کی طرف رخ کر لیا اور اس سے باتیں کرنے لگی۔

عارف نے راجہ کی طرف رخ کرکے کہا "اماں تم کل چلے ہی جاؤ گے راجہ۔ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

راجہ نے انگریزی لہجہ میں جواب دیا "جتو بھائی سے میں یہی کہہ رہا تھا۔ ان کے والد میرے ماموں ہیں۔ ان سے بھی نہیں مل سکا۔"

"اور پھر کب آؤ گے۔ منیر کی شادی ہونے والی ہے۔ اس میں آؤ گے۔"

"ہاں منیر نے مجھے دعوت بھی دی۔ مگر دیکھئے۔ کوشش کروں گا۔" یہ سب انہوں نے ٹامیوں والی انگریزی میں کہا۔

"کیا معلوم منیر کی شادی اور تمہاری دادی اماں کا وصال ایک ہی زمانے میں آپڑے"

سب ہنس دیئے۔ سینما کی گھنٹی بجی۔ سب لوگ جلدی جلدی اپنی پیالیاں ختم کرکے اٹھنے لگے۔ مصباح نے اٹھتے اٹھتے ایک کیک اُچک لینا چاہا مگر وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر بکھر گیا اور سب لوگوں نے انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا۔ فرزانہ شروع سے آخر تک اپنی آنکھیں زمین دوز کئے رہے تھے چنانچہ شاید فرش کے پتھر گنتے ہوئے ہال کی طرف چلے گئے۔

عارف بکا کاؤنٹر پر بل چکانے گیا اور رکمار اس کے ساتھ ساتھ۔ عارف نے کہا "کہو بیٹا۔ اب تو نہ جھجکو گے"

"نہیں۔ اب نہیں۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ میں سلام کروں اور وہ منہ پھیر لے تو۔ جتو کے سلام پر تو ہمیشہ منہ پھیر لیتی ہے۔"

پھر دونوں اپنے اپنے درجوں میں چلے گئے۔

سینما ختم ہونے پر راجہ ہر ایک سے بائی بائی کرکے اپنے موٹر پر چلے گئے۔ پرمانک کے موٹر پر نرملا چلی گئی۔ عارف کے موٹر پر رکمار رہ گیا اور منیر کی گاڑی کو ان کے ساتھیوں نے ڈھکیلا۔ جاڑے

کی رات میں اتنی ٹھنڈی ہو گئی تھی کہ قریب ایک فرلانگ دوڑائی گئی جب اسٹارٹ ہوئی۔

جتو نواب اپنے گھر کے قریب سڑک پر اتر پڑے اور گلی میں داخل ہوئے، کچھ قدم آگے جاکر ان کے پیر لڑکھڑائے اور وہ پلٹ کر پھر سڑک پر آگئے۔ بات یہ تھی کہ اسی گلی میں آگے بڑھ کر ایک پیپل کا پیڑ تھا جس پر لوگ کہتے تھے کہ ایک نٹ کا بھوت رہتا تھا۔ جتو نواب رات کے وقت اس پیڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے اب تک ڈرتے تھے اور رات میں گھر ایک دوسری گلی سے واپس آیا کرتے تھے جو سڑک پر کچھ دور آگے جاکر آتی تھی اور کافی چکر کے بعد وہ اپنے گھر پہونچتے تھے۔ آج وہ نرملا کے تصور میں کچھ ایسے زیادہ گم تھے کہ اسی گلی میں چل کھڑے ہوئے مگر فطرت نے ان کو چونکایا اور وہ سڑک پر آکر دوسری گلی میں آگئے۔ وہ نرملا پر اگست کے مہینہ سے عاشق تھے جب وہ لڑکیوں کے کالج سے آکر ایم۔ اے میں داخل ہوئی تھی۔ مگر وہ اس سے کبھی اتنے قریب نہیں ہوئے تھے جتنے کہ آج سینما کے رسٹوران میں اور بلائے صحبت لیلے نے ان کے دل و دماغ کی وہ حالت کر دی تھی جو بیان سے باہر تھی۔ آنکھوں کے سامنے نرملا کی تصویر کھیل رہی تھی اور دل میں عجیب طرح کی ہوکیں اٹھ رہی تھیں۔ گلی کے اندھیارے میں بڑھتے ہوئے اکثر ان کے منہ سے "ہائے نرملا" آہستگی کے ساتھ نکل گیا۔

آخر کار وہ اپنے دروازے کے قریب پہونچے۔ یہاں دیوار سے بالکل چپکی ہوئی ممّو کھڑی تھی اور ایک سنڈامسنڈا جیسے کہ اسپر چھایا ہوا کھڑا تھا۔ ان کے پیر کی چاپ پاتے ہی ممّو الگ کھڑی ہو کر بولی "ہائے جتو نواب۔ کہاں چلے گئے تھے آپ۔ سب پریشان ہو گئے تھے نہیں تو۔ ببو نواب آپ کو ڈھونڈھنے گئے۔ قمر نواب نے آکے کہا آپ وہ نگوڑا بائیسکوپ دیکھنے گئے تو سب نے چین سے کھانا کھایا۔ آپ کے لئے سالن کا پیالہ چولھے میں دبا ہے اور روٹی چھینکے پر رکھی ہے۔ ہائے یہاں تو کنوؤں جال پڑ گئے۔ ایسا نہ کیا کیجئے اللہ۔ سب دہل جاتے ہیں گے۔"

جتو نواب سب سنتے ہوئے اور کچھ نہ بولتے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔ گھر میں سب سو گئے تھے۔ اپنے کمرے میں پہونچے تو دیکھا کہ پلنگ پر ان کی بیوی خراٹے لے رہی تھیں اور تخت پر

ان کا بھائی لحاف میں گڑمڑی مارے پڑا تھا۔ کونے سے ٹمٹماتی ہوئی لالٹین اٹھا کر اس کی لو تیز کی اور باورچی خانے سے سالن کا پیالہ اور روٹیاں لاکر تخت پر بیٹھ کر کھانے لگے۔

یہ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ جبو نے کروٹ لی اور چونک کر بولا "کون ہے؟"

"میں آگیا تم جاؤ اپنے پلنگ پر"

وہ لحاف کو لپیٹتا ہوا دالان کی طرف چلا گیا۔ جبو نے باورچی خانہ میں جا کر پیالہ طاق پر رکھ دیا اور چلم پر آگ رکھ کر اپنے کمرے میں واپس آئے۔ چلم کو حقہ پر رکھ کر وہ اپنی بیوی کے لحاف میں گھس رہے اور لیٹے لیٹے حقہ پیتے رہے۔ نرملا کا تصور ان کے سامنے تھا اور دل کی ہوکیں کسی طرح کم نہ ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی گتو کا بھی خیال آجاتا تھا مگر جب سے انہوں نے نرملا کو دیکھا تھا تب سے انہیں گتو سے نفرت سی ہوتی جاتی تھی۔

حقہ جل گیا اور نیچے کو سیدھا کر کے انہوں نے اپنی بیوی کی طرف کروٹ لی۔ جب سے انہوں نے نرملا کو دیکھا تھا اس دن سے ہر رات کو اندھیارے میں وہ یہ تصور کر لیا کرتے تھے کہ ان کی بیوی ہی نرملا ہیں، چنانچہ آج بھی یہی تصور کرتے ہوئے انہوں نے اپنی بیوی کے جسم پر ہاتھ رکھا۔ بیوی نے ان کے ہاتھ کو جھٹک کر کہا "اونھ۔ گھڑی بھر سونے کے بھی روادار نہیں" کچھ دیر کے بعد انہوں نے اپنا پاؤں اپنی بیوی کے پاؤں پر رکھ دیا۔ بیوی نے چونک کر کہا "آگ لگے"، اور پھر سو گئیں۔ پھر تھوڑی دیر انتظار کر کے جبو نواب نے ایسی ہی کچھ حرکت کی تو ان کی بیوی نے ان کی طرف دو ہتڑ چلاتے ہوئے کہا "بھاڑ میں جائے نیند حرام کی ہے گی"

اب انہوں نے شکست مان لی اور اپنی طرف کروٹ لے کر نرملا کا تصور باندھے ہوئے سو گئے۔

صبح کے قریب ان کی آنکھ کھلی تو پھر انہوں نے بیوی کی طرف رخ کیا اور ہاتھ بڑھایا۔ بیوی نے اپنے ہاتھوں کو ان کے ہاتھ پر اس طرح مارا جیسے کوئی مرغی پنجے مارے۔ وہ چت لیٹ گئے اور سوچنے لگے۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ وہ عشق میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے سوچتے سوچتے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان میں جسارت کی کمی ہے۔ وہ جس عورت کو پسند کرتے

اسے محویت کے ساتھ محض دیکھ ہی سکتے تھے اس سے ملنے کے لئے کوئی عملی قدم بڑھانے کی ان میں ہمت ہی نہ تھی۔ سب میں پہلے ان کا دل تکو ہی پر آیا آخر اس کے ساتھ ساتھ کھیلے اور ساتھ ساتھ جوان ہوئے مگر تکو کو کبھی چھو دینے کی بھی انہیں ہمت نہ ہوئی۔ تکو کو تو کبھی کسی سے انکار ہی نہیں۔ ان کا جی ضرور چاہتا تھا کہ کبھی اس کو چھیڑیں مگر اس کے روبرو محویت ایسی طاری ہو جاتی کہ ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے...... مگر جوان ہونے کے بعد ان کی تکو کی طرف توجہ بھی تو زیادہ دن نہیں رہی...... وہ بسنتی جو اپنے باپ کی دوکان پر بیٹھی رہتی تھی اس کے عشق نے تکو سے نفرت پیدا کر دی تھی۔ تکو کی طرف سے منہ موڑ کے چلے جاتے اور بسنتی کی دوکان کے سامنے سے دن رات گزرتے۔ دو برس چکر لگائے مگر کبھی بڑھ کر اس سے سودا لینے کے بہانے بھی بات نہ کی۔ ایک دفعہ سودا لینے بھی اس کی دوکان پر گئے تو جب تک وہ بیٹھی رہی دوکان کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوئی اور جب اس کا باپ آیا تو اس سے سودا لائے۔ جب اس کا گونا ہوا ہے تو دل کا عجیب عالم تھا۔ وہ چلی گئی اس کے دھیان میں برسوں محو رہے۔ شادی ہوگئی اسے بھول بھی گئے۔ تکو ہمیشہ ساتھ رہی سینکڑوں پار کرتی رہی مگر اسے کبھی چھو کر گزر جانے کی بھی ہمت نہ ہوئی...... منیر کے احاطہ میں کسگر کی لڑکی۔ دیکھ دیکھ کیسی مسکراتی تھی۔ ایک دن پیسے مانگنے لگی: ہائے اس روز پیسے ہی نہ تھے کوئی مگر جب آٹھ آنے پیسے جیب میں رکھ کر سے گئے اور وہ ملی بھی اور مسکرائی بھی تو یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ "اس دن پیسے مانگتی تھی لے آج لے لے"...... مگر اس کے فوراً بعد ہی نرملا دکھائی دی...... نرملا سب حسینوں کے حسن کا مجموعہ...... اس کو بس کئی دفعہ سلام کرنے کی ہمت پڑی مگر وہ مجسمہ ناز ہمیشہ منہ پھیر کر چلی گئی۔

یوں ہی سوچتے سوچتے وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ عشق کے سلسلہ میں وہ ابتدا ہی سے غلط راہ لگ گئے۔ اگر وہ تکو پر حاوی ہو جاتے تو پھر ہر عشق میں کامیاب ہوتے چلے جاتے...... کیا گزرا ہوا زمانہ واپس نہ آسکے گا؟...... کیوں نہیں واپس آسکتا ہے؟ گو ابتدا

تھی وہ اب بھی موجود ہے - بے عذر ہے - آج انہیں بی اے کی ڈگری ملی ہے وہ مستند
اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو گئے - ان میں ہمت کی کمی کیوں نہ پوری ہو جائے - آج - ابھی -
یہ سوچ کر وہ اپنے پلنگ پر سے اُٹھے - اندھیارے میں ان کی صورت نہیں دکھائی دے
رہی تھی مگر جو شخص ان کے چہرہ پر روشنی ڈالتا اس کو عزم اور استقلال کی تصویر ضرور دکھائی
دیتی - گردن زندگی میں پہلی دفع شانے سے زیادہ قائمہ بناتی ہوئی اور پیٹھ خط مستقیم کی طرح
سیدھی نظر آتی - غرض تعجب انگیز پھرتی کے ساتھ وہ باورچی خانہ کی کوٹھری میں آئے جہاں
ممّو اپنی ماں کے پاس سو رہی تھی اور اس کا ایک ہاتھ لحاف کے باہر تھا - انہوں نے اسی ہاتھ
کو پکڑ لیا اور ہلایا - ممّو چونک کر چیخی "ارے - بلی" - اس کی ماں بھی چونک پڑی اور چیخی "ارے
چور - ارے چور" دونوں کی گھگھی بندھ گئی - جمّو نواب بھاگ کر اپنے کمرے میں ہو رہے دالان
میں قیصر چونک کر انور کے لحاف میں گھس گئی اور اس سے لپٹ کر چیخنے لگی - جمّو نے لحاف کے
اندر ہی سے شور مچایا "لینا پکڑنا" بیگم صاحب نے نواب صاحب کو جھنجھوڑا "اے اُٹھئے - چور
آ گئے - یا جناب امیر آئیے"

جمّو نواب اپنے کمرے میں سے لپک کر دالان میں آئے اور کونے سے لالٹین اٹھا کر
اس کی لو بڑھائی اور بولے "کیا ہوا - کچھ نہیں - کوئی بھی نہیں"

نواب صاحب نے اپنا لحاف اُلٹا اور نور کی آواز میں بولے "اف یہ گدھے کی بچیاں
سفلیاں جو کچھ نہ کریں سو تھوڑا ہے - کچھ نہیں تو چیخنے لگیں کوئی خواب واب دیکھا ہوگا"

ممّو کی اب تک آواز آ رہی تھی "ارے بلی" اور اس کی ماں کی "ارے چور"

نواب صاحب اُٹھ کر کہتے ہوئے آئے "ارے قطاماؤں - تنغتلون - چپو چپو - کچھ نہیں ہے"
اور ان کے پاس آ کر دونوں کو جھنجھوڑ ڈالا - وہ دونوں آپے میں آئیں - نواب صاحب دالان
میں واپس آئے اور غصہ میں کہنے لگے "بیگم - آخر ان بلاؤں کو کیوں رکھ چھوڑا ہے - ابھی نکالو -
اسی وقت میں روادار نہیں ہوں اس طرح دہلانے کا"

"اُف فوہ" بیگم صاحب بولیں "ان کو نکال دوں تو کوئی ملے گا بھی۔ اور وہ ممّو تو میری محبت میں پڑی ہے میں نے پالا ہے اس کو نہیں تو جب کہو اس کا میاں لے جائے کانپور"۔

ماما پستہ اور ممّو دونوں دالان میں آ گئی تھیں۔ ماما پستہ نے سر پیٹ کر کہا "ہائے اب بڑھاپے میں ہم کو نکالا ملے گا۔ ہم کس گھر جائیں گے" اور ممّو نواب صاحب کے حقہ پر سے چلم اٹھا کر باورچی خانہ کو چل دی۔

جتّو نواب بولے "کچھ نہیں۔ کوئی خواب واب دیکھا ہوگا ان لوگوں نے جانے دیجئے" نواب صاحب اپنے لحاف میں گھس گئے۔ ممّو نے حقہ پر چلم لا کر رکھ دی اور بات رفع دفع ہو گئی۔

جتّو نواب پھر آ کر اپنے لحاف میں گھس رہے۔ ان کی بیوی خراٹے لے رہی تھیں۔ وہ اس وقت عجیب ندامت محسوس کر رہے تھے...... چند لمحہ کے بعد انہیں تعجب ہوا کہ کیا سوچ کر گئے تھے اور کیا ہو گیا...... قسمت ہی الٹی ہے۔ نہیں۔ انہوں نے غلط نتیجہ نکالا تھا۔ اب پرانی راہ پر واپس جانا ممکن نہیں...... تعلیم یافتہ آدمیوں کے لئے سفلی عورتوں سے تعلق زیبا نہیں...... مسٹر سید محبوب عالم رضوی بی۔ اے کے لئے مس نرملا پریش بی۔ اے ہی سے عشق موزوں ہے...... اسی سلسلہ میں ہمت کے ساتھ جدوجہد کرنا چاہئے...... یوں ہی سوچتے سوچتے ان کی آنکھ لگ گئی۔

(۳)

دن چڑھے جتّو نواب سے سوال ہوا کہ وہ رات میں اتنی دیر کیوں غائب رہے تھے۔ انہوں نے جواب دیا "علم والے نے کہا کہ دو گھنٹے میں علم نے جانا۔ میں منیر میاں کی طرف نکل گیا۔ انہوں نے کہا چلو دو گھنٹے سینما میں کٹ جائیں گے۔ میں ان کے ساتھ چلا گیا۔ قمر بھائی سے کہتا گیا تھا کہ گھر پر کہہ دیں۔ اب واپس جو آتا ہوں تو وہ دوکاندار دوکان بند کر کے جا چکا تھا۔ چرکا دیا اس نے"۔

خیر اب ان کو فوراً علم لینے چلا جانا چاہیئے۔

وہ اپنے کمرے میں آئے انگنی سے اتار کر شیروانی پہنی اور گون کو لپیٹ کر بغل میں دبایا گھر سے نکل آئے۔ کافی دور چل کر علم والے کی دکان پر پہونچے۔ اس نے کہا "ابھی ایک گھنٹہ میں تیار ہو جائیں گے"

انہوں نے جواب دیا "اچھا ہم گھنٹہ بھر میں واپس آتے ہیں" اور کالج گون واپس کرنے چل دئے۔ کالج سے واپسی پر خیال ہوا کہ چلو ذرا عارف کے یہاں ہوتے چلیں اور وہ عارف کے گھر پہونچے۔ عارف کا گھر جدید بنگلوں کی طرح کا تھا۔ پورٹیکو کے داہنے جانب ایک بڑا گول کمرہ تھا جس کا دروازہ برآمدے پر کھلتا تھا اور جس کے سامنے کے رُخ پر متعدد کھڑکیاں تھیں جن پر لوہے کی جالی منڈھی ہوئی تھی۔ جتّو پورٹیکو سے ہو کر برآمدے میں آئے اور اس کمرے کے دروازے میں داخل ہوئے۔ عارف مسہری پر لیٹا پڑھ رہا تھا مسہری کے پاس ایک آرام کرسی پڑی تھی جتّو نے اس کرسی کو کھسکایا تو عارف ان کی طرف متوجہ ہوا اور بولا "آؤ۔ آؤ۔ جتّو"

جتّو کرسی پر بیٹھ گئے اور عارف نے کتاب بند کر کے سرہانے رکھی اور تکیہ کو مسہری کے جنگلے سے لگا کر اس کے بل بیٹھ گیا اور بولا "اماں تم کو آج ادھر آنے کی فرصت کیسے ملی تمہارے یہاں تو مجلس ہے"

"اسی سلسلہ میں ادھر آنا تھا میں گون بھی لے آیا تھا کہ واپس کر دوں گا۔ وہ واپس کر کے بازار جانا تھا مگر ابھی اس نے علم تیار نہ کئے ہونگے میں نے کہا جب تک تمہارے یہاں بیٹھوں"

"اچھا۔ گون اب واپس کیا۔ ہاں تم نے کنووکیشن کے بعد گون واپس نہیں کیا تھا۔ میں بھی نہیں سمجھا تھا کہ تم گون پہنے ہوئے کیوں گھر چلے گئے۔ وہ مصباح تو بولے تھے کہ مار دیا تم نے مگر دھر سے جاؤ گے اور اس مرزا کے بچے نے کہا یقیناً مار دیا۔ مگر یار ہم لوگ پھر گنوار تم لکھنؤ نہیں لکھنؤ والوں کی باتیں نہیں سمجھ سکتے بدتمیز"

"میں نے کہا کہ ذرا گھر والے بھی اور رستے میں ملنے والے بھی دیکھیں"

"واہ - واہ - اب میں سمجھا - یہ باریکیاں، غیر لکھنوی یعنی گنوار نہیں سمجھ سکتا - یہ آن بان شان کے پوشیدہ گر ہیں - گون پہنے ہوئے چلے جا رہے ہیں - جیسے اکثر مانجھے کے دولہا زود کرتا ہاتھ میں کنگنا بندھا کنکیا اڑاتے ہیں تاکہ لوگ دیکھیں تو کہ ان کا مانجھا ہو گیا"

"راستے میں تو میں نے اتار لیا تھا - منیر کے ساتھ گیا تھا"

"مگر گھر میں جاتے وقت ضرور پہن لیا ہو گا یار - دار الخلافت میں شہنشاہ کی طرح ملک فتح کر کے واپس داخل ہوئے ہو گے نوبتیں بجتی ہوئی - تماشبینوں کا مجمع - کیا پر شکوہ منظر ہو گا افسوس ہم نہ ہوئے یار ہم شاہان اودھ کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے تو اچھا تھا - وہ ٹھاٹھ باٹھ ہم نے آنکھوں سے دیکھا ہوتا - کچھ اسی ٹھاٹھ باٹھ کا شائبہ تمہارے اپنے گھر کے اندر داخلے میں بھی ہو گا - کاش وہاں کوئی ایسا کیمرہ لگا ہوتا کہ فلم اتر آتی"

"جانے دو یار مذاق نہ اڑاؤ"

"مذاق؟ یہ تم کیا کہتے ہو - مجھے پرانے زمانے سے گہری دلچسپی ہے میں تم سے کتنے بار کہہ چکا - اسکاٹ کی تمام ناولیں میں نے اسی دلچسپی کے ماتحت پڑھیں اور ان کے پڑھنے کا اثر یہ ہوا کہ میری دلچسپی حد سے زیادہ گہری ہو گئی - تم کچھ نہیں ہو مگر تمہارے خون میں اسی زمانے والے بادشاہوں کا محرک اب بھی ہے - اس لئے تمہیں میں ہیرو کہتا ہوں"

"خیر - اس وقت مجھے تمہارا فلسفہ - ارے بھئی مجھے علم لینے جانا ہے"

"وہی علم چاندی کے جن پر ملمع کرانے دے آئے تھے - اب یہی دیکھ لو لکھنوی تہذیب کی ہر بات ایک دوسری سے ہم آہنگ ہے - چاندی کے علموں پر سونے کا ملمع کرا کے حضرت عباس کی درگاہ میں چڑھاؤ گے نا - مصباح کہتا تھا کہ اس سراسر حماقت کا کیا ٹھکانا - مرزا بولے ملمع کرانے کے معنے یہ ہوئے کہ دھوکا دینا اور یہ حضرت عباس کو دھوکا دیا جا رہا ہے شاید منیر علم چڑھانے ہی کو فضول سمجھیں گے حالانکہ خود شاہ مینا صاحب میں زربفت کی چادر

چڑھا چکے۔ مگر یار میں تو قائل ہوں اس فن برائے فن کے پہلو کا جو اس بامر میں مضمر ہے۔"

"یار اب بس کرو۔ تم مجلس میں آ رہے ہو ہمارے یہاں یا نہیں۔"

"کتنی دیر مجلس ہو گی؟"

"کوئی گھنٹہ بھر"

"اف فوہ۔ اتنی دیر خاموش بیٹھنا اور پھر ایک بالکل اٹکل پچو حماقت زدہ وعظ کو سننا۔ بھئی ہماری برداشت سے باہر ہے"

"تو تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آنا"

"نہیں ایک چیز اور بڑی تکلیف دہ ہے۔ یہ تمہارا تمام مذہب جس کا مکمل اشارہ) سونے کا ملمع کئے ہوئے چاندی کے علم ہیں اور مجلس بھی اسی سے ہم آہنگ ایک چیز ہے۔ ان سب میں ایک مربوط اور حسین تہذیب مضمر ہے مگر یہ کس قدر تباہ کن ہیں۔ اف فوہ۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا ان کا منظر۔"

"یہ سب کیا گول باتیں کر رہے ہو۔ میں جاتا ہوں علم والے کی دکان ہی پر بیٹھوں گا۔ تم نہ آؤ گے مجلس میں۔"

"کہاں جاؤ گے ذرا زندگی کو سمجھنے کی بھی تو کوشش کیا کرو۔ یہ رکھ کر بھاگنا تمہیں زیب نہیں۔ تم مجھ سے بارہ برس بڑے ہو میرے بھائی جان کے ہمسن ہو اور ان کے ساتھ بھی ایک سال پڑھے اور اب بی۔ اے کے آخری سال تمہارا چوتھا سال تھا شاید اس میں میرے ساتھ ہوئے ہیں تو تمہارے استقلال سے مرعوب ہوا۔ ابھی اگر تم دس برس اور فیل ہوتے تو بھی پڑھے ہی جاتے اور یہاں ایک درجہ میں ایک سال کاٹنا ہی اجیرن ہو جاتا ہے۔ مگر مجھے اب یہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ یہ تمہاری ساری تہذیب اور سارا استقلال تباہ کن ہے۔ حماقت ہے۔ مجلس اپنی جگہ پر عمدہ چیز ہے۔ مگر تمہارے یہاں مجلس میں جا کر ایک تکلیف تو وہ ہو گی جس کا تم نے علاج بتایا کہ جلدی اٹھ کر چلا آؤں۔ مگر دوسری تکلیف کا کیا علاج ہو گا۔"

"دوسری تکلیف دہ کیا"

"دیکھو جب میں تمہارے یہاں مجلس ہوتی ہوئی دیکھوں گا تو مجھے یہ خیال ضرور آئیگا کہ تم تباہ ہو رہے ہو اپنے مذہب کے ہاتھوں۔ فرش و رش چائے وائے کے انتظام میں ایک پچاسہ تو ضرور خرچ ہوگا۔ پھر جناب کو مجلس پڑھنے کے پچاس تو ضرور ہی دئے جائیں گے اور متفرقات جیسے علم ہیں۔ درگاہ جانا، چراغی وراغی ان سب میں بھی پچاس ہی رکھ لو۔ مجھے ضرور خیال آئیگا کہ تمہارا خاندان کوئی ڈیڑھ سو کا اور زیر بار ہو گیا۔ تمہارے والد نے سودی روپیہ تو ضرور قرض لیا ہوگا ماکھن لال سے کیوں؟"

"ہاں دو سئے قرض لئے ہیں"

"میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔ پرانے قرضوں میں یہ اور اضافہ ہوا اور ادا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ایک مکان تو میرے علم ہی میں بک کر ادنے پونے قرضہ ادا ہو چکا ماکھن لال کا۔ اب یہ مکان رہ گیا ہے۔ یہ بھی یوں ہی جائیگا"

"ممکن ہے کوئی صورت ادائیگی کی نکل آئے"

"کیسے ممکن ہے۔ تمہارے والد کے وثیقہ میں ان کی افیم تک کی گنجایش نہیں ہے ہم پڑھ سکے اسی لئے کہ بحنیٹ؟ روپیہ کی معقول رقم تم کو شاہی وظیفہ برائے تعلیم ملتا ہے اور وہ بھی گھر کے خرچوں میں لگ جاتا ہے۔ تمہارے پاس نہ کپڑے ٹھیک سے ہوئے نہ کبھی کوئی کتاب ہوئی اور بی۔ اسے کے امتحان کے نے لینے میں سے تمہیں روپیہ دسئے جو دس دس پانچ پانچ کر کے تم ادا کر سکے۔ ایف ایم۔ اسے میں فارسی والوں سنے تمہاری فیس معاف کرا دی ہے تاکہ ان کے ڈپارٹمنٹ میں کوئی ہو تو۔ اس لئے اور اس طرح تم ایم۔ اسے کر رہے ہو اور کبھی تمہارے یہاں کوئی برکت نہیں ہوتی۔ خیر تو مطلب یہ کہ یہ سب باتیں سوچ کر مجھے بڑی تکلیف ہوگی"

"فضول کی باتیں کرتے ہو"

"فضول کی باتیں ہیں۔ تمہاری قوم کو عیاشی نے نہیں مذہب نے تباہ کیا"

"ادھو- کل نرملا تو بہت زوروں پر تھی"

"بات کاٹ دی خیر- میں نے اُسے کمار سے ملا دیا- بہت خوش ہے سالا پونگا پنڈت"

"اور مجھ سے نہیں ملایا؟"

"تم سے- اما تم کو بھی یہ خواہش تھی- سچ کہنا- میں تو تمہارے عشق ہی کو عشق برائے عشق سمجھتا تھا- تمہاری لکھنوی تہذیب میں ہر چیز اسی طرح چلتی ہے مقصد غرض وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں- ع- کمال نقص ہے گر نام آرزو آئے - یہ اس سے ملنے کی خواہش نئی چیز ہے- میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تمہارے دل میں کوئی خواہش بھی ہو سکتی ہے بس ع بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے- پیور لو (خالص عشق) ارے یہ تو بالکل نئی بات ہے یہ کیسے ہوا کب؟ کیونکر- تمہاری خالص محبت کی میرے دل میں بڑی عظمت تھی- یہ ملنے ملانے کی خواہش کہاں سے آئی؟"

"تم اس وقت بہت زیادہ فلسفے کے موڈ میں ہو میں جاتا ہوں اس نے علم تیار کرتے ہوں گے"

"فرار یہ فراریت بھی تمہاری فطرت کی مخصوص چیز ہے- ع- مرا چہ کار کہ منع از شراب خوار کنم- جاؤ- اچھا"

(۴)

جب نواب اپنے گھر واپس آئے تو دیکھا ان کی سب سے بڑی بہن اکبر جہاں آئی ہاں ان کی والدہ کے پلنگ پر پائنتی کی طرف بیٹھی ہیں- ان کے نو بچوں میں چھوٹے بچے افسر کے ساتھ کھیل رہے ہیں- ان کی دو جوان لڑکیاں قیصر کے پلنگ پر بیٹھی اپنی خالہ سے باتیں کر رہی ہیں اور وہ لمبا جاتی بیچ کی محراب کے پاس کوٹ اتارے آستینیں کندھوں تک سمیٹے کھڑے کہہ رہے ہیں" بھابھو اماں یہ تو ایسے ہی شبہے کرتی ہیں- آج جیش رش شادی کو ہو گئے- وہی ایک بات یہی راگ روتی رہے ہو تمہیں نہیں تو؟"

جتو نواب نے بڑی بہن کو تسلیم کی اور بھانجیوں کی تسلیمیں لیں اور دولہا بھائی کی طرف گردن کو پندرہ درجہ پر خم کرکے دیکھا شاید اس لیے کہ دونوں آنکھوں کی نظر ایک ہی مقام پر پڑے۔

دولہا بھائی جتو کی طرف رُخ کرکے اپنی بائیں ہتیلی پر داہنے ہاتھ کا گھونسا بنا کر مارتے ہوئے بولے "ارے جتو تم کیا نہیں جانتے ہو۔ میں جب جوان تھا جنگ ینگ" اور دولہا بھائی تن کر کھڑے ہوئے، اپنے داہنے ہاتھ کو مٹھی باندھ کر تانا ہوا بائیں ہاتھ کو داہنی ہتھیلی پر مارتے ہوئے کہا "تو میرے ساتھ نواب مظفر جنگ اپنی لڑکی کی شادی کر رہے تھے اور پیشکش ہزار روپیہ دے رہے تھے۔ میں نے لات مار دی۔"

"بالکل صحیح ہے دولہا بھائی" جتو نے کہا "مگر اس وقت کیا معاملہ ہے؟"

"بات کیا ہے۔ بات کیا ہے۔ اب تمہیں کیا بتاؤں" اور وہ ہنسے اس طرح کہ پوری بتیسی باہر نکل آئی اور پھر اپنے کو سنبھالتے ہوئے بولے "کشی نے یہ تمہاری بہن ہیں انہیں یہ جو توان نے لگا دیا کہ میں چوک جاتا ہوں۔ ہاں" اور انہوں نے اپنے سر کو آگے کی طرف حرکت دی اور اوپر کے آدھے جسم کو بھی جھکایا۔

"نہیں دولہا بھائی آپ نہیں جانتے ہمیں یقین ہے۔ آپ جب ینگ تھے تو ہم جب ایک دن نکل گئے تھے اُدھر سے تو سب رنڈیاں آپ کو دیکھتے ہی کوٹھوں پر سے پٹ پٹ گر پڑیں۔"

"واللہ خدا تمہارا بھلا کرے۔ اس دن سے آج کا دن جو کبھی راستہ بھی نکلا ہوں اُدھر کا قسم جناب امیر کی" اور وہ پلنگ پر جھک کر رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے "دیکھیے بھابھو اماں یہ فرق ہوتا ہے پڑھے لکھے میں اور ان پڑھ میں۔ ماشاء اللہ سے بی۔ اے کر لیا اور اب سے سے ہو جائے گا۔ کوئی کھاتا نقش کھوا کے کو دوں دے کے بڑھا" اور پھر اکڑ کر کھڑے ہو گئے اور داہنے ہاتھ کی کلمے والی انگلی جتو کے سامنے ہلا کر بولے "تم بس نوکر ہو جاؤ۔ تمہارا یہ تنخواہ پچاس بس ہیں تم کو ایک موٹر لوا دوں گا۔ وہ موٹر واللہ بھن بھن بھن جائے اور کوٹھیوں میں کوٹھیوں میں میری نگاہ میں ایک ہو سے واللہ خوش کلاش۔"

"ہے کوئی موٹر؟" جتّو نے اس طرح پوچھا جیسے کہ وہ موٹر خریدنے کی ہر طرح حیثیت رکھتے تھے۔

دولہا بھائی جتّو کے کان کے پاس اپنا منہ لائے اور آہستہ سے بولے "ارے وہ منیر میاں ہیں نا"

"ارے وہ موٹر جو چلتا بھی نہیں ہے"

انور جواب تک خاموش بیٹھی تھی کیونکہ ایسی باتیں ہو رہی تھیں جن میں بن بیاہی لڑکیوں کو نہ بولنا چاہئے تھا اب جھٹ سے بولی "اور کیسی موٹر دلائیں گے ہمیں، ایک مشین دلا دی تھی، جو ایک دن بھی نہ چلی اور روز مستریوں سے آ کر ٹھیک کرنے کا وعدہ کرتے ہیں"

دولہا بھائی نے انور کی بات جیسے کہ سنی ہی نہیں اور جتّو سے بولتے چلے گئے "تم کیا جانو وہ بڑی عمدہ موٹر ہے گی۔ بس اس کی بیٹری دیکھا ہے ڈاؤن ہو جاتی ہے ہے۔ میں نے منیر میاں سے کہا کہ میں ایک وہ بنا دوں، چار جنگ بوٹ بس بجلی تو تمہارے یہاں ہے ہی شام کو آنے بیٹری لگا دی صبح تک فل چارج ہو گئی موٹر نکالی۔ سلف مارتے ہی پھر سے اسٹارٹ وہ چلی جا رہی ہے۔ بھر بھر بھر بھر۔ مگر وہ مانتے ہی نہیں ہماری بات۔ دوسرے اتو کے پٹھوں کی بات سنتے ہیں۔ وہ ہیں نا تمہارے دوست کا ہے کو میرے دوست وکیل صاحب کے چچیرے بھائی عارف میاں عارف میاں ہمیشہ موٹر کے بابت میری رائے پوچھتے ہیں ہر پندرھویں دن میں موٹر دیکھتا ہوں۔ بس کوئی تکلیف کیا معنے کچھ نہیں ہوتا ان کی موٹر کو۔

"منیر کی موٹر ٹھیک نہیں"

"اسے جانے دو ہزاروں اور ہیں اس سے بھی سستی روز آیا کرتی ہیں ورکشاپ میں"

اس وقت ڈیوڑھی سے آواز آئی "ہم آتے ہیں"

دولہا بھائی ایک دم بولے "قمر آ گیا۔ بس بس۔ اب میں چائے کی تیاری شروع کرتا ہوں"

دولہا بھائی دوڑ کر باورچی خانہ کے پاس پہونچے جہاں اینٹوں پر ایک دیگ چڑھی ہوئی تھی۔ قمر نواب ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پڑا دیتے ہوئے اپنی خالہ کی پائنتی کے پاس آ کر

کھڑے ہو گئے۔ ان کی حسرت بھری نگاہیں انور پر پڑ رہی تھیں۔ انور نے اپنے سر پر دوپٹہ سنبھال لیا تھا، اس کی چمپئی رنگت پر لطیف سرخی دوڑ گئی تھی اور اس کی حلقہ دار آنکھیں شرم سے نیچی ہو گئی تھیں مگر پھر بھی ایک آدھ دزدیدہ نگاہ وہ قمر نواب پر ضرور ڈال دیتی تھی۔

کچھ سکوت کے بعد قمر نواب بولے "خالہ اماں، اب ایک پان عنایت کیجئے"

بیگم صاحب علم کے پنکھے میں لچکا لگا رہی تھیں پاندان پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں "تو خود لگا لو۔ تمہیں اپنے ہی ہاتھ کا بھاتا ہے"

انور بولی "میں لگا دوں" اور قمر سے اس کی آنکھیں حیا سے ہو کر جھک گئیں۔

بڑی خوشی سے کھل کر قمر نواب نے پاندان اٹھا کر اس کو دیا۔ پاندان لیتے وقت انور کی نگاہ ان کی طرف نہ اٹھ سکی مگر اس کے ہونٹوں پر ایک لطیف مسکراہٹ کھیل گئی۔ اپنے پلنگ پر وہ قمر کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی اور پان لگانے لگی۔ قمر اس کی دوپٹہ میں ڈھکی ہوئی چوٹی کو، اس کے چلتے ہوئے ہاتھ کو اور پھر اس کے پورے سڈول ڈیل کو حسرت سے دیکھتے رہے اس نے نگاہ نیچی کئے ہوئے ہاتھ بڑھا کر ان کو پان دیا اور اب اس کی ترچھی نگاہ ان کی نگاہ سے ملی۔ کچھ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انہوں نے پان لیا اور ان کی نگاہ قیصر کی طرف گئی جو باتیں کرتے کرتے ان کو غور سے دیکھنے لگی تھی۔ فوراً اپنی نگاہ کو اپنی خالہ کی طرف لاتے ہوئے وہ بولے "خالہ اماں۔ اب پار سال آپ ہی کو میرے لئے بھی یہی سب کرنا ہوگا میں بھی بی۔ اے کر لونگا اب کی سال"۔

"ہاں بیٹا۔ تمہیں شاباش ہے۔ استے دن چھوٹے اب سب پاس کر رہے ہو اور دکان بھی دیکھتے ہو گئے" بیگم صاحب لچکا ٹانکتی گئیں اور کہتی گئیں۔

دولہا بھائی باورچی خانے کے پاس سے کچن پھاڑ کر چیخ اٹھے "اما قمر۔ ارے بھئی شیرمالوں کا بھی انتظام کیا"

قمر نے مڑ کر کہا "نہیں۔ مجھ سے کیا کہا تھا۔ مجھ سے بس چائے کا مسالہ کہا تھا"

"اماجاؤ بھی۔ رہے عقل کے بدھو ہی۔ یہی دوکانداری کرتے ہو گے"

دولہا بھائی لپک کر دالان میں آئے۔ انگنی سے اُتار کر کوٹ چڑھاتے ہوئے بولے

"لائیے بھابھو اماں روپے۔ یہ تو سب کام لو ھو ہی کرتے ہیں ہنیں تو"

نواب صاحب پینک میں غیں تھے۔ بیگم صاحب نے پیچ کر ان کو چونکایا اور انہوں نے

پانچ روپے کا نوٹ دولہا بھائی کو دیا۔ وہ نوٹ جیب میں رکھ کر گھر سے باہر آئے۔ وہ چھوٹے

قد کے تھے اسلئے لوگوں کے ساتھ لمبے ڈگ رکھ کر چلنا پڑتا تھا۔ اس طرح چلتے چلتے ان کی

لمبے ڈگ رکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ چنانچہ لمبے ڈگ رکھتے ہوئے وہ اُسی چوک میں پہونچے

جہاں جناب امیر کی قسم وہ کبھی نہیں جاتے تھے۔ نانبائی کی دوکان پر پہونچتے ہی بولے "اے

شیرمالیں ہیں پیٹھے پیٹھے والی"

"جی ہاں نواب کتنی لیجیے گا"

"ایک یہی دو سو"

"اتنی تو نہ ہونگی"

"پھی کتنی ہونگی"

"سو ہوں گی۔ باقی ابھی آدھے گھنٹہ میں بنائے دیتا ہوں۔ آپ ذرا اور کچھ خریداری

کر لیجیے"

"اچھا بناؤ۔ ابھی آئے۔ لو یہ نوٹ رکھو۔ حساب ہو جائے گا"

یہ کہکر دولہا بھائی اور آگے بڑھے۔ ایک چائے والے کی دوکان پر پہونچ کر اندر

سگئے۔ چائے والے نے کہا "آئیے نواب۔ آئیے" اور زور سے کھنکھارا۔ سامنے کوٹھے پر

ایک گوبریلی۔ موٹی، بھدی رنڈی آئی۔ دولہا بھائی نے داہنے ہاتھ کا گھونسہ بنا کر سینہ پر

مارا اور بولے "ہائے غزب کیا مال ہے"

رنڈی نے ان کا منہ چڑھایا اور چونچ دکھاتی ہوئی اندر واپس چلی گئی

چائے والا بولا "چائے حاضر کروں نواب" ۔ نواب کا منہ ابھی تک کھلا ہوا تھا اور دانت نکلے ہوئے تھے ۔ اک دم سے چونک کر وہ بولے "ہاں لاؤ مگر ۔۔۔۔۔"

"مگر کیا نواب ۔ یہ ایسی ویسی رنڈی نہیں ہے ۔ بس ایک مہینہ میں ایک کی رہتی ہے مگر رقم لیتی ہے پورے پچاس"

"پچاس ؟ یہاں کہاں سے آجائیں گے"

"ارے کہیں سے قرض لے لیجئے ۔ آپ کے بزرگوں نے تو لاکھوں کیوں کروڑوں اسی رستے بہا دیئے"

"ہاں یار سب اپنے مزے کرتے چلے گئے ۔ ہم اب ترستے ہیں گے ۔ پچاس روپیہ بھی کوئی چیز ہوا ۔ مگر نہیں ہو سکتا"

"اچھا ہم پچیس میں راضی کر دیں گے آپ اتنے کی فکر کیجئے"

"پچیس ہیں ! واللہ ! ماما تم ہمارے بڑے دوست ہو"

"اور وہ ہمارے دو روپے اور پانچ آنے بھی آج کی چائے کو ملا کے جو ہوئے وہ تو دیدیجئے"

"یہ پانچ آنے ابھی ابھی دیتا ہوں ۔ اور روپیہ پھر لے لینا" اور یہ کہکر وہ لہا بھائی دوکان سے باہر نکلے ۔ نانبائی کی دوکان پر جاکر بولے "یار پانچ آنے دینا تو رہو رت ہے"

اس نے پانچ آنے دیتے ہوئے کہا "بس اب پانچ منٹ میں آپ کی شیرمالیں بنی جاتی ہیں"

"بس میں بھی پانچ منٹ میں آیا"

وہ لہا بھائی پھر چائے کی دوکان پر آئے اور اپنی چائے کی پیالی ختم کرنے لگے ۔ چائے والا ذرا دیر کے لئے دوکان سے باہر چلا گیا ۔ انھوں نے ادھر ادھر دیکھ الماری میں سے ایک بڑا پھولا بسکٹ کھسکا کر اپنے نیکر کی جیب میں پہونچا دیا اور جلدی سے چائے پی کر اٹھ کھڑے ہوئے ۔ چائے والا اندر قدم رکھ ہی رہا تھا کہ وہ ایک گرم ترک پر آئے اور یہ بولے "تو بھئی اب ہم جاتے ہیں"

چائے والے نے ایک کھنکار ماری اور رنڈی پھر جھروکے پر آئی۔ دولہا اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگے اور بولے "تو بھی میرا نام نواب مرزا بہادر جو وہاں اوپر نہ دکھائی دوں۔ وہاں" اور ڈگ رکھتے ہوئے چلے آئے۔

اپنی سسرال میں واپس آکر دولہا بھائی نے اپنی ساس کو نو آنے واپس دیتے ہوئے کہا، "یہ لیجئے بھابھو اماں۔ چار روپئے دو آنے کی توشیر مالیں اور پانچ آنے مزدوری کے اور نو آنے آپ کے یہ ہیں۔ خبردار"

(۵)

دو بجے سے جبو نواب کے یہاں مجلس کا سب سامان تیار تھا۔ دالان کی محرابوں پر ٹاٹ کے پردے کھول دیے گئے تھے۔ جبو نواب کے کمرے کے تینوں دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ انگنائی میں دری اور چاندنی کا فرش اس طرح کیا گیا تھا کہ چاروں طرف دو دو گز زمین خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ باورچی خانے کے قریب چائے کی دیگ دم پر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک بڑی سی میز بچھی ہوئی تھی جس پر چینی کے چار بڑے بڑے جگ اور کوئی تیس چائے کی پیالیاں معہ طشتریوں کے رکھی ہوئی تھیں۔ پاس ہی کوئی دس بارہ مدریے حقے تیار رکھے تھے بس آگ رکھنے کی دیر تھی۔

فرش کے دالان والے کنارے کے بیچ میں ایک ہتھے دار کرسی رکھی تھی جس پر ایک سفید چاندنی چڑھا دی گئی تھی۔ اس کرسی کے پاس نواب صاحب بیٹھے تھے۔ وہ بہت پرانے مخملی دار جامہ وار کی اچکن پہنے ہوئے تھے جو متعدد جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ سر پر سیاہ مخمل کی ایرانی ٹوپی تھی جس کی لگروں پر میل نمایاں تھا اور اس پر سے کانوں کو ڈھانکتا ہوا گلے میں بندھا ہوا ایک دوشالہ تھا جس میں سرخ بوٹیاں پڑی تھیں اور بہت جگہ کیڑوں کے کاٹے ہوئے چھید نمایاں تھے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر قمر نواب گلوریوں کی تھالی لئے کھڑے تھے۔ جبو نواب

چائے کی میز کے پاس ہو تے تھے۔ ان سے کچھ دور دیوار کی طرف جو کھڑا تھا اور اس کے پیچھے چار پانچ دھت بند جوان ستے تھے۔ نواب مرزا تمام انتظام کے مہتمم خاص معلوم ہو رہے تھے کیونکہ وہ کسی ایک جگہ پر نہیں ٹھہرتے تھے بلکہ ہر ایک کے پاس جا جا کر ہدایات فرماتے اور چلے آتے تھے۔

مجلس والے لوگ آنا شروع ہوئے۔ عام آدمیوں کی طرف قمر نواب کوئی توجہ نہیں کرتے مگر خاص لوگوں کو آداب کرتے اور ان کے سامنے پانوں کی تھالی بڑھاتے پھر وہ لوگ اندر داخل ہو کر فرش کے پاس آ کر جوتا اتارتے۔ کچھ کے جوتے تو نوکر لے لیتے اور کچھ بائیں ہاتھ میں اپنے جوتے تلوے ملا کر لے لیتے۔ نواب صاحب ان لوگوں کو دیکھ کر اُٹھتے اور اگر فرش کے کنارے تک نہیں تو بیچ تک ضرور استقبال کے لئے جاتے اور کہتے "آداب بجا لاتا ہوں"

"خدا مبارک کرے۔ جناب امیر کے صدقے لڑکا ماشے اللہ سے جی۔ اسے ہوا" وہ لوگ عموماً کہتے۔

پھر نواب صاحب کے ساتھ ساتھ آ کر وہ کرسی کے پاس بیٹھ جاتے جو اور ان کے سامنے چائے کی پالیاں جن پر شیر مال ڈھکی ہوئی ان کے سامنے رکھتے۔ جب وہ لوگ چائے پی چکتے تو حقے ان کے سامنے بڑھاتے جاتے حدوہا بھائی ادھر سے اُدھر آتے جاتے اور بالکل بے تکلفی طور پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بول اُٹھتے "بھئی چائے دینا" یا "بھئی حقہ بڑھانا"

تھوڑی ہی دیر میں پورا فرش بھر گیا۔ ایک گڑبڑ سٹر بٹر مجمع نظر آنے لگا جس میں کچھ چائے پی رہے تھے کچھ حقہ گڑگڑا رہے تھے اور کچھ باتیں زٹیل رہے تھے۔ گھر کے لوگ سب مصروف تھے۔ قمر دروازے کے پاس سے آ کر مجمع میں پان تقسیم کر رہے تھے۔ جو نواب جگوں سے پیالیاں بھرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک آدمی دیگ میں سے جگ بھر بھر کر رکھتا جاتا تھا۔ جو وغیرہ پیالیاں اور حقے لگانے میں مصروف تھے اور دولہا بھائی تمکنت سے تک اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے اور صرف بلا ضرورت احکام پر احکام صادر کرتے جاتے تھے۔

اتنے میں تین حضرات آئے جو بجائے فرش کی طرف جانے کے جو کے پاس آئے اور

صاحب سلامت کرکے ان کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ان میں جو صاحب سب سے آگے تھے ان کا
نام راغب حسین زیدی تھا۔ ان کا سیاہ گول چہرہ بھرے بھرے گال، چھوٹی چھوٹی آنکھیں،
باچھیں کھلی ہوئی، چھوٹی سی ناک اور اس کے نیچے بڑی بڑی گھنی مونچھیں ان سب کا تاثر یہ
شبہ پیدا کرتا تھا کہ شاید وہ جاٹ قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ وہ اچھے خاصے موٹے تھے
اور سیاہ شیروانی پہنے تھے جو ان کے جسم پر پھنسی پھنسی شاید اس لئے تھی کہ اس کے نیچے
کافی موٹی بنڈی ضرور ہو گی۔ ان کے بائیں پنجے پر تسبیح لپٹی ہوئی تھی اور ایک جنسورا دبا ہوا
تھا۔ دوسرے صاحب کا نام تصدق حسین نقوی تھا۔ وہ ملگجا اٹنگا سوٹ پہنے ہوئے تھے
اور قمیص کا گلہ کھلا ہوا کوٹ کے کالر پر پڑا تھا۔ ان کا رنگ صاف تھا، ناک نقشہ معمولی تھا
اور ان کے چہرہ کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ کوئی اچکے یا جیب کترے ہیں۔ تیسرے
صاحب کا نام عباس علی تھا۔ ان کا چہرہ بالکل بندرے کی شکل کا تھا اور ناک پر رکھی ہوئی گول
شیشوں اور کالے فریم کی عینک کے پیچھے ان کی آنکھیں قریب قریب بند نظر آرہی تھیں۔ ان کا
منہ کھلا ہوا تھا اور دانت صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سنے سرخی مائل کشمیرے کی شیروانی
پہنے تھے اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے تھے۔ ان میں سے پہلے صاحب عرصے سے ایک اسکول میں
سائنس کے ٹیچر تھے۔ دوسرے ریاضی میں ایم اے کر رہے تھے اور تیسرے تاریخ میں۔ ان تیسرے کا
آخری سال تھا۔ تینوں حضرات کسی نہ کسی وقت جتو کے کلاس فیلو ضرور رہے تھے اور اب ان کے
بڑے جگری دوستوں میں سے تھے۔

جتو نے راغب صاحب کو پیالی دی تو وہ بولے "یہ تسبیح اور جنسورہ کہیں رکھ دوں۔
آج جمعرات ہے نا۔ ادھر ہی سے درگاہ چلا جاؤں گا۔"

تصدق حسین صاحب تسبیح اور جنسورا ہاتھ میں لے کر دولہا بھائی کو دیتے ہوئے بولے
"ہاں بھائی آپ کو تو وہاں جانا ہی ہے۔ مجھے تو یہاں آنا بھی کھل گیا میرے دماغ میں ایک بڑی
خاص تھیوری آرہی تھی اور میں اس کو ورک آؤٹ کرنا چاہتا تھا۔ مگر بھئی مجلس کا معاملہ اور پھر

محبوب صاحب کے یہاں"

جتّو نے ان صاحب کو بھی پیالی دی اور شیرمال پیالی میں ڈال کر جانے پیتے ہوئے وہ بولے "خیر راغب بھائی اب تو سب ڈسٹرب ہو گیا۔ میں بھی آپ کے ساتھ درگاہ چلوں گا اور مولا سے دعا کروں گا کہ میری تھیوریاں جلد پوری ہو جائیں"۔

جتّو نے تصدق صاحب کو کچھ اس طرح گردن پھیر کر دیکھا جیسے کہ وہ داہنی آنکھ سے ان کے پیروں کو بائیں سے ان کے سر کو دیکھ کر ان کے قد کو اسی طرح ناپ رہے ہوں جیسے پرکار کی نوکوں سے کسی خط کو ناپا جائے۔

اس وقت عباس علی صاحب شاید یہ سمجھ کر کہ وہ حصّے سے محروم نہ رہ جائیں اک دم سے مجسم جتّو کے سامنے آ گئے اور بولے "بھئی ہمارا ہمیشہ دوہرا حصّہ ہوتا ہے"۔

عباس علی دو پیالیاں لے کر فرش کی طرف گئے اور دونوں میں شیرمالیں توڑ توڑ کر ڈالنے اس مصروفیت کے ساتھ بیٹھ گئے کہ جیسے ان کو قدرت نے اسی کام کو انجام دینے کے لئے خلق کیا تھا۔

تصدق صاحب نے خالی پیالی جتّو کو واپس کی تو جتّو کہنے لگے "بھئی تم نے یتھ میٹکس میں ایم۔ اے ناحق لیا۔ تم تو سائنس کے لئے ہو"۔

"تم تو جانتے ہو فیس معاف ہونے کی گنجائش اسی میں تھی۔ خیر میں بی۔ ایس۔ سی تو ہوں ہی اور مایکل فیراڈے تو اخبار بیچنے والا تھا اور کتنی بڑی بڑی ڈسکوریاں کیں اس نے"۔

جب عباس علی اپنی دونوں پیالیاں واپس کرنے آئے تو جتّو نے ان سے کہا "تمہارے ایل ٹی کے معاملے میں کیا ہوا"۔

"وہ تو تمہیں معلوم ہے کہ سب نظموں اور مضامین کی نقلیں اور والد نے جتنے سفارشی خط بھجوائے تھے وہ سب جمع کر کے رکھے ہیں۔ جنوری میں عرضی کے ساتھ منسلک کر دوں گا۔ ایک انسپکٹر پر کافی اثر پڑ چکا ہے۔ گذشتہ سال میں خود نہیں چاہتا تھا۔ آخر ایم۔ اے رہ جاتا۔ اس

سال انشاءاللہ خدا سے امید تو ہے۔"

ان لوگوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دروازے سے ایک نعرہ "صلوٰۃ" اور پھر "اللہم صل اللہ محمد و آل محمد" کی آواز سے پورا گھر ہل گیا۔ ایک عالم بڑا سا سیاہ عمامہ سر پر باندھے ہوئے تشریف لائے۔

سب مجلسی ایستادہ ہو گئے۔ کثر نے بڑھ بڑھ کر جناب کے ہاتھ چومے۔ نواب صاحب پھرتی سے جناب کی طرف بڑھے اور ان کے ہاتھ کو بوسہ دے کر انہیں اپنے ساتھ لے آئے وہ کرسی کے پاس دوزانو اس طرح بیٹھے کہ سب سے اونچے نظر آ رہے تھے۔

راغب زیدی نے جو سے کہا "مجھ سے سچی بات پوچھو تو میں جناب کو سننے کے لئے آیا تمہارے یہاں۔ کیا ماڈرن مجلس پڑھتے ہیں واہ۔"

تصدق نقوی نے کہا "بڑا سائنٹیفک دماغ ہے ان کا۔"

عباس علی اپنے خاص انداز میں یعنی آنکھیں بند کئے اور منہ کھولے ہوئے جناب کی طرف دیکھنے لگے۔

جناب اٹھ کر کرسی پر تشریف لائے۔ مجلس شروع ہوئی۔ جناب خوب پڑھے اور حاضرین مجلس پیسی ڈال کر خوب متاب ہوئے قریب گھنٹہ بھر تک مجلس ہوتی رہی۔ اس کے بعد سب لوگ رخصت ہوتے گئے۔

جب سب مردانہ جا چکا تو دالان کے پردے اٹھائے گئے۔ بیچ والی محراب کے پیچھے ایک کھٹولی پر گاؤ تکیہ سے لگی ہوئی پھوپھی اماں صاحب رکھی ہوئی نظر آئیں اور ان کے گالوں کی جھریوں میں ذرا اشک سا چمکے۔ نواب صاحب ان کے پاس آ گئے اور پلٹ کر جو کو دیکھتے ہوئے بولے "ادے یعنی پھوپھی اماں، کے لئے چاندی اور وہ خاص شیر مال جو انگلستان سے میں تیار کروا کے لایا تھا۔" پھر اکبر جہاں کو دیکھتے ہوئے بولے "اکبو بیٹی تم جا کے لے آؤ۔"

اکبر، قیصر اور انو ما ایک ہی پلنگ پر بیٹھیں تھیں۔ انو نے آنکھیں مٹکا کے کہا "آپ ہی

جائیے بڑی باجی۔ ہم لوگ جائیں گے تو چائے یخ ہو جائے گی بابا جان" قیصر نے منہ بسورا اور اکبر مسکراتی ہوئی اٹھیں۔ ہاتھ میں پائنچے سنبھالے ہوئے جبو کے پاس آئیں، اور شیرمالوں کے کونڈے میں سے ایک شیرمال پیالی پر رکھ کر پھوپھی اماں کے پاس لے گئیں۔

"یہ شیرمال" نواب صاحب نے کہا "الگ سے خستہ میں آپ کے لئے خاص کر کے بنوا کے لایا جائے میں بھیگتے ہی بالائی ہو جائے گی۔"

پھوپھی اماں نے اکبر جہاں کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے شیرمال کو مل کر چائے کی پیالی میں ڈال دیا۔ پھوپھی اماں نے چمچے سے چائے پینا شروع کی اور بولیں "واہ بابا جان۔ واہ۔ ماشاء اللہ سے خوب شیرمال ہے بابا جان۔"

گھر کے سب لوگوں کو ایک ایک پیالی چائے اور آدھی آدھی شیرمال دی گئی۔ دولہا بھائی نے شیرمال نہیں لی بلکہ اپنے نیکر کی جیب میں سے بسکٹ نکالا اور توڑ کر اپنی چائے کی پیالی میں ڈالا۔ چائے سب اس میں جذب ہو گئی اور وہ چمچے سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگے۔

پھوپھی اماں اپنی طرف ہو نچا دی جانے کے لئے بے قرار تھیں مگر نواب صاحب کی رائے تھی کہ علم درگاہ جائیں تو وہ اپنی طرف سدھاریں۔ دولہا بھائی بکتے ہوئے ڈولی بلانے لگے۔ اور جب انہوں نے آ کر کہا "ڈولی لے آیا" تو ان کی بیوی شہ نشین پر سے علموں کی جوڑی اتار کر لائیں۔ نواب صاحب نے پھوپی اماں کو سنبھال کر کھڑا کیا اور ان کے ہاتھوں میں علم دے دئے۔ سب لڑکیوں نے سامنے کھڑے ہو کر ایک ماتم پڑھا۔ ماتم ختم ہونے پر پھوپھی اماں نے علم جبو کو دے دئے۔ جبو ننگے پاؤں اور ننگے سر علم ہاتھوں میں لئے ڈیوڑھی کی طرف چلے اور سب عورتیں، ننگے پاؤں اور ننگے سر ماتم کرتی ہوئی ساتھ چلیں۔........

ڈیوڑھی میں ڈولی لگی ہوئی تھی۔ جبو کی والدہ اس میں بیٹھیں اور ایک کشتی میں علموں کی جوڑی لٹا کر اپنے سامنے رکھی۔ کہاروں نے آ کر ڈولی اٹھائی۔ جبو اور دولہا بھائی ڈولی کے ساتھ

ساتھ چلے اور درگاہِ حضرت عباس کی طرف روانہ ہو گئے۔

درگاہ پہونچ کر بیگم صاحب کو زنانی درگاہ میں اتروا دیا گیا۔ دولہا بھائی نہ معلوم کدھر غائب ہو گئے۔ جبّو نے مردانی درگاہ کا رُخ کیا۔ ایک دکان سے حاضریاں خرید کے درگاہ کے سامنے میدان میں بھیڑ بھاڑ میں سے نکلتے ہوئے یکّوں اور ڈولیوں میں سے جھانکتی ہوئی صورتوں کو حسرت سے دیکھتے ہوئے درگاہ کے صدر دروازے پر پہونچے۔ جھک کر چوکھٹ سے ہاتھ مس کیا اور ہاتھ کو بوسہ دیا اور اندر پہونچے۔ جوتے ہاتھ میں لے کر خاص دالان میں آئے اور ضریح کے سامنے کھڑے ہو کر زیارت پڑھی۔ شیرمال کی پڑیا جیب سے نکال کر مجاور کو دی اور اس سے نذر کی ہوئی حاضری واپس لی۔

وہ پلٹے تو دیکھتے کیا ہیں کہ راغب خاص علم کے سامنے بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ راغب نے ان کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ٹھہرو۔ یہ منتظر رہے۔ اتنے میں انکے شانے پر ایک ہاتھ پڑا اور یہ مڑ کر کیا دیکھتے ہیں کہ نقوی سامنے کھڑے ہیں۔

"تم کب آئے؟" نقوی نے کہا "میں نے تو آج چلہ باندھا ہے کہ میری ڈسکوری جلد از جلد کمپلیٹ (مکمل) ہو جائے تو سونے کے علم چڑھاؤں گا۔"

جبّو کو فوراً خیال آیا کہ وہ بھی ایک چلہ باندھ دیں چنانچہ حاضری کو جیب میں رکھ کر وہ علم کی طرف بڑھے۔ علم میں لٹکتے ہوئے سیکڑوں کلاووں میں سے ایک توڑ کر انہوں نے ہاتھ میں لیا اور دعا مانگی "یا جناب عباس۔ نرملا مجھ سے محبت کرنے لگے۔ میری ہو جائے۔ میں درگاہ میں شان سے حاضری کی مجلس کروں گا اور سونے کے علم چڑھاؤں گا" اور اپنے چہرہ پر دونوں ہاتھ پھیرے۔ پلٹ کر نقوی کی طرف آئے تو کیا دیکھا کہ عباس علی ان کے پاس کھڑے ہیں۔

راغب زیدی بھی وظیفہ ختم کرتے ہوئے ان کے پاس آئے اور یہ چاروں آدمی دالان سے نکل کر صحن میں آئے۔ یہاں حوض کے پاس پہونچ کر زیدی نے پوچھا "تم لوگ چل رہے ہو نا؟" عباس علی نے کہا "میں تو نہیں چل سکتا ابھی۔ ان بڑے میاں کو دیکھ رہا ہوں۔ نہ معلوم کہاں غائب ہو گئے۔

"بڑے میاں" نقوی بولے "چچا ابا نہیں کہتے۔ پیٹھ پیچھے یوں یاد کرتے ہو؟"
عباس علی کی باچھیں کھل گئیں اور آنکھیں بھیج گئیں۔ ان کو وہیں چھوڑ کر باقی تین حضرات
باہر آئے۔ سامنے مجمع میں کچھ بنی ٹھنی رنڈیاں نظر پڑیں۔ زیدی نے ان کی طرف سے اپنا منہ
پھیر لیا۔ نقوی نے گرہ کٹوں کی نظر سے انھیں دیکھا اور جگو نے بھی انہیں اپنی اس خاص نظر
سے دیکھا جس سے وہ ہر جوان عورت کو دیکھا کرتے تھے۔

نقوی کے دماغ میں عباس علی ہی گھوم رہے تھے۔ وہ بولے "ہم بھی نہ معلوم کیسی
قسمت لکھوا کر آئے تھے۔ یہ عباس ہی کو دیکھو۔ چپراسی کا لونڈا اور کیا قسمت ہے؟"

"میں بار بار کہہ چکا ہوں" زیدی بولے "یہ ان بڑے میاں کو صاف چرکا دے گا"
"جب دے گا تب دے گا۔ اب تو مزے ہیں۔ بالائی دار چائے۔ شیر مال، پراٹھے انڈے
دیکھتے نہیں ہو کتنا موٹا ہوتا جا رہا ہے؟"

جگو نے ایک آنکھ سے زیدی کو اور دوسری سے نقوی کو دیکھتے ہوئے پوچھا "تو کیا وہ
ان کی لڑکی سے شادی کا ارادہ نہیں رکھتا؟"

"تم نہیں سمجھتے" زیدی نے کہا "یہ چپراسی کے لونڈے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں تو کئی
ایسے دیکھ چکا ہوں۔ سب کے سب کہ ابلیشن (ارادہ) ایل۔ ٹی تھا اور سب ماسٹر ہونے سے
پہلے ہی صاف الگ ہو گئے"

"مگر میں کہتا ہوں" نقوی بولے "کہ ان بڑے میاں کے ایسے احمق ان لوگوں کو کہاں
سے مل جاتے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں ملتا"

"قسمت ہے" زیدی نے کہا۔

جگو گردن ڈال کر کچھ فکر میں پڑ گئے تھے۔ گردن سیدھی کرتے ہوئے بولے "میں عباس علی کو ایسا نہیں سمجھتا تھا
"ہاں یہی تو اس کی ہوشیاری ہے۔ تم ان بڑے میاں کے عزیز ہونا۔ تم کو وہ بھاپ
بھی نہیں دے گا کہ کیا کرنے والا ہے۔ بڑا عقلمند ہے۔ خیر خدا مالک ہے۔ وہ بیٹا ساتھ رہو تو

کی ماسٹری پر جو تر ڈگریں اور یہاں انٹرنیشنل فیم (بین الاقوامی شہرت) حاصل ہو گی ایک دن مولانا کے فیض سے۔"

اب یہ لوگ زنانی درگاہ کے دروازے پر پہونچ گئے۔ زیدی اور نقوی جبو سے رخصت ہونے لگے۔ نقوی نے کہا "ارے ہاں یہ تو بھول ہی گئے۔ تمہاری نرملا کا کیا حال ہے؟"

اس پر جبو عجیب کج ادائی سے کھل گئے اور سر داہنے شانے سے قریب جا ملا عجیب دھیمی، سریلی آواز میں بولے "کل رات سینما میں جائے پر اس نے بلایا تھا۔"

"اچھا تو اب گاڑھی چھنتی ہے۔ یار تم بھی قسمت والے ہو۔ ہیں کوئی نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتی۔"

"تم کو اکیلے کو بلایا؟" زیدی نے پوچھا۔

"ہاں میں اکیلا"، جبو نے گردن کو بالکل سیدھا کر کے کہا۔

"اچھا کیا کیا باتیں ہوئیں یار" نقوی نے پوچھا۔

"بس یہی ادھر ادھر کی" جبو کے چہرے کی مرثیت میں ایک عظمت کی جھلک آگئی۔

"واہ بھائی چوک گئے۔ اکیلے بلانے کے معنے کیا تھے؟"

اس وقت جبو کے کان میں دولہا بھائی کی آواز آئی "اماجبو نواب۔ چلو تمہیں یاروں سے فرصت نہیں!"

جبو نے پلٹ کر دیکھا تو ڈولی کے ساتھ دولہا بھائی آرہے تھے۔ بڑے غصے میں تھے اور کہہ رہے تھے "اونھ۔ یہ با تونے پن کی بھی کوئی عادت ہے۔ لو۔ جاؤ۔ ڈولی کے ساتھ۔ مجھے دس اور کام ہیں!"

جبو اپنے دوستوں کو سلام کرتے ہوئے ڈولی کے ساتھ ہو لئے۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے جو ڈینگ کی لی تھی اس پر وہ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی خوش تھے۔ انہیں ان دونوں سے خلوص اسی وجہ سے تھا کہ وہ دونوں ان کی نرملا کے بابت بنائی ہوئی باتوں پر پورا پورا یقین کر لینے کے پورے پورے اہل تھے۔

II

کہ مکتب میں گیا تھا قیس ......

(ا)

کالج کا گھنٹہ بجا اور نرملا لڑکیوں والے کمرے سے باہر آئی۔ آج اس کے چھریرے جسم پر سفید ساری اور سیاہ کرتی خاص طور پر جاذب نظر تھیں اس کا کتابی چہرہ، کچھ پھیلی اور نوک پر کچھ ٹیڑھی ناک۔ رم لیس چشمہ کے اندر بڑی بڑی آنکھیں جن میں کاجل پھیلا ہوا۔ کافی موٹے لپ اسٹک سے رنگے ہوئے ہونٹ سب پر ایک نئی آن نظر آتی تھی۔ اس کی پھرتیلی چال میں ایک خاص لہر تھی۔ وہ برآمدے میں چلی جا رہی تھی اور لڑکے اسے دیکھ دیکھ کر الگ الگ کھڑے ہو جاتے۔

وہ شعبۂ مشرقیہ سے گزری تو ایک پنڈت نری کا جوتا پہنے دھوتی باندھے ماتھے پر تلک اور سر پر پگڑی اپنے درجہ کے دروازے پر کھڑے نہایت بت پرستانہ انداز میں اسے گھورنے لگے۔ وہ ان کی قطع پر منہ پھیر کر مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ آگے کے ایک درجہ کے دروازے پر ایک گول داڑھی دار مولانا نے اسے غور سے دیکھا ضرور مگر منہ پھیر کر نہایت ریاکارانہ انداز میں لاحول ولا قوۃ کہتے ہوئے درجہ کے اندر ہو گئے۔ اس کے آگے برآمدے ہی میں ایک مقام پر ہمارے جو نواب حسرت کا مجسمہ بنے کھڑے تھے۔ کسی پُراسرار طاقت نے ان کی دونوں آنکھوں کی نظر کو نرملا کے چہرے پر جما دیا تھا اس نظر میں عشق کے جادو کی طاقت ضرور تھی کیونکہ نرملا کی نظر اس سے لڑی مگر اس کے جادو کی تاب نہ لا کر بلبلا کے الگ ہو گئی۔ اس کے بعد نرملا کی چال میں کچھ زیادہ پھرتی آ گئی۔

نکڑ پر ایک جگہ مصباح، مرزا اور منیر کھڑے تھے۔ نرملا جب ان کے پاس سے گزر گئی تو مصباح بولے "دیکھا تمہاری ہی طرف نگاہ تھی"

مرزا کے منہ سے ایک "دھی"، سے آواز نکل کر رہ گئی اور ان کے چہرہ پر بشاشت چھا گئی وہ منیر کی طرف مخاطب ہو کر بولے "آپ سن رہے ہیں منیر صاحب یہ مصباح صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟"

منیر صاحب جیب سے آئینہ اور کنگھا نکال کر اپنے بال درست کر رہے تھے، نہایت بے توجہی کے ساتھ بولے "ہاں ٹھیک تو ہے"

نرملا اور آگے بڑھی تو ایک جگہ پر عباس علی معہ اپنے ساتھی تقی رضا کے کھڑے تھے اس کو دیکھ کر بولے "روز جوڑا بدلتی ہے" تقی رضا کی سمجھ میں اس فقرے کی خوبی نہ آئی تو عباس علی داد سخن لینے کے لئے مرزا کے پاس آئے۔

"کیوں مرزا صاحب کیسی رہی۔ میں نے کہا روز جوڑا بدلتی ہے"

"واہ۔ واہ کیا بات کہی۔ آپ پورے شاعر ہیں"

عباس علی کی باچھیں کھل گئیں اور آنکھیں بند ہو گئیں اور عینک کا رخ مصباح صاحب کی طرف ہو گیا۔ مصباح نے کہا "اوں"، جیسے کہ فقروں کی اچھائی کے وہ قائل ہی نہیں تھے اور پھر منہ کو گول کرتے ہوئے بولے "اس سال تم ایل ٹی میں ضرور منتخب ہو جاؤ گے"

منیر کھل کھلا کے ہنسے۔ عباس علی اور مصباح دونوں سمجھے کہ ان ہی کی بات پر ہنس رہے ہیں۔

نرملا اب اپنے درجہ کے پاس پہونچ گئی۔ کمار اور عارف برآمدے ہی میں کھڑے تھے۔ ان دونوں کے پاس ہمارے جو نواب بھی پہنچ چکے تھے۔ نرملا کمار اور عارف کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرائی اور "ہلو" کہا اور جتو کی طرف سے منہ پھیر کر جاتے ہوئے رک کر عارف کی طرف رخ کر کے انگریزی میں بولی "آج مجھے اپنے بریڈلے کے اکسفورڈ لکچرز بھجوا دینا"

"اچھا۔ جیسے گھر ہو پہنچوں گا ویسے ہی" عارف نے انگریزی میں جواب دیا۔

اتنے میں سامنے سے ایک سانولے، پستہ قد، دبلے، کچھ گم گم سے صاحب بائیں ہاتھ میں ایک رجسٹر اور کچھ کتابیں دبائے آتے دکھائی دئے۔ جتنے لڑکے برآمدے میں کھڑے تھے سب درجہ کے اندر ہو گئے۔ جنو نواب لپکتے ہوئے بگٹٹ اپنے شعبۂ فارسی کی طرف آئے۔ کیوں کہ اپنے درجہ میں وہ ہی ایک واحد طالب علم تھے اس لئے ان کے پروفیسر انہیں اپنے کمرہ ہی میں پڑھا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ آکر کمرے کے اندر بیٹھ گئے اور اپنے پروفیسر کا انتظار کرتے ہوئے نرملا کا تصور باندھے بیٹھے رہے۔ قریب آدھ گھنٹہ گزر جانے پر پروفیسر صاحب تشریف لائے۔ بدن پر انگریزی سوٹ مگر سر پر ایرانی ٹوپی۔ کرسی پر بیٹھ کر میز کی دراز کا قفل کھولا۔ رجسٹر نکالا اور جنو کی حاضری بھر کر بولے "اچھا تو "اخلاق محسنی" پڑھنا ہے آپ کے پاس کتاب ہے؟"

جنو نے اپنے سر کو اتنا خم کیا کہ کندھے سے لگ جانے کو تھا۔

"بھئی کیا کہوں۔ بھول اس قدر بڑھ گئی ہے۔ کتاب میں نے نکال کر رکھی مگر آتے وقت بالکل بھول گیا"

"عالموں کی بھول تو مشہور ہے" جنو نے ٹکرا لگایا

پروفیسر صاحب کا گندمی چہرہ دمک گیا اور کچھ عالمانہ انکساری کا لہجہ بناتے ہوئے بولے "بھئی کیا کہوں اب مجھ سے پڑھایا بھی نہیں جاتا۔ ادھر کتاب اٹھائی اور ادھر آدھے سر میں درد ہونے لگا"

جنو نے اپنی داہنی آنکھ ان کے چہرے کی طرف موڑ کر بھر جیب کا لی

پروفیسر نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اپنی علم دوستی کی ایک حکایت سنائی۔ جنو بائیں آنکھ سے انہیں دیکھتے رہے۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب اپنی جیب سے گھڑی نکال کر بولے "اب کوئی چار منٹ رہ گئے ہیں۔ اب آپ جائیے"

جنو سیدھے شعبۂ انگریزی کی طرف آئے۔ یہاں درجہ جاری تھا۔ جو پروفیسر گھنٹے

کے شروع میں اس درجہ میں داخل ہوئے تھے۔ ناچ ناچ کے اور اشاروں سے ادا کر کر کے پڑھ رہے تھے۔ پورا درجہ محظوظ ہو رہا تھا۔ نرملا خاص طور پر کھلی جاتی تھی اور جبو باہر سے اس کے کھلے ہوئے چہرے کو محویت کے ساتھ دیکھتے رہے۔

گھنٹہ بجا، کمار اور عارف باہر آئے۔ جبو عارف کو الگ لے جا کے بولے "بھئی اس نے جو کتاب مانگی ہے وہ تم مجھے دینا میں پہونچا دوں گا۔"

"اچھا۔ یہ سوجھی اتنی دیر میں۔ اچھی سوجھی۔ مگر یہ تقریب کچھ تو بہر ملاقات کی کیا ضرورت آئیں؟ خیر تم میرے ساتھ ہی چلنا"

پھر یہ دونوں کمار کے پاس آ گئے۔ کمار نے کہا "بھئی مجوب آنا ضرور۔ نہ معلوم کتنی دفعہ ماما کہہ چکی ہیں"

"آؤں گا۔ ایک ہی آدھ دن میں"

اتنے میں ایک سہنی سے پروفیسر لچکتے ہوئے آتے دکھائی دئے۔ سب لڑکے درجہ میں ہو گئے۔ جبو باہر ہی کھڑے نرملا کو تکتے رہے۔ یہ پروفیسر ایسے لہجے میں بول رہے تھے کہ تمام درجہ پر ایک نیند کا عالم طاری ہو گیا۔ اس سناٹے نے جبو کو چونکا دیا اور انہیں اپنے درجہ کا خیال آیا۔ لنگوری چال چلتے ہوئے وہ اپنے شعبے کو واپس آئے۔ چک اٹھا کر دوسرے پروفیسر کے کمرے میں داخل ہوئے۔

"کیوں صاحب یہ اتنی دیر کہاں رہے؟" ان پروفیسر نے غصہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ذرا انگلش ڈپارٹمنٹ تک چلا گیا تھا"

"جی ہاں۔ اس نامعقول گدھے عارف کے پاس گئے ہوں گے۔ میں نے آپ سے کتنی دفعہ کہہ دیا ہے گا کہ آپ اس کے ساتھ نہ رہا کیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ کتنا ذلیل۔ کمینہ۔ بدتمیز وہ ہے گا اور آپ ہیں کہ ہر وقت اس کی دم میں گھسے ہوئے ہیں گے۔"

"وہ تو آپ کا مداح ہے"

"بس جانے دیجئے۔ ایسی مدح سے ہم باز آئے۔ یہ یہ باتیں اچھی ہیں اور یہ یہ بری ہیں ارے بھئی تعریف کرنا ہے تو تعریف کرو اور برا کہنا ہے تو برا کہو ...... خیر آپ 'شعرا' لائے؟"

جو کے چہرہ پر عجیب سکوت طاری ہوا۔

"اچھا۔ میں پڑھتا ہوں گا۔ آپ سنیئے"

کچھ دیر تک وہ فارسی کے شعر پڑھ پڑھ کر اردو میں معنے بتاتے رہے اور جو ایک آنکھ سے ان کو اور دوسری سے دیوار کو دیکھتے رہے۔ سنا انہوں نے شاید کچھ بھی نہیں کیونکہ ان کا دماغ اب تک انگریزی ڈیپارٹمنٹ ہی میں موجود نرملا کو تاک رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر صاحب بولے "آج کے لئے بہت کافی ہو گیا۔ جائیے چھٹی سیدھے گھر جائیے یہ ادھر اُدھر گشت غلط ہے گی۔"

جب کچھ جو سے کچھ لڑکھڑاتے انگریزی کی طرف آکر برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ نرملا کے چہرہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ آنکھیں کھولے ہوئے سو رہی ہے۔ وہ اُسے دیکھنے میں محو رہے یہاں تک کہ گھنٹہ بج گیا۔

کمار اور عارف ساتھ ساتھ باہر آئے۔ جو بھی ان کے ساتھ ہو لئے اور سب اس مقام پر آئے جہاں عارف کی موٹر کھڑی تھی۔

"یار ذرا ادھر سائنس کی طرف ہوتے چلنا۔ ہمیں کام ہے" کمار نے کہا۔

عارف نے موٹر اسٹارٹ کی اور سائنس کالج کی طرف چلا۔ کمار بولا "یہ سائنس پڑھے ہوئے لوگ بالکل نانسنس ہوتے ہیں۔ ان کے کامن سنس ہوتا ہی نہیں"

"آئیں ارے یہ کیا کلیہ قائم کر رہا ہے۔ آئیں"

"میں تجھ سے سچ کہتا ہوں۔ یہ جنرل رول تو ہمیشہ صحیح پائے گا۔ ابھی دکھا دونگا تجھے"

جو پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے یہ باتیں سُن رہے تھے۔ ان کے لئے کامن سنس محض ایک لفظ تھا جس کے معنے تو عام عقل تھے مگر جس کے مفہوم کا ان کے ذہن میں کوئی تصور نہ تھا۔ ان کے

حساب عارف اور کمار کی گفتگو ہمیشہ بے معنے گفتگو ہوا کرتی تھی۔

سائنس کالج پہونچ کر جو کو موٹر ہی میں چھوڑ کر عارف اور کمار ایک لیبوریٹری کے پاس گئے۔ برآمدے میں ایک صاحب کو بلایا۔ اُن سے کمار نے کہا "بھائی ہم بنارس گئے تھے وہاں سے تمہارے بھائی نے ایک بڑا پلندہ تمہیں بھیجا ہے۔"

وہ صاحب بولے "کہاں ہے وہ یہاں لائے ہو"

کمار نے عارف کو دیکھ کر کہا "دیکھا اب اس جملے کو سمجھو اور ہمارے کلیہ کو یاد کرو اور پھر ان صاحب کی طرف رخ کر کے کہا "صاحب بڑا پلندہ ہے۔ آپ آ کر میرے گھر سے لیجائیے"

وہ صاحب "اچھا" کہہ کر لیبوریٹری میں واپس گئے اور کمار اور عارف باہر آئے۔ کمار کہنے لگا "کہو کیسے بڑے کامن سنس کی بات کہی ان صاحب نے۔"

"ان کا یہاں لائے ہو کہنا تیرے کلیہ کو ثابت کرتا ہے۔ مگر کلیہ ایک مثال پر نہیں بنانا چاہیے"

"خیر تم دیکھتے جاؤ۔ جتنے بھی سائنس داں ملیں گے سب کو اسی کی روشنی میں اسٹڈی کرنا"

"بات تو کچھ سچی ہی معلوم ہوتی ہے۔ خیر میں غور کروں گا۔"

وہ دونوں موٹر کے پاس آگئے۔ اس میں بیٹھے ہوئے جو کو دیکھ کر کمار نے کہا "اما یہ تو پہونچ گیا شاید؟ اور" منہ کھلا ہی رہ گیا"

"وہ نہیں پینک میں ہے شاید"

"کیا افیم کھاتا ہے یہ بھی؟"

"یہ قوم ہی افیمی ہے چاہے افیم کھائے یا نہ کھائے۔ افیونیت کے سب صفات اس کے خون میں ہیں"

موٹر چلی تو جو چونکے۔ کمار نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا "اما اونگھ گئے تھے"

"ہاں کچھ" جو نے کہا "یار حقے کی طلب"

"بات ایک ہی ہے حقہ تمباکو۔ افیم۔ نشے سب ہیں شل کرنے والے" عارف نے کار تیز کرتے ہوئے کہا۔

ایک چوراہا پڑا جس پر تمار اتر گیا۔ جبو آکر عارف کے پاس آگے بیٹھ گئے۔

"تمہاری محبت میں ایک نیا ڈولپمنٹ (ارتقار) ہوا ہے یار"

"کیوں!"

"اب تک تمہاری محبت بالکل افیونیوں کی سی یعنی پیسیو۔ پسیو PASSIVE تھی۔ یہ درجاناں تک رسائی کی خواہش۔ کیا یہ نئی بات نہیں۔ اب قدم آگے بڑھتے دکھائی دے رہے ہیں"

"جو کچھ بھی ہو"

"اب تک بس دیکھ کے جی خوش کر لینا ہی تمہاری محبت کا حاصل تھا بقول میر ع

ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔ آج کتاب دینے جاؤ گے۔ وہ ملے گی۔ کچھ نہ کچھ بات چیت ہوگی۔ ع نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے"

عارف کا گھر آگیا۔ اس نے اپنے کمرے میں جا کر کتاب نکالی اور جبو کو دی۔ وہ بلاکش محبت کوئے یار کی طرف چلے گئے۔

عارف اپنے گھر کے اندر داخل ہوا۔ باورچی خانہ کی طرف رخ کرتے ہی بولا "ارے بھابی۔ یہ آج تم پکا رہی ہو اور للاڈو کہاں گئی؟"

"وہ اپنے میاں سے جھگڑنے گئی ہے؟"

عارف باورچی خانے کے اندر پہونچ گیا اور بولا "آئیں! اس کے کوئی میاں بھی ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اس کے محض ایک لڑکا ہی لڑکا ہے"

"بغیر میاں کے لڑکا کہاں سے آیا؟"

"وہ پیٹ میں لڑکا لئے ہوئے ہی پیدا ہوئی ہو۔ کیا معلوم؟"

"یہ کیسے؟"

"بہت سے بچے بغیر میاں کے ہو جاتے ہیں۔ ارے یوں ہی ہوتا ہوگا۔ قدرت ہے خدا کی"

"ہٹو ایسی داہیات باتیں نہ بکا کرو"

"داہیات کیا اگر تمہاری بھائی جان سے شادی نہ بھی ہوتی تب بھی ہر سال تمہارے یہاں بچے ہوتے چلے ہی جاتے"

"چپ بیہودے۔ اچھا چل کھانے کے کمرے میں۔ میں کھانا بھجواتی ہوں"

"ہرگز نہیں۔ ہم چپ نہیں رہ سکتے اور کھانے کو آج ہم یہیں کھائیں گے۔ روز لاڈ و پکاتی تھی ہم کمرے میں تمہارے ساتھ کھاتے تھے۔ آج تم پکا رہی ہو اس لئے ہم یہیں چولہے کے پاس کھائیں گے" اور وہ ایک پٹری پر بیٹھ گیا۔ اپنے ہاتھ سے رکابیاں اٹھائیں انگاروں پر لگی ہوئی پتیلیوں میں سے سالن، دال، ترکاری وغیرہ نکال کر ان پتیلیوں ہی پر رکابیوں کو رکھتا گیا اور بولا "اچھا یہ توے کی روٹی جلدی اتارو۔ ہم گرم گرم کھائیں گے"

بھابی نے اس کی طرف ناز کے ساتھ کن آنکھیوں سے دیکھتے ہوئے روٹی توے پر پلٹی۔ عارف بولا "کیا قیامت کی سڈول اور مہین روٹیاں پکاتی ہو بھابی۔ ہائے اسی سے تو میں کہتا ہوں کہ بھائی جان کی اور شادی کرا دو اور تم مجھ سے شادی کر لو"

"تو کیا تمہارے لئے روٹیاں پکانے کے لئے روز"

"نہیں۔ یہ تو ایک بات ہے۔ ارے تمہاری کون سی بات بے مثل نہیں" اور اس نے اپنی نظر بھابی کے چہرہ پر جما دی۔ بھابی کی شکل نہایت معمولی تھی بلکہ بھدی کہی جاتی تھی اور منہ پر چیچک کے داغوں کی وجہ سے ان کا شمار بدشکلوں ہی میں کیا جاتا تھا مگر عارف کو سچ مچ ان کی ہر ادا پسند تھی۔ اس نے کہا "اچھا تو بھابی۔ آپ ہمیشہ مذاق ہی میں لے جاتی ہیں بالکل خلوص۔ بالکل سنجیدگی سے پوچھتا ہوں کہ آپ مجھ سے شادی کب کریں گی"

"پھر وہی بدتمیزی؟"

"بدتمیزی؟ آخر آپ ہی تو کہا کرتی ہیں کہ شادی نہیں کروگے تو کیا کبڈے رہو گے"۔

"شادی تم کرو ضرور اور میری چھوٹی بہن سے"۔

"آپ کی اماں جان سے نہ کر لوں۔ آخر وہ بھی تو بے میاں کی ہیں"۔

یہ سنتے ہی بھابھی نے جو چپاتی توے پر ڈال رہی تھیں اُسے عارف کے منہ پر مار دیا اور کہا

"بدمعاش کہیں کا۔ یہ کیا حماقت کی بات"

"اُف فوہ۔ یہ کیا" کہکر عارف چونک پڑا۔ اس کے داہنے گال پر آٹا بھر گیا تھا۔ وہ اُٹھا اور منہ قریب لگے ہوئے بمبے سے دھو کر پھر آ بیٹھا اور کھانا کھانے لگا۔ بھابھی کچھ تیوری پر بل ڈالے بیٹھی تھیں۔ وہ انہیں غور سے دیکھنے لگا اور اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ مسکرا دیں۔ عارف بھی مسکرا کر بولا "بھابھی تم جب کبھی بھی مجھے مار بیٹھتی ہو تو معلوم ہوتا ہے جیسے ایک نہایت نازک پھول آکر لگ گیا۔ اور بھابھی یہ بھی انداز معشوقانہ ہے کہ تم ہمیشہ اپنی غلطی پر مجھے مارتی ہو"۔

"میری غلطی؟"

"اور کیا۔ اس وقت حماقت میری تھی یا آپ کی ہیں عاشق آپ پر ہوں یا آپ کے خاندان بھر پر۔ میں آپ کے ساتھ شادی کرنے کو کہتا ہوں، آپ کہتی ہیں میری بہن سے کر لو جیسے کہ آپکے گھر کی ہر عورت سے مجھے عشق ہے۔ یہ حماقت نہیں"۔

"میری بہن مجھ سے اچھی ہے"۔

"پھر حماقت کی بات۔ اگر لیلیٰ مجنوں سے کہتی کہ میری بہن مجھ سے اچھی ہے تو یہ لیلیٰ کی حماقت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ ارے میری احمق لیلیٰ تجھ سے اچھا کائنات میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا فارسی کا مصرع ہے مگر تم کیا سمجھو گی مطلب یہ ہے کہ تمہاری تصویر بنانے کے بعد خدا نے قلم اٹھانا ہی چھوڑ دیا"۔

"یہ مصرعوں شعروں کی حماقت زدہ باتیں مجھکو نہیں بھاتیں۔ یہی دیکھو کہ میں تو کچھ بھی نہیں پڑھی ہوں اور وہ اب کی انٹرینس کا امتحان دے گی"۔

"یہ تو خرابی ہے بھابھی۔ یہ گھر میں پڑھوا کے پرائیویٹ پاس کرانا کہ گلے میں سرٹیفکیٹ کا تمغہ لٹک جائے سراسر حماقت ہے۔ اس سے تم جاہل اچھی جو بغیر ہجے لگائے ہوئے رواں نہیں پڑھ سکتیں۔"

"تمہاری تو کھوپڑی اوندھی ہے"

"نہیں میری کھوپڑی بالکل سیدھی ہے نہیں تو تم پر عاشق نہ ہوتا۔"

"اونھ بنتے ہیں۔ بن نہیں آتا۔ بڑے عاشق کی دم بنے ہیں۔ جو میں کہتی ہوں وہ کریگے نہیں"

"اف۔ فوہ۔ کیا زبردستی ہے! ..... اچھا لیجئے۔ میرا پیٹ بھر گیا میں اب جاتا ہوں"

عارف نے آکر ہاتھ منہ دھوئے۔ برآمدے میں آکر پاندان سے پان نگا کر کھایا اور باہر آکر اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹ کر پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے کان میں پیر کی چاپ سنائی دی۔ اس نے منہ اٹھایا تو کیا دیکھا کہ جھو ڈگمگاتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے مرثیت زدہ چہرہ پر مصائب کا گہرا رنگ نمایاں دکھائی دیا۔ عارف نے چونک کر پوچھا۔

"اما۔ کیا ہوا؟ پٹ گئے۔ یار عشق میں یہی ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ ہمارے منہ پر بھی ایک طمانچہ پڑا سب منہ پر آنتا بھر گیا۔"

"نہیں..... مگر....." جھو ہانپتے ہوئے کہنے ہی کو تھے کہ عارف نے آواز دی "ابے پیرو وہاں حقہ کیا گڑگڑا رہا ہے۔ یہاں لے آ اپنا حقہ جلدی اور جھو سے کہا "تم یہاں آرام کرسی پر بیٹھو۔ دم لو حقہ آتا ہے دم لگاؤ پھر اپنا پٹ جانے کا قصہ بیان کرنا"

جھو آرام کرسی میں لیٹ گئے۔ عارف نے کتاب سرہانے رکھ کر ان کی طرف کروٹ لی۔ اور کہا "اب کہو کیا گزری"

جھو نے ٹھنڈی سانس بھر کر نہایت غمگین لہجے میں اپنی مصیبت کے واقعہ کو یوں بیان کیا "میں پہونچا گھنٹی دبائی۔ نوکر باہر آیا میں نے کہا کہدو علاؤ الدین صاحب کے یہاں سے ایک صاحب کتاب لے کر آئے ہیں۔ نوکر اندر چلا گیا۔ پھر آیا تو بولا کہ مس بابا نے کہا ہے کہ کتاب دیدیجئے میں نے

کتاب دیدی اور چلا آیا"

"واہ- واہ- واہ- کیا زبردست- کیا حسین کیا لطیف واقعہ ہے- اس کو اگر رقم کر دیا جائے تو زندگی کا اہم ترین واقعہ ٹھہرائیں اسے سچے نقّاد- مگر نہیں ہر ایک اس بات کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ ہم ہی سمجھ سکتے ہیں- بڑا گہرا واقعہ ہوا ہے- تمہاری قومیت اور تمہاری انفرادیت پورے طور پر نمایاں ہو جاتی ہیں اس سے"

ہیرو حقہ لے کر آیا اور جبّو نے حقہ منہ میں دباتے ہوئے کہا "تم بھی مجھے بنانے لگے"

"نہیں- میرے ہیرو تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو- تم نے سچ مچ ہیروؤں کی سی بات کی ہے- جو ہمارے اس شہر لکھنو کا ہی فرد کر سکتا ہے اور یہاں کا بھی ہر ایک نہیں صرف تمہارا ایسا یا یوں کہو تم ہی کر سکتے ہو- سمجھو- اگر کوئی معمولی آدمی ہوتا تو نرملا کے نوکر سے کہتا کہ اپنی مس بابا سے کہو کہ آپ کے کالج کے ایک صاحب آئے ہیں- نوکر بھی رعب کھاتا اور نرملا بھی یہ دیکھنے کے لئے کہ کون ہے باہر ضرور آتی اور پھر وہ صاحب سلامت کرتا- ایک آدھ تمہید یہ بات کہہ کر کتاب دیتا اور شکریہ لیتا اور آئندہ خدمت کرنے کا وعدہ کرتا ہوا واپس ہوتا- تو بھی رستہ کھل جاتا- یہ معمولی- عام- عامیانہ انسان کرتا- مگر تم ہو ہیرو- لکھنوی زندگی کے ہیرو- اس زندگی کے جدید ترین ہیرو جو اپنی جگہ پر مکمل طور پر ایک شاعری کے لئے موزوں زندگی ہے اور تمہاری اور تمہارے شہر کی زندگی کی ایک صفت سے یہ واقعہ کس قدر ہم آہنگ ہے کیا بتاؤں"

"تم لگے پھر فلسفی بننے؟"

"فلسفہ ولسفہ نہیں- افسوس ہم نہ ہوئے نرملا کے نوکر کی جگہ پر تو تمہاری وضع قطع سے تمہارے حسرت زدہ چہرے سے اور تمہارے منکسرانہ انداز میں یہ کہنے سے کہ عارف صاحب کے یہاں سے ایک صاحب کتاب لے کر آئے ہیں، اچھل پڑتے- تمہاری دل کی لگی تک فوراً پہنچ جاتے اور گھر کے اندر سے نرملا کو بازو پکڑے ہوئے دوڑاتے لاتے اور تم سے کہتے لو یہ تمہاری

لونڈی ہے جو جی چاہے کرو۔ مگر وہ گدھا دیہاتی کا پٹھا تمہاری ہیرو ازم کو سمجھنے کے لئے کہاں سے آنکھیں لاتا۔ کہاں سے ذہن لاتا۔ وہ یہ سمجھا کہ تم میرے بھائی کے کوئی کارندے ہو یہی کچھ اس نے نرملا سے بھی جا کے ہینٹ دیا ہوگا۔ بس اس نے کہا کہ کتاب لے لے اور تمہیں چلتا کرے۔ ہائے ہائے ع۔ پرساں کوئی کب گوہر ذاتی کا ہے"

"تمہارے الفاظ کچھ عجیب ہوتے ہیں۔ تم مجھے چاہتے ہو مجھ سے ہمدردی رکھتے ہو مگر تمہارے الفاظ مجھے طنز میں ڈوبے ہوئے محسوس ہوتے ہیں"

"طنز۔ نہیں بالکل حقیقت۔ فیکٹ۔ پیور فیکٹ"

"جانے دو۔ اب بتاؤ۔ میں کیا کروں"

"وہی جو تم ایسے ہیرو کو کرنا چاہئے۔ تمہارے دل کو جو تکلیف اس وقت پہونچی ہے وہ محسوس ہر معمولی شخص کر سکتا ہے بلکہ میں بھی محسوس کر سکتا ہوں جو معمولی سے بہت نیچے درجہ کا ہیرو کے بالکل خلاف درجہ کا فرد ہوں۔ مگر اس کو برداشت ایک ہیرو ہی کر سکتا ہے اور برداشت کرتے ہوئے ثابت قدم رہے یہ تم ہی کر سکتے ہو۔ لہذا ہیرو کی طرح اس کرب کو برداشت کرتے ہوئے جھومتے ڈگمگاتے مگر اپنے اٹل قوت ارادہ کا تاثر دینا کے دماغ پر ثبت کرتے ہوئے گھر واپس جاؤ"

"تم میرے لئے کچھ نہ کرو گے"

"میں کیا کروں تمہارے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں"

"تم نہیں چاہتے کہ میرے اس سے تعلقات بڑھیں" اور جبو نے حقہ کا ایک گہرا دم لیا۔

"واہ۔ واہ یار آج تم اسٹروک پر اسٹروک لگائے جا رہے ہو ہیرو ازم کے۔ یہ بھی بڑی اونچی بات کہی تم نے۔ تمہاری زندگی کی ایک نظم میں میری حیثیت ویسی ہی ہے جیسے ہیرو کے ساتھ اس کے زیچ دنوکر، کی ہوتی ہے۔ جو ہر بات میں ہیرو کا تابعدار ہوتا ہے۔ میرے لئے یہی بجا ہے کہ جو آپ کی ہیرو ازم کا تقاضہ ہو اسی کے موافق آپ کو رائے دوں اور واہ واہ کہتا ہوں۔

آپ کی محبت کا جوہر بے چون و چرا برداشت میں کھلتا ہے۔ بس آپ ع

بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

اور یہ ملنے جلنے کی کوشش آپ کے عشق کی ذلت ہے۔ تم ملا ملے گی حسین، رنگیلے، پیسے والے جوانوں سے جیسے کہ پرمانک ہے۔ کمار جیسوں کو بھی ان کی قابلیت کی شہرت اور ان سے وابستہ بڑی امیدوں کی وجہ سے کچھ لفٹ دے دے گی۔ مگر آپ کو اگر آپ اس کے گھر کے برآمدے میں کھڑے ہوں تو وہ جھانک کے دیکھے گی اور نوکر سے کہلوا دے گی کتاب لے لو اور چلتا کرو۔ چنانچہ جو آپ نے کیا خوب کیا۔ حالانکہ یہ جو کچھ آپ نے کیا اس سے آپ نے اپنی ہیرو ازم کو ذلیل کیا۔ خیر اب بہتر یہ ہے کہ آپ اس واقعہ سے سبق لیں۔ اور آئندہ اپنی پاک اور بے لوث محبت کو اس نئے ذلیل درجہ کی طرف ارتقا کرنے سے روکیں"

جو نواب خاموش رہے۔ حقے کے دم پر دم لگاتے رہے۔ عارف کی نگاہ ان کی ناک پر پڑ رہی تھی۔ وہ ان کی ناک کی عجیب اور غریب ساخت پر غور کرنے لگا۔ اس ناک کا بانسا بہت زیادہ اونچا تھا اور اس میں نتھنوں کے چھید بالکل تھے ہی نہیں جیسے کہ کسی نے ان کو ایک دو مرے پر چپکا دیا تھا۔ شاید ان میں سانس آنے جانے بھر ہی کی جھری چھوڑی گئی تھی کیونکہ حقے کے دموں کا دھواں تو ناک سے باہر آتا معلوم ہو رہا تھا۔ مگر بھی ان کی ناک ضرور غیر معمولی اور ان کی ہیرو ازم سے ہم آہنگ ضرور۔

"اچھا بھائی جبو" عارف نے کہا "ہم تمہارے بیچ ہیں یعنی منجملہ اور سب باتوں کے تمہارے رازداں بھی ہیں تو تم ہمیں یہ بتاؤ کہ یہ تعلقات بڑھانے کی خواہش جو اب تک تمہارے دل میں نہیں تھی یہ اب کیسے آگئی۔ حالانکہ یہ خواہش بھی اسی درجہ نزاکت کی ہے جو لکھنوی شاعری کے اس مثالی شعر میں ادا ہوئی ہے۔ ؎

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا — ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

مگر یہ خواہش کب سے دل میں آئی"

"نئی ؟ خواہش ہمیشہ سے تھی۔ مگر ہاں جس دن کنووکیشن ہوا نہیں تھا۔ تم نے سینما میں چلنے دی تھی۔ اسی رات بلکہ صبح ہوتے وقت میں نے سوچا کہ میں ہمیشہ عشق میں ناکامیاب رہا اور پھر اس نتیجہ پر پہونچا کہ میں نے کبھی قدم آگے نہیں بڑھایا۔"

"اچھا تو کنووکیشن میں ڈگری پانے کا یہ اثر ہوا۔ واللہ یار۔ میں سمجھتا تھا کہ کنووکیشن محض فضول کی رسم ہے، بالکل بے معنے مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض رسم بھی انسانی فطرت کے ارتقا میں ممد ہو سکتی ہے۔ واہ یہ تبدیلی تمہاری ہی قوم اور تمہاری ہی فطرت کے انسان میں آسکتی ہے۔ دوسرے شخص میں تبدیلی پیدا ہوتی تو دوران تعلیم میں کسی خاص تجربہ سے متاثر ہو کر یا بی۔ اے کرنے کے بعد کسی خاص فکر کے ماتحت کنووکیشن کے دن محض ایک گون پہن کر ایک کاغذ ہاتھ میں لے لینے سے یہ عزم دل میں آجاتا یہ بھی تمہاری ہیروازم سے ہم آہنگ ہے۔ تمہاری ہیروازم بڑی گہری چیز ہے کوئی اور نہیں سمجھ سکتا اسے سوائے ہمارے۔"

"میں تم کو اپنا سب سے بڑا مخلص دوست سمجھتا ہوں اور ع

تم جو چاہو تو مرے درد کا درماں ہو جائے

"مجھے تم سے کامل خلوص ہے۔ مگر تمہارے درد کا درماں کیا ہے۔ کیا ہو سکتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بس درد کا حاصل درد ہی سمجھ میں آتا ہے۔"

"کیوں ؟"

"ارے تم سے اس سے کیا مناسبت ہے۔ تم کو اس سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ تمہاری شکل دیکھ کر یا تمہارا ذکر بھی جب آتا ہے تو وہ ہنستی ہے۔ وہ فلرٹ ہے تم مستقل ہیرو۔ اس کی ماں کی ہدایت اور اس کا خود کا مقصد حیات کسی بڑے اسامی کو جیسے پرمانک کو پھانس لینا ہے اور تمہارے پاس مادی بڑائی کا بالکل فقدان ہے محض روحانی بڑائی ہے جس کی عظمت کا سکہ میرے دل پر تو ہے مگر نرملا اس سے چھو کر بھی نہیں گزر سکتی۔ پھر تم سن رسیدہ۔ بھائی جان کے ساتھیوں میں ہو تم۔ مجھ سے پندرہ نہیں تو کم از کم بارہ برس تو ضرور بڑے ہو۔ اگر تمہارے سب بچے جیتے

رہتے تو چھ سات بچوں کے باپ ضرور ہوتے۔ تم اپنی کاہل ہیرو ازم کی وجہ سے اب بی۔اے ہوئے میرے ساتھ۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ اپنے عشق ہی کو عشق کا حاصل سمجھو۔ محبت برائے محبت۔ اس کے سوا اور میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

"اور کمار کو جو تم نے ملا دیا اس سے"

"کمار سے وہ خود ملنا چاہتی تھی۔ آخر وہ بی۔اے میں فرسٹ تھا اور تم ملا اس سے پڑھنے کے سلسلہ میں مدد لینا چاہتی ہے۔ اگر اسے فیل ہو ہو کر ڈٹے رہنے میں یعنی ہیرو ازم میں دلچسپی ہوتی تو شاید وہ تم سے ملنا بھی پسند کرتی۔"

"تو تم مجھے اس سے نہیں ملاؤ گے"

"اف فوہ۔ اب تمہاری ہیرو ازم تکلیف دہ مدارج پر آ رہی ہے۔ بات سمجھو یار"

"اچھا میں جاتا ہوں۔ یہ حقہ بھی جل گیا۔"

عارف چت لیٹ گیا اور کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا اور جیو نواب چلے آئے۔

جو نواب کو ہمیشہ کی طرح آج بھی عارف کی باتوں کا عجیب مبہم سا احساس تھا۔ مگر عارف ہی ایک شخص تھا جو انہیں ہیرو سمجھتا تھا ورنہ اور سب لوگ تو انہیں ایڈیٹ کہا کرتے تھے سچی بات یہ تھی کہ عارف کی نظریں عام نظروں سے زیادہ تیز تھیں اسی لئے وہ جو کی فطرت میں وہ ہیرو ازم دیکھتا تھا جو عام نظروں سے پنہاں تھی۔ ہر ہیرو کی طرح ان کی فطرت سے بھی بعید تھا کہ وہ اپنی حقیقت کو سمجھیں اور اپنی کمزوری کا احساس کریں اور ہر ہیرو کی طرح انہیں اپنی رائے اور اپنی خواہش کے سامنے کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ اپنے تئیں ایک خود فریبی کی دنیا میں گم رکھنا ہی تو ہر ہیرو کی طرح ان کا مسلک تھا۔ لہذا عارف کی رائے سے بریت کا عزم کرتے ہوتے وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

کافی دور چل کر ریل کے پھاٹک کے پاس پہونچے اس کے نیچے ہو کر داہنے کو جو بڑی لمبی اور اونچی چڑھائی پڑتی تھی اس کی طرف بڑھے تو کیا دیکھا کہ منیر کی موٹر کو پیچھے سے مرزا اور مصباح

دھکیل رہے ہیں۔

مرزا اور مصباح دونوں ایک آواز میں کہہ رہے تھے "بھئی رو کو۔ ہم اب تھک گئے"۔ پھر دونوں موٹر چھوڑ کر کھڑے ہوگئے اور پلٹ کر جبو کو دیکھا۔

مرزا نے آواز دی "آئیے۔ آئیے محبوب صاحب۔ آپ ہی کی کسر تھی"۔

منیر بھی موٹر میں سے اتر کر باہر آئے۔ ان کے چہرے پر بھی پسینہ تھا اور ان کے نفیس پیج کے پتلون کا داہنا پائنچا صاف پھٹا ہو دکھائی دے رہا تھا۔

جبو نے پاس پہونچ کر پائنچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ کیا ہوا منیر میاں"۔

مرزا مسکرا کر بولے "یہ سب ان موٹر صاحبہ کی عنایات ہیں"۔

"عذاب ہے" مصباح بولے۔

منیر کے خوب صورت چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور سفید گورے گورے گال سرخ ہوگئے تھے۔ وہ جبو سے بولے "بھئی جبو تم بھی دھکلوا لو"۔

جبو نے کہا "دھکیلیں چڑھائی پر" اور پھر کچھ ڈگمگا کر بولے "ادھر ڈھال ہے الٹا دھکیلیں۔ الٹی جلدی اسٹارٹ ہو جاتی ہے"۔

"خوب۔ نہ ہوا عارف اس وقت نہیں تو کہتا کہ تمہاری یہ بات ماسٹر اسٹروک آف جینیس ہے" یہ کہکر منیر مسکرائے

"دھکینگ کا سالہ ہے"، مصباح بولے۔

"کچھ ہو بات تعریف کے قابل بتائی" مرزا بولے

غرض تینوں آدمیوں نے ملکر کار کو پیچھے ڈھال پر دوڑایا۔ ڈھال کے ختم تک پہونچتے ہی موٹر بھک بولی اور پھر بھک بھکا کر اسٹارٹ ہوگئی۔ یہ تینوں آدمی اس میں بیٹھ گئے۔ موٹر چڑھائی پر چڑھی چلی گئی مگر چڑھائی کے ختم پر موڑ تھا اور دوسری طرف سے ایک اور موٹر آرہی تھی۔ منیر اب تک پہلے گیر پر موٹر کو لا رہا تھا اب دوسرا گیر جو ڈالا تو گاڑی بھک سے کر کے

بند ہو گئی۔

"یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے" منیر نے کہا۔

مرزا نے کہا "کھی کھی۔ پھر ڈھکیلی جائے!"

"اونھ ہیں" مصباح نے کہا

"اب شاید ہینڈل سے اسٹارٹ ہو جائے" کہہ کر منیر اترا اور دیر تک ہینڈل لگاتا رہا مگر گاڑی نہ اسٹارٹ ہونا تھی نہ ہوئی۔ آخر پسینہ پوچھتا ہوا پھر اسٹرنگ پر آ کر بیٹھ گیا اور بولا "یار دھکیلنا ہی پڑے گی"

مصباح اتر کر بکٹٹ چل دئے۔ جگو اور مرزا نے پھر گاڑی دھکیلی مصباح لمبے ڈگ رکھتے ہوئے سامنے ایک گلی میں ہو لئے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور چڑھائی کو پار کر کے کوئی سو قدم آگے پہونچی تب جگو اور مرزا اس میں بیٹھے۔ یہاں سے بخیر و عافیت وہ منیر کے گھر پہونچی۔ منیر اتر کر اپنے گھر کے اندر چلے گئے۔ مرزا اور جگو کوٹھے پر چڑھ گئے۔ اس کوٹھے پر دو کمرے تھے ایک میں مرزا اور دوسرے میں مصباح رہا کرتے تھے۔ مرزا اپنے کمرے میں آئے شیروانی اتار کر ٹانگی۔ ایک کونے میں میز پر رکھا ہوا اسٹو جلایا اور اس پر پتیلی میں پانی رکھا۔ پھر لوٹا اٹھا کر وہ پاخانے چلے گئے۔ جگو ان کے پلنگ کی چوڑان پر پیر لٹکائے ہوئے لیٹ گئے اور تکیہ دیوار سے لگا کر اس پر سر ٹکایا۔

مرزا پاخانے سے واپس آئے اور جگو کو سکوت کے عالم میں دیکھ کر بولے "آنکھیں تو کھلی رہ گئیں پر مر گئی بکری"

جگو چونک پڑے۔ مرزا بولے "ہونھ۔ یہ بھی کیا خبط ہے آپ کو۔ وہ ہیں کہ اوروں کے ساتھ پھرتی ہیں اور آپ ہیں کہ مرے جاتے ہیں۔ عشق دونوں طرف سے ہوتا ہے"

یہ بات مرزا نہ معلوم کتنے سو مرتبہ کہہ چکے تھے اور کبھی جگو کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ مرزا چائے کی کشتی ٹھیک کرنے لگے۔ چولھے پر سے پتیلی اتار کر کیتلی میں پانی ڈالا۔ اور کشتی

کو کمرے کے بیچ میں رکھی ہوئی ایک میز پر رکھ دیا۔ اتنے میں زینہ پر کسی کے آنے کی چاپ سنائی دی اور پھر مصباح الگنائی میں دکھائی دئے۔ وہ مرزا کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے "اونھ میں اب کبھی اس کے موٹر پر نہ جاؤں گا۔ اس سے کوئی پوچھے کہ عقلمند آدمی یہ ایسا ٹھیلا موٹر لینے کی کیا ضرورت تھی" اور وہ ایک کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔

اس وقت ایک کمسن گورا گورا لڑکا بغل میں کتابیں دبائے ہوئے اندر آیا۔ مرزا اس کو دیکھ کر خاص انداز میں کھل گئے۔ وہ بھی ایک اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ سب لوگ چائے پینے لگے جبو بھی پلنگ سے اٹھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے تھے اور چائے کی چسکی لگانے لگے۔

چائے کے بعد مصباح اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مرزا اپنے پلنگ پر آ کر لیٹے اور ان کی نگاہ اپنے شاگرد پر جم گئی۔ جبو اگر ہیر دنہ ہوتے تو انہیں احساس ہوتا کہ وہ اب اس کمرے میں مداخل تھے۔ وہ کرسی پر ڈٹے رہے تو مرزا کو کہنا ہی پڑا "اچھا محبوب صاحب اب اسلام علیکم"

تب جبو نے اٹھتے ہوئے کہا "اچھا اب جاتے ہیں۔ وعلیکم السلام"

جبو نے جاتے جاتے دیکھا کہ مرزا کا شاگرد آ کر ان کے پاس لیٹ گیا اور مرزا اس کی کتاب ہاتھ میں لے کر پڑھنے لگے۔

(۲)

قریب کی مسجد میں اذان کی آواز سنتے ہی انور اپنے لحاف میں کلبلائی اور پھر لحاف الٹ کر اٹھ بیٹھی۔ ابھی اندھیارہ تھا اور گھر کے سب لوگ غافل سو رہے تھے۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ شہ نشین کے اوپر جا کر منہ ہاتھ پونچھے۔ اپنا دوپٹہ باقاعدہ لپیٹا اور جانماز تخت پر بچھا کر نماز صبح ادا کرنے لگی۔ نماز کے بعد وظیفہ اور تلاوت کرتی رہی۔ اب گھر بھر میں صبح کا نور پھیل گیا تھا اور اس کا چہرہ جس کے چاروں طرف دوپٹہ لپٹا ہوا تھا اس نور کا مبدا معلوم ہوتا تھا۔ اسکی

اندر کو دبی ہوئی بڑی سیاہ آنکھیں کسی پر اسرار گہرائی، کسی آسمانی رمز کا مظاہرہ تھیں۔ اس کی چمپئی رنگت کی سادگی اور صفائی میں صبح کے دلکش چہرۂ نورانی کا راز پنہاں تھا۔ اس نے تلاوت ختم کرنے کے بعد آنکھیں بند کیں اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔ اس وقت اس کا ننھا چہرہ کہ دوپٹہ کے باقاعدہ لپیٹے ہوئے پیچوں سے گھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا بے ساختہ قدیم مصر کی ممیوں کی طرح کا معلوم دیا یعنی اس کے چہرہ پر موت کا سایہ سا پڑتا دکھائی دیا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرہ پر پھر رنگ آگیا۔ جانماز۔ قرآن شریف وغیرہ کو جب وہ طاق پر رکھ رہی تھی تو اس کے چھریرے جسم کی لطیف نزاکت اور سڈول بناوٹ نمایاں تھی۔ اس نے دوپٹہ کے پیچ کھول کر پھر سے دوپٹہ اوڑھا۔ اب اس کا سر کھلا ہوا تھا اور چہرہ شگفتہ ہو گیا تھا اور ہونٹوں پر ایک چھپی ہوئی شوخی کھیلنے ہی والی معلوم ہوتی تھی۔

شہ نشیں سے اتر کر دالان میں آئی اور اپنے بچھونے کو لپیٹا اور والہانہ انداز میں دالان سے نکل کر باورچی خانہ کی طرف چلی وہ انگنائی ہی میں تھی کہ جبو نواب کے کمرے سے اسے بچی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ پھر اس کی بھابی کی آواز آئی "خدا سمجھے کسی مصرف کا نہیں یہ مردوا۔ ذرا لڑکی کو بہلا لو" وہ باورچی خانہ میں پہونچ گئی تھی۔ پلٹ کر اس نے دیکھا کہ جبو نواب اپنے کمرے کے بیچ والے دروازے کے پاس اپنی لڑکی کو ہلاتے ہوئے "نہیں نہیں" کہتے ہوئے ایک عجیب تذبذب کے عالم میں مبتلا نظر آرہے ہیں۔

وہ فوراً باورچی خانہ سے نکل کر اپنے بھائی کی طرف شایداں پر ترس کھا کر ان کی مدد کرنے تیزی کے ساتھ بڑھی اور کہتی ہوئی "لائیے بھائی صاحب میں اپنی منی بچی کو بہلا لوں گی۔ آپ اگر ممو کی ماں کو جگا دیجئے"

جبو نے اپنی گردن کو ساٹھ درجہ کے زاویہ پر جاتے ہوئے لڑکی کو بہن کو دیا اور بولے "بھوکی ہے شاید"

"ہاں۔ ہاں۔ بی بی۔ دودھ پئیں گی۔ بی بی دودھ پئیں گی" کہتے ہوئے انور نے لڑکی

کو کندے سے اس طرح لگایا کہ وہ چپ ہو گئی۔ اس وقت دولہن بیگم کی پلنگ پر سے آواز آئی "دودھ کی لٹیا طاق پہ ہے۔"

"آپ آرام کیجئے بھابی میں اٹھالوں گی۔ آگ سلگ جائے تو دوں۔ ٹھنڈا دودھ کیسے دے دوں جاڑے کے دن ہیں" یہ کہتی ہوئی انور طاق کے پاس آئی اور لٹیا اٹھا کر کمرے سے باہر نکلی۔ دو ہی قدم آگے بڑھی ہو گی کہ دروازے پر کھٹ کھٹاہٹ سنائی دی جو نواب نوکرنیوں کو جگا کر باورچی خانہ سے باہر آرہے تھے اور بولے "شاید قمر بھائی ہیں" اور ڈیوڑھی کی طرف چلے گئے۔

باورچی خانہ میں تو آگ سلگاتی رہی اور انور لڑکی کو اپنا انگوٹھا چوسا کر بہلاتی رہی قمر نواب اندر آئے۔ جو اپنے کمرے میں واپس گئے اور قمر باورچی خانہ کی طرف آئے ان کی نگاہ محبت انور کے چہرہ پر جمی۔ انور ایک ہاتھ سے لڑکی کو سنبھالے تھی اور دوسرے ہاتھ کا انگوٹھا اسے چوسا رہی تھی۔ قمر کی نگاہ کی تاب نہ لاکر ایکدم سے اس نے اپنا ہاتھ سر پر دوپٹہ سنبھالنے کے لئے اٹھایا۔ لڑکی کے منہ سے انگوٹھا نکل گیا اور اس نے ایک چیخ ماری۔ اسکی آواز دالان میں پہونچی اور بیگم صاحب نے منہ پر سے لحاف اُلٹا۔ قمر لپک کر دالان میں آئے اور بولے "تسلیم خالہ اماں"

"جیو سلامت رہو...... ارے۔ گیا گیا...... لو یہ افسر نے پھر موت دیا آج...... میں کہتی ہوں یہ انور کی غفلت کو۔ میں نے کہہ دیا کہ رات میں اسے اٹھا کے متا لیا کر۔"

"خالہ اماں وہ کہاں تک کام کرے بیچاری۔ ہر وقت تو ہر کام کیا کرتی ہے۔ آخر قیصر سے بھی تو کچھ کام لیا کیجئے۔"

اس وقت قیصر نے اپنے لحاف کے اندر جنبش کی اور معلوم ہوا کہ اس کی پیٹھ ادھر کی طرف ہو گئی۔ بیگم صاحب کہتی رہیں "قیصر کا کیا ہے نگوڑی کا جو اس کی قسمت کا لکھا تھا وہ سامنے آگیا۔ اس انور کو تو برا ئے گھر جانا ہے۔ کوئی کیا تھوکے گا اس کے بجڑوں میں۔"

"تو وہ کس بات میں بد سلیقہ ہے۔ دیکھئے لڑکی کو اب دودھ پلا رہی ہے۔ بھاوج کا آپ کا۔ والد کا بہن کا۔ سب ہی کا کام تو وہی کرتی ہے اور پھر آپ کہتی ہیں"۔

"تم ہر چک نہ لیا کرو۔ بے فضول کے لئے"

انور اس اثنا میں اپنی بھتیجی کو دودھ پلا کر اس کی ماں کے پاس لیٹا آئی اور اپنی ماں کے پاس آکر بولی "لائیے تو میں افسر کا گھاز کال کے بھیجے پر ڈال آؤں"۔

"ابھی رہنے دو" اس کی ماں نے کہا "اسے اٹھاؤ گی تو وہ چیخے گی۔.... اسے بھائی کو پان لگا دو"

انور نے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر پان لگایا اور قمر کو دیا اور پھر باورچی خانہ کی طرف چلی گئی جہاں وہ ماما بسمہ کو سیدھا تو لانے لگی اور ممو چلمیں بھرنے میں مصروف رہی۔

ممو نے ایک حقہ لا کر ججو نواب کے پاس لگا دیا جو اپنے کمرے میں تخت پر کمبل اوڑھے چت لیٹے تھے اور ان کی ایک نگاہ کمرے کی چھت کے ایک کنارے اور دوسری دوسرے کنارے پر لگی ہوئی تھی۔

دوسرا حقہ اس نے لا کر نواب صاحب کے پلنگ کے پاس رکھا اور کہا "حضور حقہ رکھا ہے گا" نواب صاحب نے منہ پر سے لحاف الٹا اور حقہ منہ میں لگاتے ہوئے قمر کو دیکھا۔ قمر نے آداب کیا اور انہوں نے جواب دیا۔

اتنے میں ببو اپنے پلنگ پر سے گڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "آپ سے بڑا ضروری کام تھا قمر بھائی"

اس کی ماں نے کہا "عجیب اجبک لڑکا ہے۔ بڑے بھائی کو نہ سلام اور نہ دعا اور اگر مرسے بولنے لگا"

"آداب عرض" ببو نے کہا۔

"جیتے رہو۔ آخر کیا ضروری کام ہے۔ تم کوئی اوندھی ہی بات بتاؤ گے"۔

"نہیں واللہ قمر بھائی بڑے فائدے کا کام ہے۔ وہ نکڑ پر لکڑی کی دوکان ہے نہیں سلامت کی۔ وہ اپنی دوکان اٹھا رہا ہے۔ سب سامان اونے پونے دے دے گا۔ آپ لے لیجئے"

"واہ یہی ضروری بات تھی۔ تم بھی وہی ہو۔ ارے میں اس کا سامان نہیں لیتا۔ میں اس سے بات کر چکا ہوں"

"اچھا تو پھر جانے دیجئے۔ مجھے آپ کے فائدے سے مطلب تھا"

قمر جانے لگے تو بھوان کے پیچھے ہو لیا۔ ملگجا پینٹ اور میلی قمیص پہنے ہوئے تو وہ بچھونے ہی سے نکلا تھا۔ اب اس نے ایک موٹا فوجی کوٹ لاد لیا تھا اور اس کے سر کے بال کچھ ماتھے پر پڑے تھے اور کچھ اُلجھے ہوئے سر پر کھڑے تھے۔

ڈیوڑھی میں پہونچ کر بھو نے قمر کی سائیکل اٹھائی اور بولا "نہیں میں اُتار دوں گا آپ کیوں زحمت کریں" اور سائیکل کو گلی میں لا کر قمر کے حوالے کیا۔ قمر بولے "یہ بات کیا ہے جو تم آج میری خدمت پر اس طرح تلے ہوئے ہو"

"ارے آپ بڑے بھائی ہیں"

"مجھ کو چلانے چلے ہو۔ احمق ہو کے۔ اپنا مطلب بتاؤ"

"میں آپ سے کہتا ہوں۔ وہ سامان آپ لے لیجئے۔ بڑا سستا ہے اور سلامت کی بیوی یہاں آئی تھی بھابھو اماں سے کہہ گئی ہے اور انور کو اس پر بڑا ترس آیا۔ اس کا سامان لے لیجئے نا"

"اچھا۔ یہ تم سچ کہہ رہے ہو کہ اس کی بیوی آئی تھی۔ جھوٹ ہے بالکل"

"نہیں بالکل سچ"

"اچھا میں ابھی واپس چل کے پوچھتا ہوں خالہ اماں سے اور انور سے بھی"

"ارے ابھی پوچھ کے کیا کیجئے گا۔ کسی اور وقت پوچھ لیجئے گا"

"واہ رہے احمق ہی۔ جھوٹ بولنے بھی چلے تو ایسا کہ فوراً ہی کھل گیا"

"ارے جانے دیجئے میں آپ کے فائدے کی بات کہہ رہا ہوں گا۔ آپ نہیں مانتے تو جانے دیجئے"

"میرے فائدے کی یا اپنے فائدے کی تم کو اس نے دو چار روپے دینے کو کہے ہونگے"

"آپ بھی واللہ۔ قمر بھائی میں کیا کہوں"

"کچھ نہ کہو تم۔ مجھے جلدی ہے اس وقت"

اب یہ دونوں گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئے تھے۔ بجو ایک طرف کو چل دیا اور قمر سائیکل پر بیٹھ کر عارف کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ عارف کے گھر پر پہونچ کر وہ اس کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ عارف حمام میں تھا۔ باہر آیا تو ان کو دیکھ کر بولا "اے قمر بھائی۔ آپ اتنے تڑکے؟"

"ہاں بھائی وہ میں نے تم سے کہا تھا نہیں کہ میں تمہاری مدد چاہوں گا انگریزی کا کورس تیار کرنے میں"

"اچھا تو آپ پڑھنے آئے ہیں"

عارف اپنے پلنگ پر لیٹ گیا اور بولا "اچھا تمہیں اپنے طریقہ سے پڑھاؤں یا کمسار کے طریقہ سے"

"میں سمجھا نہیں"

"میں پڑھتا ہوں علم حاصل کرنے کے لئے گمار پڑھتا ہے امتحان میں اول آنے کے لئے"

"میں بھی امتحان کے لئے پڑھنا چاہتا ہوں۔ بس پاس کرنا ہے کسی طرح سے"

"یہ بات ہے۔ اس معاملہ میں بھی دوکانداری کرنا چاہتے ہو پوری۔ مگر یار اس سے فائدہ؟"

"تم تو جانتے ہو؟"

"میں سمجھا یار۔ چاندی کے حلقوں پر سونے کا ملمع اشد ضروری۔ دولہا کے گلے میں بی۔ اے کی ڈگری لٹکتی ہوئی ضرور چاہئے، اس گدھے میں قابلیت کچھ نہ ہو۔ مگر یار یہ سب اسراف ہیں کھو کھلی

تہذیب کے جنہیں ہم ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن تم تو جو سے کم ہیرو ہو بہت کم۔ آخر دوکان داری کرتے ہو یعنی کچھ مفاد کا خیال ہے تم کو"

"اماں تم سے کہہ چکا ہوں کہ جب سے خالہ اماں نے کہا ہے کہ آجکل لوگ پوچھتے ہیں کہ دولہا کیا پڑھا ہے تو کم از کم کہنے کو تو ہو کہ ماشے اللہ سے بی۔ اے ہے"

"یہ تو تم کہہ چکے ہو مگر تم بی۔ اے ہو جاؤ گے تو کس معنے میں اتو رکے لئے زیادہ موزوں شوہر ہو جاؤ گے۔ تمہیں نوکری نہیں کرنا ہے دوکانداری ہی کرنا ہے۔ کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں"

"میں نے فائدے کا کوئی خیال نہیں کیا۔ بس جو وہ چاہتی ہیں وہ کروں گا"

"اس معاملے میں تم دوکاندار نہیں ہو۔ عاشق ہو پورے عاشق۔ وہی بندۂ جاناں بو دن جو حکم حضور کا وہی سر آنکھوں پر"

"اماں۔ یہ فلسفہ اپنا چھوڑو کام کی بات کرو"

"اب آگئے تم دوکانداری پر اچھا لو۔ انگریزی کے چار پرچے ہوں گے۔ ہر پرچہ کے بابت میں دس دس سوال لکھوائے دیتا ہوں۔ تم مجھے ایک یا دو سوال روزانہ دکھا دیا کرو لکھ کے۔ اس کے باہر سے نہیں آئیگا"

"تم ذمہ دار ہو"

"بالکل۔ اگر آگیا کوئی سوال بھی تو میں اپنی ڈگری تمہارے گلے میں لٹکا دوں گا اور تم اپنا بیاہ رچانے چلے جانا..... خیر لکھو"

عارف سوالات بولتا گیا اور قمر لکھتے گئے۔ اسی درمیان میں عورت عارف کو چائے پر بلانے آئی۔ عارف نے چائے اپنے کمرے ہی میں منگوالی وہ اور قمر چائے پیتے گئے اور اپنا کام کرتے گئے۔ جب کام ختم ہوگیا تو عارف نے پوچھا "دوسرے مضامین کے لئے کیا ہے"

"ہسٹری میں عباس علی نے نوٹس دے دیے ہیں اور بتا دیا ہے کہ یہ یہ ٹاپک رٹ ڈالو"

"ہاں۔ وہ رات رات بھر آنکھیں بند کر کے رٹا کرتا ہے"

"اور رہا وہ نیا مضمون جو پار سال سے ہوا ہے یعنی اُردو معہ فارسی تو اس میں کون فیل ہوتا ہے۔"

"بس بس تم پاس ہو گئے۔ بالکل۔ مانجھا دا بجھا ابھی سے کرا لو شادی رزلٹ آنے پر ہوتی رہے گی۔"

"یار مذاق نہ اُڑاؤ میری محبت کا"

"مذاق؟ مجھے ہر شخص کی محبت کی بڑی قدر ہے۔ اور تمہاری محبت کی سب سے زیادہ ابکی چہلم کے دن سے ہو گئی۔"

"وہ کیسے؟"

"تمہاری محبوبہ بھی عجیب چیز ہے۔ بڑی دلکش۔ اگر تمہارے پاس ہزاروں دل ہوتے تو میں کہتا اس پر سے سب قربان کر دو"

"تم نے اسے دیکھا؟ کہاں؟ کب؟"

"ہم شہید مردوں سے کوئی چیز چھپی رہ سکتی ہے۔ میں نے بارہا ارادہ کیا کہ کبھی موقع سے کہہ دوں گا تم سے کہ میں نے تمہاری چیز اتفاق سے دیکھ لی۔ مگر کوئی موقع نہ ملا۔ ابھی کوئی دو تین ہی مہینے تو ہوئے۔ بھلا جب آنکھوں کے سامنے آ ہی جائے اور چیز بھی ایسی کہ آتے ہی خود بخود دل میں سمانے ہی لگ جائے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے غور سے نہ دیکھا جائے۔"

"مگر یار تم نے دیکھا کہاں؟"

"اس سے تمہیں کیا مطلب۔ میں نے تمہاری امانت سمجھ کر دیکھا اور جتنی دیر دیکھتا رہا یہی دعا مانگتا رہا کہ خدا تمہیں مبارک کرے۔ بس تمہیں آگے جاننے کی کیا ضرورت ہے کہ میں نے کیسے دیکھا۔"

"خیر تم نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی۔ لیکن اگر بتا دو تو کیا حرج ہے"

"کوئی بات نہیں۔ میں بتائے دیتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ چہلم کے دن ہم کربلا ضرور جاتے ہیں

تم تعزیوں کی زیارت کو جاتے ہو ہم تمہاری قوم کی زیارت کو جاتے ہیں"

"یا حسین چہروں کی زیارت کو جاتے ہو"

"اب پھر لگے تم حماقت کی باتیں کرنے۔ اچھا جاؤ آگے نہیں بتاتے"

"نہیں۔ نہیں۔ تم انسانوں ہیومینٹی کی اسٹڈی کو جاتے ہو۔ اب بتاؤ"

"خیر تو شام ہونے والی تھی۔ ہم وہیں کھڑے تھے جہاں سے سڑک سواریوں کے چلنے بند کر دی جاتی ہے نا۔ مجمع سب واپس ہی ہو رہا تھا۔ اکدم سے دیکھتا کیا ہوں کہ حبو چلے آ رہے ہیں۔ وہ ان کا چلنے کا انداز معلوم ہوتا ہے کہ زبان حال سے اس شعر کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

لڑکھڑاتے ہیں گرے جاتے ہیں تیرے ناتواں
اے تری قدرت کے صدقے تھام لے بڑھ کر ہمیں

اور ان کے پیچھے دو لڑکیاں برقعوں میں۔ میں نے پوچھا 'کہاں'، بولے، 'اب تو یہ گنج سے ادھر تو یکہ ملے گا نہیں'، میں نے کہا، 'ہائے مجبوری چلو تم اسی پر ایک نوحہ کر ڈالو اور ہم تمہارے ساتھ ماتم کریں'، اور پھر میں نے کہا، 'تم اتنے بڑے ہیرو اور ہم تمہارے علم بردار کہیں ممکن ہے کہ تم یکے پر جاؤ۔ ہماری موٹر پر چلو'، بولے "یہ میری بہنیں ساتھ ہیں" میں نے کہا "یہ بھی سر آنکھوں پر یعنی موٹر پر چلیں، موٹر کوئی سائیکل تو نہیں کہ اس کے ڈنڈے پر ایک آدمی ہی کی گنجائش ہو غرض موٹر میں پیچھے وہ دونوں بیٹھیں اور وہ میرے پاس بیٹھے"

"مگر تم نے دیکھا کب ؟"

"بتاتا ہوں یار۔ میں نے گاڑی بیک کی آئینہ پر نظر پڑی۔ دیکھا کہ ایک لمبا سو کھا چہرہ حبو سے ملتا ہوا آئینہ میں دکھائی دے رہا ہے آئینہ کا میں نے رخ بدلا تاکہ جس طرف میں بیک کر رہا تھا وہ طرف دکھائی دے۔ بس قیامت آگئی آئینہ میں۔ وہاں سے حبو کے گھر تک میں پورا پورا گنہ گار رہا۔ میری ہمت ہی نہیں پڑی کہ آئینہ کو سیدھا کر لوں۔ وہ عیش باغ والی سنسانے کی سڑک۔ موٹر جیسے آپ ہی آپ چلی جا رہی تھی اور میں آئینہ میں اس بھولی بھالی پیاری پیاری صورت کو محویت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ کیا صورت ہے۔ کیا صفائی۔ کیا سادگی۔ کیا

متانت اور کیا جادو"

"تو تم تو عاشق نہیں ہو گئے اس پر"

"نہیں یار۔ مجھ میں عاشق ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی۔ تم تو جانتے ہو۔ عشق کرنے کی تمام قوت ایک جذب کر کے مر گئی"

"مگر اسے مرے ہوئے بھی عرصہ ہو گیا اور تم ابھی قانوناً بالغ بھی نہیں ہو"

"یہاں تو وہ دل میں ایسی بسی ہے کہ کسی اور کی جگہ ہی نہیں۔ میں تیری انور کا عکس دیکھ رہا تھا اور یاد وہ آ رہی تھی۔ یوں ناک نقشہ میں تو زیادہ مشابہت نہیں مگر رنگت وہی چمپئی۔ وہی شگفتگی۔ وہی سادگی۔ وہی ذہانت۔ وہی صفائی اور آنکھیں بالکل وہی گہری پُر اسرار آنکھیں جن میں تمام کائنات کی گہرائی پنہاں اور نمایاں۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کیسے گھر تک موٹر لایا۔ یہاں آکے پڑ گیا۔ بس وہی یاد آتی رہی۔ تمہاری والی نہیں۔ اپنی والی جو خاک میں مل گئی۔ ایسی صورتیں اللہ میاں بس تھوڑی دیر دکھا کے ہٹا لیتے ہیں نہیں تو یہ دنیا ہی جنت نہ ہو جائے دنیا کاہے کو رہے"

"یہ سب تمہارا وہم ہے۔ مگر بڑا گہرا وہم"

"وہم نہیں یار بیماری ہے مستقل بیماری۔ مگر لا علاج نہیں ہے۔ مجھے ادب سے دلچسپی خاص طور پر انگریزی ادب سے دلچسپی اس کا علاج ہے جب کبھی دورہ پڑتا ہے اسی نسخہ سے دل کو تسکین ہو جاتی ہے"

"مگر مرض جاتا تو نہیں"

"کبھی زخم خون بستہ ہو جاتا ہے۔ مگر میرؔ نے کہا نہیں ہے۔ ؎

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا ہم تو سمجھے تھے کہ اے میرؔ یہ آزار گیا

بس کبھی کبھی لہو ٹپکنے لگتا ہے۔ ہم اپنی زندگی یوں ہی گزار دیں گے۔ تم کو اپنے دل کی خوشی مبارک ہو اپنے لئے تو غالبؔ یہ کہہ گئے ہیں۔ ؎

مل گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط	تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا"

"تمہاری باتوں میں یار بہت دل لگتا ہے"

"وہ ٹھیک ہے۔ میرا بھی ادب میں اسی لئے بہت دل لگتا ہے۔ عرفی نے کہا نہیں ہے؂

از پریشانیِ دل سوختم دبہرِ علاج	ہم بدریوزۂ دلہائے پریشاں رفتم

...... مگر یار ارے۔ آجکل جاڑوں میں کتنی جلدی کالج کا وقت آجاتا ہے۔ مجھے مضمون ختم کرنا ہے۔ آج ہی دکھانا ہے"

"مجھے بھی دوکان کھولنے میں کچھ دیر ہی ہوگئی"

قمر نواب اپنی سائیکل پر بیٹھ کر اپنی دوکان پہونچے۔ دوکان کھولی۔ اس کی جھاڑ پونچھ کی اور پلتھی مار کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ یہ دوکان انہوں نے اپنے والد کے مرنے پر اپنا وثیقہ بیچ کے شروع کی تھی اور کیونکہ اس میں نفع سے واجبی خرچہ ہی نکال کر باقی آمدنی دوکان ہی میں لگاتے گئے تھے اس لئے اس وقت اس دوکان میں کئی ہزار کا سامان تھا۔ ان کے والد مرحوم کا پونے پانچ روپیہ ماہوار کا وثیقہ تھا مگر ساتھ ہی ساتھ وہ دلالی کرتے تھے جس سے ان کی اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ قمر کو اسکول میں داخل کر کے سب خرچے برداشت کئے جا سکیں۔ مگر قمر ہائی اسکول بھی نہ پاس کرنے پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور قمر کو پڑھائی چھوڑنا پڑی۔ پونے پانچ روپیہ ماہوار میں ان کی کیا بسر ہوتی اسلئے انہوں نے وثیقہ بیچ کر دوکان کی۔ اب ان کی آمدنی وافر تھی اور کسی گریجویٹ کی عام آمدنی سے کہیں زیادہ تھی۔ انہیں یوں ترقی کرتے دیکھ کر ان کی خالہ نے ان کو انور کے لئے تاک لیا تھا۔ مگر ان میں ایک کمی یہ تھی کہ وہ بی۔ اے نہیں تھے اس لئے انہوں نے یہ کمی پوری کرنے کا انتظام شروع کر دیا تھا۔ پرائیوٹ ہائی اسکول کیا، انٹر کیا اور اس سال بی۔ اے کر کے اپنی خالہ کی مزید غلامی میں آجانے کی التجا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

انور ان سے قریب دس برس چھوٹی تھی۔ انہوں نے اسے گودیوں کھلایا تھا۔ مگر جب سے وہ جوان ہوئی تھی تب سے وہ اس پر فریفتہ ہو گئے تھے اور اشاروں سے اس کے ساتھ

شادی کرنے کے ارادے کو اپنی خالہ پر ظاہر کر چکے تھے۔ ان کی خالہ بھی اشاروں سے اپنی رضامندی کا اظہار کر چکی تھیں۔ انہیں انور سے سچ مچ محبت تھی اور اس لئے دن میں کم از کم تین دفعہ وہ اپنی خالہ کے گھر ضرور ہو لیتے تھے۔ اب جبکہ ساعت وصل ان کو نزدیک آتی معلوم ہو رہی تھی تو آتش عشق تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ صبح کو وہ دکان پر آنے کے بعد وہ دوپہر کا راستہ دیکھا کرتے تھے کہ وہ دکان بند کر کے اپنی خالہ کے گھر ہوتے ہوئے انور کو دیکھتے ہوئے گھر کھانا کھانے جائیں اور واپسی میں پھر اسے دیکھتے ہوئے دکان واپس آئیں۔

غرض آج دوپہر کو بھی وہ اپنی خالہ کے یہاں آئے۔ قیصر یہاں اپنے پلنگ پر بیٹھی سنگھار کر رہی تھی۔ یہ اس کو دیکھ کر بولے "اچھا ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی خواب سے بیدار ہوئے ہوئے بیگم صاحب کو"

"اے نگوڑی کیا کرے" ان کی خالہ نے کہا "اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہے۔ میں پہلے ہی پیٹتی تھی کہ بڈھے کے ساتھ شادی نہ کرو مگر وثیقہ کے مارے کر دی۔ خیر حق زوجیت کے بیس ۲۰ اسے ملتے ہیں جو چاہے کرے۔ جیسے چاہے اپنا دل بہلائے کیوں اپنا دل مارے"

"آپ بالکل بجا فرماتی ہیں خالہ اماں۔ اس کو بارہ بجے ہی اٹھنا چاہئے اور پھر شام تک سنگھار کرتے رہنا چاہیے"

قمر نواب کہہ تو یہ سب رہے تھے مگر ان کی آنکھیں انور کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ جیسے انور بیچ کے کمرے میں اپنی بھاوج کے پاس ہے۔ وہ اٹھ کر اس کمرے کے بیچ والی دروازے کے پاس آئے اور دیکھا کہ انور بیٹھی ہوئی اپنی بھابی سے باتیں کر رہی ہے۔ اندر قدم رکھتے ہوئے انہوں نے کہا "کیا ہو رہا ہے بھابی"

"اے یوں ہی باتیں کر رہے ہیں" بھابی نے کہا۔

انور اپنے سر پر دوپٹہ سنبھال کر ان کی طرف دیکھنے لگی اور پھر شرما کر اس نے اپنی

آنکھیں نیچی کر لیں۔

قمر ایک منٹ وہاں کھڑے رہے اور "اچھا جاتے ہیں" کہکر باہر آ گئے ان کو کسی نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ جب وہ گھر کے باہر پہونچ گئے ہوں گے تو انور نے مسکرا کر کہا "عجیب بات ہیں۔ ان کو یہاں آنے ہی کو کس نے کہا تھا"

"وہاں بیوی ان سے پوچھے کوئی کس نے بلایا تھا" دولہن بیگم نے کہا اور ان پر ہنسی کا ایک بہت مختصر سا دورہ پڑ کر رہ گیا۔

"مگر" انور بولی "مجھے ترس آتا ہے ان بچارے پر"

"ہاں تمہیں ترس آنا چاہیے۔ کس پیار کی نظر سے تو تمہیں دیکھتے ہیں اور بھابھو اماں تمہارے ساتھ شادی کو کہتی ہیں"

"ایسی باتیں نہ کیجئے بھابھی اللہ۔ نہیں تو ہم چلے جائیں گے" اور انور اٹھنے لگی۔

"نہیں نہیں۔ بیٹھو۔ آخر ہم سے اور تم سے ایسی باتیں نہ ہونگی تو پھر کس سے ہونگی۔ اچھا بتا دو ہمیں تم کو بھی اچھا لگتا ہے یہ قمر"

"رہنے بھی دیجئے بھابھی" انور نے کہا اور اس کی آنکھیں حیا سے ڈبڈبا آئیں۔

"چپکے سے بتا دو ہم کسی سے کہیں گے تھوڑی۔ اور اس میں ہے کیا"

انور کا چہرہ حیا سے گلابی ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں کچھ آنسو سے آ گئے۔ اس کی بھابی بولی "ہٹو ایسا شرمانا نہیں اچھا لگتا"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں پھر انور کے چہرہ پر سنجیدگی نمایاں ہوئی اور وہ بولی "اچھا تو سنیئے بھابی۔ ویسے تو بھائی ہیں مجھے بھی اور جان کی چاہتے ہیں۔ مگر مجھے اچھے نہیں لگتے"

"آئیں ۔ وہ تو جان دئے دیتا ہے اور تمہیں نہیں اچھا لگتا۔ ہم پر کوئی ایسا جان دیتا تو ہم اس پر سے قربان ہو جاتے"

"تو کیا بھائی صاحب آپ کو نہیں چاہتے۔ بھابھو تو سب سے کہتی ہیں بہت چاہتا ہے"

"ٹھینگا۔ انہیں کسی کی چاہت ہی نہیں ہے گی۔ گم سم مردہ ہے۔ صبوں اٹھا اسکول چلا گیا۔ شام کو آیا حقہ پی رہا ہے۔ پھر پڑ رہا۔ وہ کیا چاہے گا کسی عورت کو...... اچھا یہ بتاؤ کہ جب وہ تمہیں دیکھتا ہے تو تمہیں کیسا معلوم ہوتا ہے۔ سچ سچ بتانا۔"

"مجھے شرم آنے لگتی ہے۔ ڈر لگنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہیں الگ ہٹ جاؤں۔ مگر پھر جیسے کوئی سم کر دیتا ہے اور میں یوں ہی کی یوں ہی بیٹھی رہ جاتی ہوں"

"ہٹو۔ جھوٹ نہ بولو۔ پان لگانے کو تو تیار ہو جاتی ہو اور الجھیا الجھیا کے باتیں کرنے لگتی ہو۔"

"آپ بھی بھابھی کیا کا کیا سمجھ جاتی ہیں۔ ابھی دیکھئے آئے تھے چہرہ پہ ہوائیاں خیر آجکل تو جاڑے ہیں۔ گرمیوں میں جب اس وقت آتے ہیں تو جیسے ہل ہانکتے، کودوں چانکتے پسینہ بہتا ہوا۔ بالکل پاگلوں کی طنا (طرح) مجھے نفرت ہوتی ہے دیکھ کے"

"اچھا۔ یہ جی نہیں چاہتا کہ ان سے شادی ہو"

"یہ میں کیا جانوں۔ شادی جہاں کر دی جائے گی وہیں کے ہو رہیں گے"

"اچھا اگر تمہاری مرضی سے شادی ہو تو"

"ہماری مرضی۔ آپ کی شادی۔ آپ کی مرضی سے ہوئی؟"

"نہیں؟"

"پھر ہماری مرضی کو اس میں کیا دخل"

دولہن بیگم کچھ اور کہتیں مگر انہوں نے دیکھا کہ قمران کے کمرے میں آ رہے ہیں اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر بولیں: "کھا یائے کھانا"

"ہاں بھابھی آج آپ پان کھلوائیے خوب موٹا سا ٹھنڈک ونڈک ڈال کے"

"انور ذرا میرا پاندان ادھر اٹھا لینا"

قمر تخت کے کونے پر ٹک گئے تھے اور انور کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کے بھابی

کو دیکھنے لگے تھے۔

"اے اپنی شادی کیوں نہیں کر تے" جو بے گھرے سے ہو رہے ہو برسوں سے"

"مجھے کیا اختیار ہے شادی کرنے کا۔ اب میری جو کچھ ہو خالہ اماں ہیں۔ وہ جب چاہیں کریں جہاں چاہیں کریں"

انور پاندان اپنی بھابی کے سامنے رکھ کر تخت سے اترنے لگی قمر نے پھر اس کی طرف حسرت سے دیکھا۔ وہ ان کی طرف سے منہ پھیرتی ہوئی جوتی پہن کر باہر چلی گئی۔

"تم جانتی ہو بھابی۔ اب میری حالت بہت سدھر گئی ہے۔ میری دوکان میں بھی اس وقت نہیں تو پانچ ہزار کا سامان ہوگا اور بنک میں بھی ہزار بارہ سو پڑا ہے۔ اور میں اس سال بی۔ اے بھی کر لوں گا۔ تم خالہ اماں......"

"آئیں۔ میں خالہ اماں سے تمہاری۔ وہ مجھ سے بات بھی کرتی ہیں سیدھے منہ۔ میری بلا سُنیں گی"

"یہ تو مجھے یقین ہے کہ وہ چاہتی ہیں۔ مگر اب ان سے کہے کون۔ خیر چار مہینہ کے بعد جب میرا بی۔ اے کا نتیجہ آئیگا تو میں خود کہوں گا کہ اب آگے جو حکم ہو وہ بھی بجالاؤں"

"اے تم اپنی اس بڑھیا سے کیوں نہیں کہلواتے جو تمہارا کھانا پکاتی ہے اور گھر رکھاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ تمہارے والد کے متاع میں تھی۔ اس طنا (طرح) تو وہ تمہاری ماں ہی ہوئی"

"بھابی۔ اچھا۔ آپ مذاق بھی کر لیتی ہیں واللہ"

بھابی نے ہاتھ بڑھا کے پان دیا۔ قمر نے پان منہ میں رکھا کھڑے ہو گئے اور بولے "اب آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، بس بی۔ اے کر لوں۔ آگے خدا مالک ہے"

(۳)

منیر میاں نہایت درجہ پریشان حال اپنے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کی موٹر ایک

مستقل پریشانی تو تھی ہی مگر آج تو اس نے اسقدر پریشان کر ڈالا تھا کہ جس کی حد ہی نہیں ہو سکتی۔ ان کے ساتھی مرزا اور مصباح ایک ہفتہ سے ان کے ساتھ جانا آنا چھوڑ چکے تھے۔ مصباح تو اس دن سے اس کے پاس نہیں پھٹکتے تھے جس دن سے کہ وہ اسے چڑھائی پر چھوڑ کر گلی میں بلبے پڑے تھے۔ مرزا منیر کی محبت میں اس کے بعد سے بھی ایک آدھ ہفتہ تک لیے مختلف جگہوں پر دھکیلتے ہوئے دکھائی دئے تھے۔ مگر اب منیر میاں ان سے کہتے کہ "ہمارے ساتھ چلنا موٹر پر" تو وہ نہایت سنجیدگی سے کہتے "سچی بات یہ ہے کہ اب مجھ میں دھکیلنے کا دم نہیں" اور ایک 'کھی' والی ہنسی ہنستے۔ چنانچہ اب جمّو نواب ہی رہ گئے تھے جو اپنی انتھک قوت برداشت کے ساتھ ان کی برابر مدد کئے جا رہے تھے۔ مگر آج موٹر کے انجن نے چلنے سے اس استقلال کے ساتھ انکار کیا کہ منیر میاں ہینڈل لگاتے لگاتے بے دم ہو گئے اور جمّو نواب دھکیلتے دھکیلتے آخر کو منہ کے بھل گرے۔ اس کے بعد جمّو اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اور اپنی سانس سنبھالتے ہوئے چار مزدوروں کو بلا لائے اور ان مزدوروں نے دھکیلتے ہوئے موٹر منیر میاں کے گھر تک پہونچائی۔ منیر میاں کے ایسے گلبدن، نفاست پسند اور نازوں کے پالے محبوب خاص و عام صاحبزادے کے لئے اب تک کبھی کوئی کسی قسم کی پریشانی اتنی شدید نہیں سامنے آئی تھی۔

پریشانی سے کافی کھسیائے ہوئے اور کافی غصہ میں وہ گھر کے اندر پہونچے۔ ان کی والدہ انتظار میں آہٹ پر کان ہی لگائے ہوئے تھیں۔ ان کو دروازے سے داخل ہو کر اپنے کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر نوکرنی کو ڈانٹنے لگیں "ارے خاک پٹی میاں آ گئے۔ جلدی کھانا نکال" منیر میاں کی بہن نے جو اپنی سسرال سے آ کر میکے میں عرصہ سے بیٹھ گئی تھیں اور پلنگ پر لیٹے لیٹے اُردو کے رسالے اور ناولیں پڑھ پڑھ کر وقت گزارا کرتی تھیں۔ رسالے کو منہ کے سامنے سے ہٹا کر اپنے بھائی کو اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھا اور بولیں "چہرہ سے پریشان معلوم ہوتے ہیں"!

"نہیں گیا" ماں نے کہا "تم اپنے پرسی پوری وقت خراب کئے جاؤ"

منہ نا کر بہن نے کہا "اوں۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی ہیں"

"یہ تمہارے چہیتے باپ جو نہ کریں وہ کم ہے۔ پڑھنے سے پریشانی ہوتی ہی ہے۔ بی۔ اے کرا دیا تھا بڑے پیر صاحب نے بس ختم کراتے۔ اُنھوں نے ترقی چھوڑی نہیں ایم۔ اے کریں۔ سب روپیہ برباد کرنے کی ترکیبیں آتی ہیں۔ عارف جو کرے وہی منیر بھی کرے۔ عارف تو پھر چنگا ہی اس کے ساتھ اپنے لڑکے کو بھی پاگل بنایا ہے"

منیر میاں اپنے کمرے میں سنگھار کی الماری کے قد آدم آئینہ میں اپنے تئیں دیکھ رہے تھے اور اپنی والدہ کی باتوں کو سن رہے تھے اُنھوں نے انگریزی سوٹ اتار کر قمیص اور پاجامہ پہنا اُس برآمدے میں آئے جہاں ان کی ماں پلنگ پر بیٹھی تھیں اور ان سے کافی دور ایک پلنگ پر ان کی بہن لیٹی رسالہ دیکھ رہی تھیں۔ یہاں ان کی خاص نوکرانی تھی جو تھپانی گول مٹول میلی کچیلی نجو نے چوکھٹ پر ایک لوٹا پانی کا اور ایک صابن دانی رکھی اور کمرے کی طرف چلی گئی منیر میاں منہ ہاتھ خوب اچھی طرح دھو کر اپنے کمرے میں واپس گئے جہاں نجو ان کے کپڑے الماری میں ٹانگ کر اسے بند کر رہی تھی۔ نجو نے انہیں آتا ہوا دیکھ کر فوراً تخت پر سے تولیہ اٹھا کر انہیں دیا۔ وہ منہ پونچھتے ہوئے آئینہ کے پاس آئے اپنے منہ کو نہایت محبت کے ساتھ دیکھتے رہے اور پونچھتے رہے۔ نجو دروازے پر کھڑی رہی۔ پھر دیوار گیری پر سے کنگھا اٹھا کر کنگھا کیا اور الماری کھول کر کپڑوں پر نظر ڈالی۔ یہ دیکھ کر کہ نجو نے ہینٹ کو غلط ملا کر لٹکایا تھا وہ جھلا اُٹھے اور نجو کی طرف رخ کرکے بولے "اونہہ حرامزادی کی بچی۔ اتنے دن ہو گئے کپڑے رکھتے ہوئے اور پتلوں کو کریز ملا کر رکھنا نہ آیا۔ سور کی بچی"

"ٹھیک تو رکھے ہوں" اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"پھر دھندل بازی" اور بڑھ کر اُنھوں نے نجو کے گول بھرے گلے پر ایک ایسا طمانچہ مارا کہ وہ منہ بسور کر رہ گئی۔ اس کے گالوں پر طمانچے لگانے میں منیر کو بہت ہی خاص قسم کا

لطف محسوس ہوتا تھا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

منیر اپنے دل میں خوش ہوتے ہوئے اپنی مسہری پر آکر بیٹھ گئے۔ سنگھار کی الماری کا آئینہ بالکل ان کے سامنے تھا اور وہ مسکرا مسکرا کر اپنی صورت کو دیکھ رہے تھے۔

اتنے میں ان کی والدہ کمرے میں آئیں۔ منیر نے پوچھا "اماں تم نے کھانا کھا لیا؟"

"ابھی کہاں۔ وہ تمہارے باپ آتے ہی ہوں گے۔ کتنے بجے ہیں"

"ایک۔ کیا آج ابا آ رہے ہیں"

"آبھی گئے، گوکل پرشاد وکیل کے یہاں بیٹھے ہیں ابھی آدمی کہنے آیا تھا۔ تم کھا لو۔ بہو کھا چکی"

اب ایک سینی میں کھانا لگائے ہوئے نجو کمرے میں آئی۔ منیر نے دیوار سے لگی ہوئی ایک چھوٹی میز اپنے سامنے کھسکائی اور نجو نے اس پر سینی رکھ دی۔

منیر میاں نے سینی میں سے چمچا اٹھایا اور فوراً ہی اس کو زمین پر پٹخ کر اٹھ نجو کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ مارا اور ماں کی طرف دیکھ کر بولے "یہ چمچا دھلا تک نہیں۔ چکنا ہے"

نجو نے اپنا گال سہلاتے ہوئے جھک کر چمچا اٹھا لیا تھا اور اسے لیکر باہر جا رہی تھی کہ منیر کی ماں نے اسے دیکھ کر اپنی ناک بھویں چڑھائیں اور بولیں "یہ خاک پیٹیاں گاؤں میں بھوکی مرتی ہیں اور دو دو من پکا پیسی ہیں تو ٹھیک رہتی ہیں۔ میرے یہاں آکے میرا نمک لگتا ہے ان کو میرے نمک میں تاثیر ہی ہے جو تمہارے باپ کہتے ہیں سچ ہے" اور یہ کہتی ہوئی وہ قدم ناپ ناپ کر رکھتی ہوئی کمرے کے باہر چلی گئیں۔

نجو چمچا دھو کر لے آئی اور منیر میاں کھانا کھاتے رہے برآمدے میں سے ان کی ماں کی آواز آئی "اری باپ کی لاڈلی۔ ذرا برتن ہی دیکھ کے ٹھیک سے معلوم ہوتا ہے تمہیں دھلے ہیں کہ نہیں"

پھر ان کی بہن کی منمناتی ہوئی ہوئی آواز آئی "ہم ہی ہر وقت سب دیکھیں"

"تو کیا دیکھتی ہے۔ کیا کام کرتی ہے۔ اسی سے تو خصم نے تھوک کے چھوڑ دیا"

اس کے بعد کوئی آواز نہیں آئی - وہ کھانا کھا کر برآمدے میں آئے - ماں اپنے پلنگ پر بیٹھی پان لگا رہی تھیں - وہ آ کر ماں سے لگ کے بیٹھ گئے - ماں نے پان دئے - اور پان کھا کر وہ بولے "اماں یہ موٹر تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہو گئی"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا - موٹر اوٹر میں پیسہ نہ خراب کرو - اور اب آگے پڑھنے کی بھی گیا ضرورت ہے" جیسے کہ موٹر اور تعلیم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم چیزیں تھیں -

"مگر اماں عارف ایم - اے پڑھتا اور موٹر پر کالج جاتا تو میرا جی نہ کڑھتا - ابا نے ابھی لئے کہا کہ تم بھی لے لو - اس نے موٹر اپنے انگریز پروفیسر کی لے لی وہ ولایت جا رہا تھا - گاڑی نئی سے بھی اچھی ہے کیونکہ انگریز کی رکھی ہوئی ہے اور تم نے مجھے دو ہی سو روپیہ دئے"

"تم ہی نے تو کہا کہ پرانی سنبھلوا کے ویسی ہی ہو جائی گی جیسی عارف کی ہے"

"ہاں - مجھے کئی آدمیوں نے یہی رائے دی کہ پرانی لے لو ڈیڑھ دو سو کی اور اس میں دو ڈھائی سو لگا دو بس نئی کے مقابل ہو جائیگی"

"اور پرانی تو عارف کی بھی ہے تم کہتے ہو"

"وہ بس دو سال پرانی ہے اور انگریز کی رکھی ہوئی - سوا دو ہزار میں اس نے لی تھی نئی اور پندرہ سو میں دے کے چلا گیا"

"تبھی کہا تھا یہ کوڑیوں میں مل گئی مگر عارف کی موٹر کی سی ہو جائیگی"

"ہاں مگر اس میں روپیہ لگتا ہی چلا جا رہا ہے - اور سچے سنا عارف کہتا ہے کہ اس موٹر کو روپیہ میں تول کر سب روپیہ لگا دو تب بھی ٹھیک نہیں ہو سکتی"

"وہ تو اپنی جلن نکالتا ہے - بڑا لاٹ کا بچہ ہے نا - اپنی موٹر پر اتراتا ہے"

"تو اماں اب اس کی باتیں کہاں تک سنیں - اگر تیس روپیہ دیدو تو ایک نئی بیٹری لگوا لوں پھر زحمت نہ ہوا کرے گی"

"ہو نو - اب اور پیسے پھیکنے کی سوجھی - بچہ الگ کرو موٹر کو اور پڑھنا چھوڑو پڑھ چکے"

منیر میاں اگر رنجیدہ نہیں تو سنجیدہ ضرور ہو کر اپنے کمرے میں چلے آئے اور اپنی مسہری پر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے الماری کی طرف کروٹ لی اور آئینہ میں اپنے چہرہ کو دیکھتے رہے۔

کوئی آدھ گھنٹہ گذرا ہو گا کہ ان کے کان میں بٹو کی یہ آواز آئی "ابا آ گئے"۔ وہ اپنے کمرے سے باہر آئے تو دیکھا کہ ان کے والد برآمدے میں پہونچ گئے تھے۔ ان کی اماں باورچی خانہ کی طرف جا رہی تھیں اور بٹو روپیہ سنبھال کر اوڑھ رہی تھی۔ منیر میاں نے اپنے والد کو سلام کیا۔ والد کا ادھیڑ لمبا۔ گورا چہرہ بڑے نفیس انداز میں کھل گیا۔ منیر میاں کے والد نور میاں نہایت نفیس متین اور خوش قطع انسان تھے اور کپڑوں سے نہایت درجہ درست رہنا ان کا اہم ترین مسلک تھا۔ پیٹنٹ کا پمپ جوتا۔ چک موزے۔ سفید چوڑی دار پاجامہ، عمدہ سبزی مائل رنگ کی شیروانی اور سر پر نہایت صاف سخت نمدے کی ترکی ٹوپی ان کو شاندار اور نفاست پسند شخص ظاہر کر رہے تھے۔ وہ برآمدے سے اپنے کمرے میں گئے جہاں مسہری پر پلنگ پوش سے ڈھکا ہوا بچھونا تھا اور اس سے ملا ہوا ایک تختوں کا چوکا تھا۔ انھوں نے شیروانی کے بٹن کھولے اور منیر میاں نے بڑھ کر شیروانی اتروائی۔ وہ مسہری پر بیٹھ گئے اور بٹو نے آ کر ان کے موزے اتارے۔ منیر میاں نے شیروانی دیوار پر کھونٹی میں ٹانگ دی۔ نور میاں نے اپنی ٹوپی اتار کر مسہری کے سرہانے رکھ دی۔ اتنے میں ان کی بیوی دسترخوان لئے ہوئے آئیں اور تختوں کے چوکے پر بچھایا۔ نور میاں آ کر دسترخوان پر بیٹھ گئے، نصیبا سینی میں کھانا لئے ہوئے آئی اور دسترخوان پر چن دیا۔ نور میاں اور ان کی بیوی کھانا کھاتے رہے اور دو نوکرنیاں خدمت کے لئے حاضر رہیں۔

کھانا کھانے کے بعد نور میاں مسہری پر لیٹ گئے۔ ان کی بیوی تخت پر ان کے پاس بیٹھیں اور منیر میاں چوکے کے ایک کونے پر بیٹھے، بٹو بیچ چوکے میں بیٹھ کر پان لگانے لگی۔

نور میاں نے مسہری پر اپنی بیوی کی طرف کروٹ لی اور بولے: "بھئی وہ زمیندار صاحب جلدی کر رہے ہیں میں کہتا ہوں اس سال امتحان تو دے لے۔"

"ٹھیک تو جلدی کر رہے ہیں۔ امتحان اب آگے پڑھانے کی کیا ضرورت ہے"
یہ باتیں سن کر منیر میاں کمرے سے کھسک گئے۔ بٹو پان لگا لگا کر ڈبیہ میں رکھتی رہی۔ اسی وقت نصیبنا ایک لوہے کا کیش بکس لے کر آئی اور بولی "میاں بھولے نے بھجوا دیا۔ کہا میاں ہی کو دیجیو"
"ہاں بیوی اس بکس میں کوئی چودہ سو روپئے ہیں۔ تم میری شیروانی سے کنجی نکال کے روپئے اس میں سے نکال لو اور بکس بھولے کو واپس بھجوا دو"
ان کی بیوی نے نصیبنا کی طرف رخ کر کے کہا "رکھ دے یہاں" اور وہ کیش بکس تخت پر رکھ کر جانے لگی تو نور میاں بولے "ارے ہاں نصیبنا بھولا سے کہو کہ کھانا کھا کے آصف میاں کو بلا لائے کہے کہ ضروری کام ہے"
نور میاں کی بیوی لپک کر گئیں اور شیروانی سے کنجی لا کر کیش بکس کو کھولنے لگیں۔ بکس کھول کر وہ بولیں "یہ سو سو کی گڈیاں ہیں" پھر گن کر بولیں "چودہ ہیں" اور سب کو اپنے دوپٹہ میں رکھ کر آنچل اس طرح سنبھالا کہ تمام نوٹ دوپٹہ میں ان کے سینہ پر رکھے ہوئے دکھائی دئے۔
وہ اپنے میاں کی طرف رخ کر کے بولیں "ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ یہ اے۔ یم۔ ٹیں۔ یس پڑھانے سے کیا فائدہ روپیہ خراب کرنا"
"ہاں۔ ایم۔ اے تو وہ لوگ کرتے ہیں جنھیں ماسٹری کرنا ہو۔ منیر کے لئے تو ڈپٹی کلکٹری ہی موزوں ہے اور اس میں بی۔ اے ہی لئے جاتے ہیں اور نواب منظور علی خاں صاحب ہمیشہ کہتے ہیں کہ ماشے اللہ سے چہرہ سے ڈپٹی کلکٹر معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ابھی دو سال تک اس میں عرضی نہیں دے سکتے عمر کم ہے۔ عارف اور یہ برابر ہیں نا ؟"
"ہاں آپا کے ہیاں یہ ہوا اور اس کے کوئی مہینہ بھر کے بعد منیر ہوا ہمارے ہیاں"
"تو اب وہ ایم۔ اے کر رہا ہے تو منیر ایم۔ اے نہ کرلے۔ اور منیر چاہتا بھی تھا تاکہ وقت خراب نہ ہو"
وقت خراب۔ وقت کہیں بھی خراب نہیں ہوتا۔ پیسہ خراب ہو رہا ہے۔ ایک وہ

موٹر ہے روز دس پانچ اس میں لگتے رہتے ہیں۔"

"واہ تم یہ نہیں سمجھتیں کہ عارف تو موٹر پر کالج جائے اور منیر وہی سائیکل پر یا تانگے پر۔"

"اسی لئے تو پڑھنا ختم ہو یہ موٹر کا جنجال جائے۔"

اب بٹو نے پان کی ڈبیہ بھر لی تھی اور وہ اسے اپنے والد کو دیتے ہوئے ہنس کر بولی "موٹر کیا ہے عذاب جان ہے۔ اس دن ہم لوگ شاہ مینا صاحب گئے تو رستے میں کئی جگہ دھکیلی گئی" اور وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔

"بیٹی اپنی چیز پر یوں نہیں ہنسا کرتے۔ بلکہ اس کے عیوب کو ڈھانکنا چاہیے۔ عیب پوشی بڑا وصف ہے۔"

"یہاں تو کوئی ہے بھی نہیں جس سے یہ عیب ڈھانکا جائے"

"کیوں نہیں۔ یہ نوکرنیاں ہیں۔ سب میں جا کے کہتی پھریں گی"

بٹو چپ ہو گئی۔ اس کی ماں نے آنکھیں پھیر کر اس کو دیکھا۔ وہ کمرے سے برآمدے میں آکر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی اور رسالہ پڑھنے لگی۔

نور میاں نے زور سے آواز دی "منیر یہاں آؤ" اور منیر اپنے کمرے میں سے نکل کر برآمدے میں ہو کر ان کے پاس آئے تو وہ بولے "تمہاری موٹر چلتی تو ٹھیک ہو گی۔ یہ دقت کیا ہے ؟"

"اس میں ایک بیٹری کی ضرورت ہے۔ پھر اسی طرح چلنے لگے گی جیسے عارف کی"

"تو بیٹری لگوا لو اپنی ماں سے روپئے لیکر"

"ہونھ۔ تم بڑے واجد علی شاہ بنے ہو۔ شاہی حکم دے دیا۔ روپئے خراب کرنے کو" منیر کی ماں جھلا کر بولیں۔

"نہیں" نور میاں نے کہا "موٹر ہے تو اس کا سب ٹیم ٹام درست ہونا چاہیے"

"اور عارف ہنستا ہے۔ طعنے مارتا ہے" منیر میاں نے کہا۔

"دیکھو ہمارے لڑکے کی بات ہیٹی ہوتی ہے۔ تمہاری آپا کے میاں جج ہو گئے تھے تو کیا۔

ہم کبھی ان سے دب کر نہیں رہے۔ دیو روپئے جتنے بھی مانگے بیٹری کے لئے"

منیر اپنے کمرے میں چلے آئے اور ان کے والد اور والدہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔

چار بجے کے بعد آصف صاحب اور عارف آئے۔ دونوں نے اپنے خالو اور خالہ کو سلام کئے۔ نور میاں بولے "میاں آصف۔ گوکل پرشاد نے ایک رائے دی ہے۔ اس کے متعلق تم سے بھی کچھ کہنا ہے۔ آؤ۔ یہاں بیٹھو تخت پر...... تم بیوی برآمدے میں جاؤ"

منیر کی ماں اپنا پاندان اٹھاتی ہوئی اور "آؤ عارف" کہتی ہوئی برآمدے میں آئیں۔ عارف بھی ساتھ آیا اور بٹو کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ بٹو بستر سے لگی ہوئی بیٹھی تھی اور رسالہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ عارف نے اس سے رسالہ لیتے ہوئے کہا "یہ مست قلندر! خیر اردو میں سب ہی رسالے ایسے ہی ہیں۔ خیر پڑھتی تو ہو۔ باجی منیر کے بجائے تم کو پڑھانے کی ضرورت تھی۔ غلطی اللہ میاں ہی سے ہونی تھی۔ اللہ میاں نے تو تمہیں اور ان کو دونوں کو ٹھیک بنانے کا حکم دیا تھا مگر یہ فرشتے لوگ گڑبڑ کر گئے۔ تم کو لڑکی اور ان کو لڑکا بنا گئے۔ ہاں اللہ میاں کو چاہئے تھا کہ روح پھونکتے وقت ذرا غور سے دیکھ لیتے کہ......"

منیر کی ماں بولیں "تم لگے پھر چھچھوری باتیں کرنے"

"تو پھر آپ بتائیے خالہ جان جو باتیں وہ کی جایا کریں آپ کے یہاں آکر"

"یہاں بیٹری کی باتیں ہو رہی تھیں" منیر کی والدہ بولیں اور اپنی آنکھوں کو اس انداز سے پھیر کر مسکرائیں جیسے کہ کوئی بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہو"

عارف ہنسا اور زور سے بولا "ارے منیر باہر نہیں آتے۔ کیا سو رہے ہو یہ کوئی وقت ہے۔ اچھا شادی کے سلسلہ میں ابھی سے مانجھے بیٹھ گئے"

منیر اپنے کمرے سے برآمدے میں آئے اور اپنی ماں کے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ عارف نے ان سے پوچھا "ارے یہ بیٹری سے کیا فائدہ تمہاری گاڑی تو ۲۲ء کی ماڈل ہے میگنیٹو سے چلتی ہے"

"کیوں۔ سلف اور روشنی کے لئے تو بیٹری ہے اس میں۔ نئی بیٹری سے سلف سے

اسٹارٹ ہو جایا کرے گی کھٹ سے"

"اس کا سلف چلتا بھی ہے۔ اور سلف سے انجن میں کیا دم آجائیگا۔ اچھا تو یہ ہو کہ
بیٹری کے بجائے دو بیل لے لو۔ گاڑی میں جوت دئیے اور ما سٹیرنگ کرتے چلے جارہے ہیں۔ آخر
بیل گاڑی تو ہو نہیں جائے گی رہے گی موٹر ہی"

"میکر تو تمہاری موٹر سے اچھا ہے اس کا"

منیر کی ماں آنکھیں پھیر کر پھر فاتحانہ انداز میں مسکرائیں

عارف نے کہا "بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ مگر ہمارا کلیہ صحیح ہے کہ اگر اس کو روپیہ میں تول
کے سب روپیہ اس میں لگادو، تب بھی ہماری موٹر کی طرح وہ نہیں چل سکتی۔ مگر ہاں یار وہ گاڑی
ہے صحیح معنوں میں گاڑی بس جگہ جگہ گڑ گڑ جاتی۔ ہماری گاڑی گاڑی کہلانے کی مستحق نہیں۔
وہ موٹر ہے یعنی چلتی ہوئی چیز۔ اس معنے میں تمہاری گاڑی سے زیادہ گاڑی تو اسی کباڑی کے
یہاں ملیں گی۔ جہاں سے تم اسے لے آئے تھے"

اتنے میں نور میاں کی آواز آئی "میاں عارف یہاں آؤ کیا گڑ بڑ سڑ بڑ باتوں میں پڑ گئے"
عارف کمرے کے اندر گیا تو وہ بولے "کیوں میاں تمہاری موٹر بارہ بنکی تک صحیح
سلامت چلی جائیگی" اور ان کے چہرہ پر طنزیہ مسکراہٹ نمایاں ہوئی۔ عارف فوراً سمجھ گیا کہ
اس نے جو کچھ منیر کی گاڑی کے بابت کہا اس کو نور میاں نے سنا اور اب اس سے بدلہ لے رہے
ہیں اور اس لئے فوراً بولا "ہرگز نہیں۔ میری گاڑی ککریل تک بول جائے گی۔ منیر میاں کی
گاڑی میری سے اچھی میکر ہے اور اب اس میں نئی بیٹری لگے گی تو وہ ہوا پر اڑتی جائیگی سڑک
سے چھوئے گی بھی نہیں"

"منیر یہاں آؤ" اور منیر کمرے میں آگئے تو ان کے والد بولے "تم اپنی موٹر میں آج ہی بیٹری
لگوالو اور کل دس بجے کے بعد آصف میاں کو بٹھائے لئے چلے آؤ۔ کالج گول کرو"

"مگر وہ بیٹری آج تو ملے گی نہیں۔ چوبیس گھنٹے چارج ہونے کی تب لگائی جائیگی"

"تو بیٹری کو جانے دو۔ یوں ہی لے جاؤ۔ اما ہوا پہ نہ جائیگی ٹرک ٹرک چلی ہی جائیگی اس پرانی بیٹری پر بھی"

منیر میاں نے کھسیا کر پہلے عارف کو اور پھر اپنے والد کو دیکھا۔ آصف میاں نہایت سنجیدہ طریقہ پر مسکرائے اور مدبرانہ لہجہ میں بولے "خالو جان۔ ان لڑکوں میں سے کوئی اپنی موٹر نہیں لے جائیگا۔ آپ آج رات ٹھہر جائیے۔ کل یہاں چیف کورٹ میں دس بجے ایک اپیل داخل کر کے آپ ہی کے موٹر میں چلا چلوں گا"

"بھئی میں راجہ صاحب سے کہہ آیا تھا کہ آج ہی شام تک آجاؤں گا۔ اور پھر دوسری موٹریں ٹھیک نہیں ہیں۔ انھوں نے خاص اپنی سواری کی موٹر مجھے دے دی انہیں ضرورت ہوئی تو کیا ہوگا"

"اچھا۔ میں لاری سے آجاؤں گا"

"آپ کو پہونچنا کس وقت ہے بھائی جان؟" عارف نے پوچھا۔

"لنچ کے بعد مقدمہ پیش ہوگا"

"لیجئے۔ میں سب معاملہ ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ میں آپ کو چیف کورٹ لے چلوں گا۔ وہاں آپ اپیل دائر کیجئے۔ پھر میں کالج آؤں گا۔ وہاں میں اتر جاؤں گا۔ آپ موٹر لے کے بارہ بجکی تان دیجئے۔ میں کالج سے گھر منیر کی موٹر پر آجاؤں گا۔ اس پر آج تک میں بیٹھا بھی نہیں ہوں"

منیر میاں ایکدم سے بولے "میں کل کالج نہیں جاؤنگا بیٹری کا انتظام کرنا ہے"

"اچھا نہ بٹھاؤ گے اپنی موٹر پہ کبھی۔ خیر ہم کو بہت گھر پہونچانے والے مل جائیں گے.....

ہاں اور بھائی جان ہماری موٹر اگر گلگریل سے آگے ٹھپ ہو جائے تو ؏

ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

یعنی بیل گاڑیاں بہت سی رستے میں آتی جاتی ملیں گی۔ کسی کے بیل لے کے جوت دیجئے گا موٹر میں اور ڈیڑھ بجے تک تو پہونچ ہی جائیگا"

نور میاں کا ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ عارف کو خاموش کرنے کے لئے انہوں نے کہا "اچھا جاؤ تم اپنی خالہ کے پاس بیٹھو۔"

کافی دیر کے بعد جب عارف اپنے بھائی جان کو موٹر پر ساتھ بٹھائے ہوئے واپس آرہا تھا تو اس نے کہا "بھائی جان آپ دیکھتے ہیں کہ بٹو باجی کو چھوڑ کر اس سارے گھر کا مقصد حیات یہ ہے کہ ہماری ضد میں ہر کام کریں۔"

"ہاں خالہ صاحب پیٹرونائز کرنا چاہتے ہیں ہم لوگوں کو۔ خیر ہمیں تو اپنا الو سیدھا کرنا ہے ان سے مقدمے ملتے ہیں ریاست کے۔ تم آزاد ہو۔"

"مجھے ان کا یہ ایٹی ٹیوڈ ہرگز نہیں پسند۔ خیر جانے دیجئے تفریح ہو جاتی ہے کبھی کبھی یہاں آکر۔"

"اور تم نے سنا نہیں۔ تم پر بھی دست شفقت زور سے رکھنا چاہتے ہیں۔"

"کیسے بھائی جان"

"تم تو برآمدے میں تھے مجھ سے چپکے سے بولے بھائی میں تم لوگوں کا بہی خواہ ہوں۔ دیکھو یہ سب جائداد اپنے گھر میں آجائے تو اچھا ہے۔ بڑی بہن سے تو منیر کی منگنی ہو چکی ہے۔ چھوٹی سے عارف کی ہو جائے۔"

"اچھا یہ ریاست کی سیاست ہے۔ مگر آپ نے کیا کہا بھائی جان"

"میں نے کہا کہ میں اوّل تو ہر طرح خود عارف کی رائے شادی کے معاملے میں مقدم سمجھتا ہوں اور پھر عارف پر میرا کوئی احسان نہیں والد کی جائداد اور روپیہ میں اس کا میرا برابر کا حصہ ہے وہ اپنا کھاتا ہے خرچ کرتا ہے۔"

"یہ بھائی جان آپ کیا کہا کرتے ہیں ہر ایک سے۔ آپ باپ سے زیادہ بہتر ہیں۔ ع

ماں باپ سے سوا ہے شفقت تیری

آپ کے راج میں وہ آزادی اور لطف ہے جو باپ راج میں نہ ملتا۔ ہرگز نہ ملتا!"

"خیر سنو۔ تو میں نے کہا کہ میں عارف کی رائے ضرور لونگا اور جو وہ کہے گا آپ کو بتاؤں گا۔"

"میری رائے تو آپ بغیر پوچھے ہی جانتے ہیں بھائی جان"

"میری رائے بھی وہی ہے جو تمہاری ہوگی۔ مگر اس میں ایک پیچ ہے تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں"

"وہ کیا؟"

"جہاں منیر کی منگنی ہوئی ہے ان لوگوں کو میں جانتا ہوں۔ لڑکیاں تم لوگوں سے کہیں بڑی ہیں اور بدصورت ہیں اور زمیندار صاحب کے پاس اول تو کچھ ہے وے نہیں اور ہے بھی تو لڑکے بھی تو ہیں کئی عدد۔ ملے گا کیا انہیں خالو صاحب کو جو ڈینگیں ہانکتے پھرتے ہیں ہر ایک سے یہ ایسی اونچی جگہ ہے اور یہ ملے گا اور وہ ملے گا۔ تم تو جانتے ہو۔ کتنا شاعرانہ مزاج پایا ہے خالو جان نے ہمارے "قطرے کو جو دیں آب تو گوہر سے ملا دیں" اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے وہ احمق نواب محبوب عالم کے والد نواب منظور علی خاں صاحب بہادر۔ تو یہ معاملہ ہے تو میں تو ہرگز یہ گوارہ نہیں کر سکتا کہ اس میں تم پھنسو۔ اگر تمہاری خود کی رائے بھی ہو تو میں تم کو پورا معاملہ سمجھا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں"

"ٹھیک ہے بھائی جان"

"اور پھر یہ بھی کہتے پھریں گے کہ بدتمیز ناکارہ لڑکا ہے۔ خرد ماغ۔ میں نے شادی کرا دی نہیں تو کوئی شادی بھی نہ کرتا"

غرض یوں ہی باتیں کرتے ہوئے اپنے گھر پہونچ گئے۔ آصف صاحب نے اپنے کمرے میں جا کر اپنی چھڑی لی اور ٹہلنے نکل گئے۔ عارف موٹر پورٹکو میں چھوڑ کر گھر میں دوڑتا ہوا آیا اور پکارتا ہوا "بھابی۔ بھابی۔ تم نے سُنا"

بھابی کے سب بچے اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ بھابی برآمدے میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی طرف دیکھ کر بولیں "آخر یہ کیا پاگل پن ہے۔ گھر میں آ رہے ہیں جیسے بگولا"

عارف بھابی کے پلنگ کے پاس پہونچ کر بولا "ہاں بھابی تم کو دیکھ کر میں بگولا ہو جاتا

ہوں اور بگولا کا کام کیا۔ جو کوئی اُس کے لپیٹ میں آجائے اُسے اٹھائے ہوئے آسمان پر لئے چلا جائے بس میں بگولا یوں ہی بن جاتا ہوں کہ تم کو اٹھا کر آسمان کی طرف لئے ہوئے چلا جاؤں۔ مگر بھابھی ایسے میں خیر ہے۔ اب بھی سویرا ہے۔ اب بھی تم اپنی رائے دیدو۔ نہیں میں ہاتھ سے نکلا۔ سمجھ لو ع

مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے"

"آخر بات کیا ہے یا پہیلیاں بوجھوا تا ہے"

"اچھا بوجھو بھابھی کیا ہونے والا ہے جو میں تمہارے ہاتھ سے نکلا"

"جا۔ اُدھر" بھابی نے اپنی آنکھیں ٹیڑھی کرتے ہوئے کہا "میں نہیں بوجھتی تیری پہیلی"

"اچھا لو۔ سنو۔ تم ہم کو بالکل نہیں چاہتیں تم ظالم بے درد معشوق ہو جیسے سب معشوق ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی بات ہی نہیں۔ اب بتاؤ کہ ہم کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہنے والی عورت کون ہو سکتی ہے"

"میں کیا جانوں تو کس سے آنکھ لگاتا پھرتا ہے باہر"

"پھر اپنی حماقت پر آنے لگیں تم بھابھی۔ خیر۔ جانے دو۔ تم نے مثل سنی ہو گی ماں مرے موسی جئے" تو اب ہماری ماں کے بعد خالہ جان سے زیادہ چاہنے والی دنیا میں کون ہو سکتی ہیں اور ان کے میاں بھی اپنی بیوی کی محبت میں کتنی شفقت کرتے ہیں ہم لوگوں پر۔ بھائی جان کی تو اپنے حساب روٹی ہی چلاتے ہیں وہ اور اب ہم پر بھی بقول بھائی جان زور سے دست شفقت رکھنے والے ہیں۔ بھائی جان بھی بعض وقت زور کا مذاق کر لیتے ہیں۔ ہیں نہ آخر ہمارے بھائی جان، نہیں تمہارے میاں۔ تمہارے عشق ہی سے ہم میں اتنی شوخی آگئی وہ تو بھلا میاں ہیں"

"تو بات بھی بتائیگا کہ یوں ہی مجھے بناتا چلا جائیگا باتوں سے"

"تجھے نہیں۔ یہ گھماؤ ہیں بھابھی۔ میں اس وقت بگولا ہوں اسی لئے میری باتیں بھی چکر کھا رہی ہیں۔ خیر بات یہ ہے کہ خالو جان نے بھائی جان سے کہا کہ جب لڑکی کے ساتھ منیر کی شادی

ہو رہی ہے اس کی چھوٹی بہن سے میری یعنی تمہارے عاشق نامراد کی شادی کر دی جائے۔ بھائی جان سولہ دں آنے راضی۔ میں بھی مرتا کیا نہ کرتا۔ آخر شادی ہونا بھی ایک فرض ہے خدا کی طرف کا تم کبھی ہونا۔ تو مجھے بھی راضی ہونا ہی پڑے گا۔ بس اب تمہاری رائے ہے جو پلٹ سکتی ہے۔ معلوم ہے تم کیا جواب دو گی اسلیئے ہم اپنی رضامندی دے چکے ہیں مگر ایک بار اور اتمام محبت کے لئے تم سے پھر کہتے ہیں کہ تم راضی ہو جاؤ تو ہم اب بھی پلٹ سکتے ہیں۔"

"اچھا تو تم لوگ خالہ کے یہاں اسی لئے بلائے گئے تھے"

"بلائے ہم اپنے سر کے لئے گئے تھے۔ تم ہماری بات کا جواب دو۔ یہ کیا ہم کہیں کھیت کی تم کہو کھلیان کی"

بھابی کا بھولا ہوا مُنہ اور پھول گیا۔ ان کے ماتھے پر شکن آئی اور ان کی آنکھیں کچھ اور چھوٹی ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولیں "تو یہ ترکیبیں ہیں۔"

"ہونھ یہ تو تم بے وقت اور بلا ضرورت فلسفی بن گئیں۔ یہ وقت عمل کا ہے عمل کا جلدی سے رائے قائم کرنے کا۔ بس تم ہاں کہدو۔ بس میں فوراً بھائی جان کی وہاں شادی کرا دوں اور تم سے......"

"چپ بدتمیز۔ میرے سر میں درد ہونے لگا۔ جا تو اپنے کمرے میں بیٹھ کر پڑھ رات ہو رہی ہے۔"

"اف فوہ" کہہ کر عارف اپنے بھتیجی بھتیجوں کی طرف متوجہ ہوا جو سب کے سب اس کی باتوں کو تعجب سے سُن رہے تھے اور بولا "آؤ لڑکی لڑکوں چلو۔ تماشا دکھا لائیں۔ بائیسکوپ سینما ابھی وقت ہے۔ اماں کے سر پر تمہاری جنات آ رہے ہیں۔ بھوت پلیت۔"

بھابی مُسکرا دیں عارف نے کہا "چلو بھابی تم بھی چلو"

"میں نہیں جاؤں گی"

"تم نہیں جاؤ گی تو ٹکٹوں کے پیسے کون دے گا اور پھر سینما میں ہی تو آجکل راضی کیا جاتا ہے معشوقوں کو۔ ہاں"

بھابی نے پلنگ سے اُٹھ کر اس کی پیٹھ پر ایک گھونسا مارا۔ عارف بولا "بس فتح ہے"۔
بھابی برقع اوڑھ کر اس کے ساتھ ہولیں اور سب بچے بھی۔

(۴)

نواب سید محبوب عالم صاحب بہادر رضوی بی۔ اے عارف سے خفا تھے۔ اس خفگی کی وجہ سمجھنا ہر کہہ ومہ کے لئے آسان بات نہیں۔ اس میں بڑے ہی غور کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ساتھ شہر لکھنو کی آب وہوا، گومتی دریا کے پانی، وہاں کی مخصوص تہذیب سے پشت در پشت واقفیت کی ضرورت ہے۔ اس کو عارف بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ حالانکہ وہ لکھنو ہی میں پیدا ہوا یہاں ہی کی آب وہوا میں پلا مگر پھر بھی اودھ کے دیہاتی خاندان سے تھا۔ اس کو سمجھنے کے لئے نواب سید محبوب عالم صاحب بہادر رضوی بی۔ اے کے ایک ایک حرف پر نہیں تو کم از کم ایک ایک لفظ پر غور کرنا بالکل ضروری تھا۔ پہلا لفظ نواب لیجئے۔ جس شخص کا نام اس لفظ سے شروع ہو اس کے لاشعور میں ان تمام محرکات کا موجود ہونا ضروری ہے جو نواب شجاع الدولہ سے لے کر نواب واجد علی شاہ تک ہر نواب کی فطرت میں کارفرما تھے۔ پھر سید لیجئے۔ اس مسئلہ کو یوں نہ دیکھیے کہ اُن تاریخی افراد کے خاندان کا فرد جن کو تاریخ میں ہر جگہ مغل کہا گیا ہے کیسے سید ہو سکتا ہے کیونکہ یہ معاملہ مذہب کا ہے اور مذہب میں چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ خاندان سے کوئی مطلب نہیں عقیدہ یہ کہتا ہے کہ ہر آل رسول کو ماننے والے کے لئے اپنے تئیں آل رسول میں گنوانا ضروری ہے۔ چنانچہ جس فرد کے نام میں سید شامل ہو اس فرد کے دماغ میں مذہبی آسمانی یا روحانی اثرات کا کارفرما ہونا بھی ضروری ہے پھر محبوب پر آئیے اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ جس کسی کو یہ نام دیا جائے اس کی فطرت میں جو کچھ کرشمے نہ کارفرما ہوں وہ تھوڑے ہیں۔ اور واضح رہے کہ عالم بھی محبوب کے ساتھ ہے اور اس عالم کو بھی سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ یوں تو تمام دنیا کو عالم کہہ دیا جاتا ہے مگر اصل میں تمام عالم کا نچوڑ شہر

لکھنو ہے جو عالم کا مرکز ہے، عالم کا نمونہ ہے اور عالم کا کامل نمائندہ ہے۔ اب آئیے صاحب پر
اور یہ نہ بھولیے کہ حکومت انگریزی کی ہے اور اس کو صاحب کہا جاتا ہے اور اس کی عملداری میں
رہ کر اصول زندگی یہ ہونا ضروری ہے کہ جو صاحب کہے اس کو جھٹ کیجئے اور پھر بہادر بھی
ہے سمجھ لیجئے کسی لینڈی بوچی سے بہر دکار نہیں کمیندانیاں اور رسالداریاں اور سپہ سالاریاں
سب ہی اس لفظ میں مضمر ہیں اور جس شخص کے نام میں یہ لفظ شامل ہو اس کے لئے اور باتوں
کے علاوہ یہ بات بھی ضروری ہے کہ جان دے دے اور ہار کبھی نہ مانے اور پھر رضوی بھی
ہے اور یہاں پھر مذہب کا سوال آجاتا ہے جس میں راضی برضائے خدا پر عقیدہ کے معنے یوں
سمجھئے کہ جو رضوی کی رضا ہو اس پر خدا کا راضی ہونا ضروری ہے۔ آخر میں یہ بھی نظر انداز نہ کیجئے
کہ اس نام میں بی۔ اے بھی شامل ہو چکا ہے یعنی اس نام کا فرد جیسے بھی ہیں مگر اس دور کی تعلیم کو
مکمل کر چکا ہے۔ یہاں ایک نہایت ہی سرسری غور کا نہایت ہی سرسری خاکہ پیش کیا گیا بس صرف
اس امید کے ساتھ کہ آپ اس طریقہ پر زندگی بھر غور کرتے رہیں گے۔ تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ نواب
سید محبوب عالم صاحب بہادر بی۔ اے کی عارف سے خفگی کی وجہ کیا تھی۔ ورنہ ان دونوں کی
آخری ملاقات کو یاد کر کے آپ ہر غیر لکھنوی یعنی دیہاتی کی طرح یہی کہیں گے کہ عارف نے جو جتو
نواب کو نرملا سے محض عشق برائے عشق کا مشورہ دیا تھا اس میں جتو نواب کو کسی طرح خفگی کی گنجائش
نہیں تھی۔ جتو اور عارف کی آخری گفتگو کو یاد کیجئے اور دیکھئے کہ عارف کی باتوں سے نواب سید
محبوب عالم صاحب بہادر رضوی۔ بی۔ اے کے ہر ہر لفظ کو ٹھیس نہیں لگتی۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ
وہ عارف سے خفا نہ ہو جاتے۔

غرض انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ عارف اس قابل نہیں ہے کہ اس سے بات کی جائے۔
چنانچہ کالج میں شعبۂ انگریزی کی طرف وہ نرملا کو دیکھنے تو بدستور جاتے رہے مگر ساتھ ساتھ یہ بھی
احتیاط برتتے کہ عارف کبھی سامنے نہ ہو اور اگر ہوا تو فوراً نہایت ہوشیاری سے کترا جاتے۔
ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے پروفیسر نمبر ۲ پر یہ ظاہر کر دیا کہ انہیں عارف سے دلی نفرت

ہوگئی اور پروفیسر کے لکچروں کا موضوع اب زیادہ تر عارف کو گالیاں دینا رہ گیا تھا۔ جمو نواب کا ان لکچروں میں اسقدر دل لگنے لگا تھا کہ لکچر سنتے وقت نرملا کا تصور ان کے ذہن سے غائب ہو جاتا۔ پھر منیر میاں سے انہوں نے کہہ دیا تھا "عارف تمہارے پیر کی خاک کے برابر نہیں ہو سکتا" اور منیر میاں عارف کی طرف بات بات میں تک بے تک بُرے اشارے کرنے لگے تھے، جس سے جمو نواب کو بڑی تسکین ہوتی۔ اکثر منیر میاں کی صدارت میں مرزا اور مصاحب بھی عارف کی برائیوں کو موضوع بنا کر تقاریر کرتے اور جمو نواب معزز حاضرین کا مجسمہ بنے ہوئے ان تقاریر پر دل ہی دل میں تالیاں بجاتے۔

اس وقت یہ بتانا مشکل تھا کہ ان کے ذہن میں نرملا سے محبت کا جذبہ یا عارف سے نفرت کا جذبہ زیادہ کار فرما تھا۔ شاید دونوں جذبے آہرمن اور آہر مزدہ کی طرح مدمقابل چل رہے ہوں کیونکہ تبرے اور تلوے کے بیک وقت وجود پر عقیدہ اُن کے ایمان کا اہم ترین جزو تھا۔ غرض اس عالم میں وہ ایک دن اپنے مخلص ترین دوست راغب حسین زیدی کے یہاں پہونچے۔ راغب صاحب کا مکان ایک بند گلی کے بالکل ختم پر واقع تھا اور اس سے انہوں نے یہ فائدہ اٹھایا تھا کہ اپنے دروازے کے سامنے سے لیکر ملحق مکان کے دروازے تک آگے حصّہ کو وہ بلا مزاحمتِ غیرے سہ پہر سے شام تک اپنا بیٹھکا بنا سکتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ اپنے اسکول سے آکر نمازِ ظہرین سے فارغ ہوتے اپنے گھر میں سے چار پرانی بید کی جگہ لکڑی لگی ہوئی کرسیوں کو لا لاکر گلی میں رکھتے اور ان میں سے ایک ہتے دار کرسی پر بیٹھ کر وظیفہ ختم کرتے رہتے تھوڑی دیر کے بعد نقوی اور عباس علی بھی آ آکر ایک ایک کرسی پر بیٹھ جاتے اور دنیا کے ہر موضوع پر باتیں ہوا کرتیں۔ آج جب جمو نواب اس بند گلی میں مڑے تو انہوں نے اپنی ایک آنکھ سے زیدی کو دیکھا اور دوسری سے پہلے نقوی اور پھر عباس علی کو دیکھا۔ زیدی کا رُخ ان کی ہی طرف تھا اور ان کو آتا دیکھتے ہی وہ بولے "آؤ بھائی محبوب آج کافی دنوں میں آئے۔ السلام من علیک"
جمو نے جاکر چوتھی کرسی جو خالی تھی اسے سبنھالا۔ نقوی نے ان کو اپنی گرہ کٹ والی نگاہ

سے دیکھتے ہوئے پوچھا "آج کیسے ادھر، کیا وہ تمہاری کسی اور کے ساتھ چل دیں"
"چہرہ سے کچھ زیادہ افسردہ معلوم ہوتے ہو۔ کہیں کوئی واردات تو نہیں ہوگئی" عباس علی بولے
"ہاں کہیں پٹ وٹ تو نہیں گئے" نقوی نے کہا
"نہیں بھائی ایک عجیب معاملہ ہے جس میں راغب صاحب کا مشورہ لینے آیا ہوں"
"کیا بات ہے؟" راغب صاحب نے نہایت مدبرانہ اور منتظمانہ انداز میں سوال کیا۔
"بات یہ ہے کہ عارف ہم دونوں کے رستے میں آرہا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ نرملا میری ہوجائے"
"عارف!" نقوی نے تعجب سے کہا پھر گردن ہلا کر بولے "ہاں بھائی کیوں نہ ہو اس کے گھر میں اس کے باپ کا اجارہ ہے"
"واہ کیا بات کہی تم نے اف فوہ" عباس علی بولے "تم سائنس داں ہی نہیں ادیب بھی ہو"
راغب صاحب نے عباس علی کو سخت نگاہ سے دیکھتے ہوئے جتو کو منکرانہ انداز سے دیکھا اور پوچھا "عارف! کیا عارف اسے اپنانا چاہتا ہے۔ اسے تو اس لڑکی سے رغبت نہیں تھی۔ ہاں اس کی بڑی بہن سے عشق تھا اور وہ آصف میاں ہمارے دوست ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ اگر ان دونوں کی شادی ہوجائے تو اچھا ہے جسٹس پریش کا سب مال متاع ہمارے گھر آجائیگا"
"تو ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی کو شہ دی ہو کہ بڑی مرگئی تو اب چھوٹی کو بو پہلے تو آدھا ہی ملتا اب سب کا سب مل جائیگا" نقوی بولے۔
"نہیں۔ نہیں" جتو نے اپنی گردن کو پینتالیس[۴۵] درجہ سے تیس[۳۰] درجہ پر لا کر پھر پینتالیس[۴۵] پر واپس لے جاتے ہوئے کہا "آپ پوری بات سن لیں۔ عارف کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ وہ کمار کو اس سے ملانا چاہتا ہے اور مجھے الگ کردینا چاہتا ہے"
"ارے میاں کیا معلوم" نقوی نے کہا "اس عارف کے کاٹے کا بھی کوئی منتر نہیں ہے یہ قوم کی قوم فطرتی ہے۔ وہ تم کو ہٹانے کے لئے کمار کو کھڑا کر رہا ہے اور اس کو ہٹا کر خود چھاپ

بیٹھے گا''، اور انہوں نے عباس علی کی طرف دیکھا۔

عباس علی بولے "وہ تو جہاں تک میں نے اندازہ کیا بالکل اکسنٹرک ہے۔ جو بھی نہ کر بیٹھے وہ تعجب ہے"

"اچھا یہ بتاؤ" راغب صاحب نے پوچھا "کہ نرملا میں بھی کوئی فرق پیدا ہوا کہ نہیں؟"

"یہی تو رونا ہے کہ وہ بھی اب کچھ کھنچنے لگی ہے مجھ سے۔ جیسے آج بھی تھا میں بیٹھا ہوا تھا اتنے میں کمار آ گیا۔ وہ اس سے بڑی خوش ہو کے ملی اور تھوڑی دیر کے بعد اسے اپنے موٹر میں بٹھا کے لے گئی اور مجھ سے بولی "بائی بائی پھر ملیں گے"۔"

"بات تیری کی" عباس علی بولے "ان کسبیوں میں رنڈیوں میں کیا فرق ہے۔ ایک کو چھوڑا دوسرے کو پکڑا۔"

راغب صاحب مسکرائے اور ان کے سفید دانت کالے کالے ہونٹوں میں سے چمکے اور وہ بولے "اب میری سمجھ میں پورا معاملہ آ گیا۔ دیکھو بات یہ ہے کہ جب سے سید حسین اور وجے لکشمی والا معاملہ ہوا ہے نہیں تب سے سب ہندو چوکنا ہو گئے ہیں اور ان دونوں کو بھڑا کے گاندھی نے اپنی قوم کو یہ سبق دیا ہے کہ جن جن ہندوؤں کی لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے میل جول رکھتی ہوں وہ اس قسم کے میل جول کو ختم کر دیں۔ اس لئے مسٹر پریش نے اپنی لڑکی کو سمجھایا ہوگا۔"

"جی نہیں راغب صاحب" جعفر نے کافی ڈگمگا کر کہا "عارف نے میرے سامنے نرملا کا تعارف کرایا۔ پھر ایک دن میں عارف سے ایک کتاب لے کر نرملا کو دینے گیا اور دس کے عارف کے گھر آیا تو مجھ سے کہا گیا ہے کہ تم نرملا سے تعلق چھوڑ دو تمہاری قوم کے لئے عشق برائے عشق ہی زیبا ہے اور تمہاری خودی ہر دا نرم اسی میں ہے دیکھ دیکھ کے ترسے جاؤ۔"

"یہ پوری قوم پر حملہ ہوا۔" نقوی بولے "بڑا متعصب ہے۔"

"سنی ہو اور متعصب نہ ہو یہ تو ممکن ہی نہیں" عباس علی بولے۔ "بات یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ تم شیعہ ہو کے نرملا سے فائدہ اٹھاؤ۔ اور اگر اس نے تم سے شادی کر لی تو ایک شیعہ

اور بڑھ جائیگا اور بچے ہونگے تو شیعوں کی تعداد بڑھے گی۔

"تم بالکل ٹھیک سمجھے" نقوی نے کہا۔

راغب صاحب بولے "یہ بھی ہوگا۔ آصف صاحب تو بڑے متعصب ہیں۔ ہاں اب پورا معاملہ صاف ہوگیا۔ اُدھر مسز پریتش تم کو الگ کرنا چاہتی تھیں کیونکہ تم مسلمان ہو اور پھر انہوں نے یہ دیکھ کر کہ عارف تم سے نفرت کرتا ہے کیونکہ تم شیعہ ہو اس کو لگا دیا کہ وہ تمہیں زور ڈال کے یا سمجھا کے نرملا سے الگ کردے۔ سارا معاملہ یہ ہے"

"خوب خوب۔ آپ نے پورا معاملہ صاف کر دیا" نقوی بولے۔

"آپ کو تو ہیڈ ماسٹر ہو جانا چاہیے" عباس علی بولے۔

جو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں ہاں اتنا ضرور سمجھ رہے تھے کہ معاملہ بجائے صاف ہونے کے اور گنجلک ہوگیا۔

"چھوڑو بھی یار" نقوی نے کہا "اپنے گھر بیٹھو۔ اچھی بیوی سے دل بہلاؤ۔ تم بھی . . . . ."

مگر وہ رک گئے کیونکہ جو کے روتے ہوئے چہرہ پر مردنی کے سے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور وہ اپنی گردن بالکل ڈالے دے رہے تھے

راغب صاحب نے یہ حال دیکھ کر فوراً کہا "ہم تمہیں ایک ترکیب بتاتے ہیں۔ اب تم ایک کام کرو۔ خرچ تو ہوگا دس پانچ کا مگر کام تمہارا بن جائیگا۔ تم جب نرملا کے ساتھ ہوا خوری کو جاتے ہو تو نرملا خود چلاتی ہے موٹر یا ڈرائیور؟"

"کبھی وہ چلاتی ہے۔ نہیں تو ڈرائیور چلاتا ہے"

"بس تو ڈرائیور کو پٹا لو کچھ دے دلا کے اور اب کی جو ساتھ جاؤ تو تم اس سے کہو کہ ڈرائیور کو چلانے دے اور تم دونوں پیچھے بیٹھو پاس پاس۔ ڈرائیور تو تمہارا سمجھایا ہوا ہوگا ہی وہ موٹر اڑاتا ہوا کسی دوسرے شہر پہنچ جائیگا۔ تم نرملا کو باتوں میں بہلائے رکھنا تاکہ اسے راستے کا کوئی خیال ہی نہ ہو۔ کانپور، رائے بریلی، سیتاپور جہاں کہیں بھی وہ آسان سمجھے اپنے پہونچ جائے اور وہاں پہونچ کے

کسی بہانے سے ہو جائے غائب۔ اس کے مابعد تمہیں ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ تم پہلے ڈرائیور کو پکا کر کے مجھے بتاؤ اور اس سے یہ طے کر لو کہ کسی شہر کو جائیگا۔ میں اس شہر کو دہلی سے پہونچ جاؤں گا اور وہاں سب سامان ٹھیک کر لوں گا۔ تم دونوں کا نکاح کرا دوں گا پس سب مُنہ دیکھ کے رہ جائینگے۔"

نفوری اور عباس علی نے راغب صاحب کی علمی قوت کی بڑی تعریف کی اور مجنو کو اس اسکیم میں کامیابی کی جھلک ہی نہیں بلکہ تمام کائنات پر پھیلی ہوئی روشنی دکھائی دی اور وہ بولے "بھائی راغب صاحب آپ سے بڑا میرا کوئی دوست نہیں۔ میں کل ہی آپ کی اس اسکیم پر عمل کروں گا۔"

اور کل ہی اُنہوں نے اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ یہ تو انہیں احساس تھا کہ راغب صاحب سے اُنہوں نے یہ بالکل سفید جھوٹ کہہ رکھا تھا کہ نرملا انہیں اپنے موٹر پر ساتھ لے جایا کرتی ہے اس لیے راغب صاحب کی اسکیم کتنی ہی علمی سہی عمل میں نہیں آسکتی جب تک کہ یہ حالت ظہور میں نہ آجائے کہ نرملا اور وہ ساتھ ساتھ موٹر میں سیر کو جانے لگیں۔ مگر راغب صاحب کی اسکیم کی ایک بڑی خوبی ان کی سمجھ میں یہ آئی کہ نرملا سے قریب ہونے کی ایک صاف راہ اس سے نکلتی تھی۔ ڈرائیور نرملا تک پہونچنے کا بڑا اچھا ذریعہ ہو سکتا تھا اور لہٰذا اُنہوں نے یہ ٹھان لی کہ ڈرائیور کے ذریعہ وہ نرملا تک پہونچیں اور پھر دیکھا جائیگا۔ چنانچہ کالج میں اپنے پروفیسر نمبر دو سے چھٹی لے کر وہ موٹر اسٹینڈ کی طرف چلے۔ منیر سے قرض لیا ہوا ایک روپیہ ان کی جیب میں تھا اور اس میں سے کچھ پیسوں کے ذریعہ وہ ڈرائیور سے دوستی گانٹھنے کی سوچتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اسٹینڈ پر پہونچ کر وہ نرملا کی موٹر کے پاس گئے۔ موٹر کے اندر جھانک کے دیکھا تو ڈرائیور اگلی سیٹ پر لیٹا سو رہا تھا۔ پہلے تو اپنی رو میں اُنہوں نے سوچا کہ اسے جگا دیں۔ پھر خیال آیا کہ کہیں چونک کر مار دوا نہ بیٹھے تو بڑی ٹھہرے گی کیونکہ ان کی بہن قیصر کو جب کبھی بھی انور نے سوتے سے جگایا تو قیصر نے اُٹھنے کے بجائے اس کے چانٹا ہی رسید کیا تھا۔ ان کو بڑا ڈر لگا کہ کہیں ڈرائیور بھی ان کے ساتھ یہی عمل نہ کرے اور وہ اسے جگانے سے باز رہے۔ کافی دیر موٹر کا طواف کیا۔ موٹر کے

پیچھے جاکر نمبر کو ہلایا بھی۔ دل میں دعائیں بھی مانگیں کہ وہ جاگ جائے مگر کچھ نہ ہوا۔ ڈرائیور بدستور خراٹے لیتا رہا۔ پاس ہی عارف کی موٹر بھی کھڑی تھی اور انہیں یہ بھی خیال ہو رہا تھا کہ اگر گھنٹہ بج گیا اور عارف سے مڈبھیڑ ہو گئی تو پھر اس سے بولنا ہی پڑ جائیگا اور یہ بہت برا ہوگا۔ کچھ دیر عجیب شش و پنج کے عالم میں رہے۔ آخر جی کڑا کر کے اور دل میں یا علی مدد کہہ کے انہوں نے ڈرائیور کی ٹانگ ہلا ہی دی۔ وہ گھبرا کے اٹھا اور ان کے چہرہ کو دیکھتا ہوا بولا "آپ کون ہیں۔ مجھے کیوں جگایا۔ میں سمجھا مس بابا۔ آپ کو میں نہیں جانتا" اور یہ کہکر پھر لیٹنے لگا۔ جبو نے ہنایت درجہ لجھیا کے کہا ہم نے کہا کہ بھائی ذرا پان سگریٹ پی آتے :۔

"آپ ہیں کون میں آپ کو نہیں جانتا۔ مجھے کلینہ کی ضرورت نہیں"

"ارے بھائی۔ میں یہاں پڑھتا ہوں۔ تمہاری مس بابا کے ساتھ"

"تو آپ کا مجھ سے کیا کام۔ ہے کے مجھے جگا دیا سوتے سے۔ جائیے آپ پڑھئے۔ آپ نہیں جاتے تو میں بڑے ماسٹر سے جاکر شکایت بولوں گا کہ مجھے خامخا چھیڑتے ہیں"

اور وہ پھر لیٹ گیا۔ جبو نواب کی اسے پھر جگانے کی ہمت نہ پڑی۔ مجبوراً وہاں سے اپنے دل ہی دل میں روتے ہوئے کالج کے دوسرے رخ پر جو موٹر اسٹینڈ تھا وہاں آئے۔ یہاں منیر میاں کے چھکڑے میں بیٹھ کر پہلے اپنی قسمت پر اور پھر عارف پر دل ہی دل میں تبرا بھیجتے رہے۔

منیر کی یہ موٹر اب بیچ بیچ معجزے دکھانے لگی تھی۔ کوئی پانچ چھ دن ہوئے تھے کہ دولہا بھائی نے اسے اپنی "ورکشاپ" میں لیجا کے اسکا سلف ٹھیک کرایا تھا اور اس میں "فل چارج" نیو بیٹری فٹ کرا دی تھی اس کے ساتھ منیر میاں کو یہ گر بھی سکھا دیا گیا تھا کہ اسٹارٹ کرتے وقت چوک پورا گھسیٹ لیا کریں اور اکسلیٹر پورا دبا دیا کریں اور اسی عمل سے اب موٹر کو اسٹارٹ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوا کرتی تھی۔ پھر رہا چڑھائی پر رک جانے والا معاملہ تو اس کا یہ گر بتا دیا تھا کہ چڑھائی آنے سے پہلے گاڑی کو "فسٹ گیر" پر لیا کریں اور اکسلیٹر کو پیر سے فل دبائے رہا کریں۔ اور یہ نسخہ بھی پورے پورے طور پر مفید ثابت ہوا تھا۔ منیر میاں بہت خوش تھے۔ ان کو اور ان کے گھر بھر کو پورا احساس تھا کہ اب انہیں عارف پر پوری فتح حاصل

ہو گئی۔ عارف اپنی جلن نکالنے کے لئے یہ کہنے لگا تھا کہ انجن کی خرابی کی وجہ سے بیٹری پر زور پڑتے پڑتے وہ پندرہ دن میں ختم ہو جائیگی اور اتنے ہی عرصہ میں انجن میں اتنا بھی دم نہ رہیگا کہ فرسٹ گیر پر بھی موٹر چڑھائی چڑھ سکے۔ مگر اس بات پر اب یقین کرنا کسی صحیح دماغ انسان کے لئے ناممکن تھا۔ منیر میاں خود بہت سے لوگوں سے یہ کہہ چکے تھے کہ عارف کٹ کے رہ گیا۔ یہ رائے عارف کے کان تک بھی پہونچ چکی تھی اور اس نے اپنی بھابی سے کہا تھا "سنا بھابھی میں کٹ کے رہ گیا" اور دونوں ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے تھے۔

موٹر کے بابت یہ تمام حالات جتو نواب کے ذہن میں تھے اور وہ امید کر رہے تھے کہ جیسے منیر میاں کو موٹر کے سلسلہ میں عارف کے خلاف کامیابی حاصل ہوئی تھی اسی طرح ان کو بھی نرملا کے معاملہ میں عارف کے خلاف کامیابی ضرور حاصل ہوگی۔ اتنے میں گھنٹہ بجا اور اس کے تھوڑی دیر کے بعد منیر میاں آئے۔ مرزا اور مصلح جہان کی مصیبت کے ساتھی کبھی بھی نہ تھے اب تک ان کی موٹر کے پاس آتے ڈرتے تھے کہ کہیں پھر اسے دھکیلنا نہ پڑ جائے۔ منیر میاں کو امید تھی کہ ایک دو ہفتے موٹر کو اچھا چلتے ہوئے دیکھ کر یہ لوگ پھر ان کی موٹر ہی میں آیا جایا کریں گے یعنی ان کی عملداری میں شامل ہو جائیں گے۔ غرض منیر میاں اکیلے ہی آئے اور موٹر سلونا سے اسٹارٹ کیا۔ جتو جو سوچتے سوچتے اونگھ گئے تھے سلونا کی گڑگڑاہٹ سن چونک پڑے "آئیں تم آ گئے" کہہ کر وہ پیچھے سے اترے اور آگے آ کر منیر میاں کے پاس بیٹھ گئے۔ موٹر چلی۔ سڑک پر کچھ دور جا کر عارف کی موٹر بہت دھیمی رفتار میں جاتی ہوئی دکھائی دی۔

"عارف کی ہے؟" منیر نے کہا۔

"ہاں اسی کی۔ اس سے آگے نکال لو" جتو نے کہا۔

اور جیسے منیر میاں کے بھی دل میں یہی تھا انہوں نے موٹر کو تیز کیا۔ عارف کے پاس پہونچے۔ جتو نے عارف کی طرف سے منہ پھیر لیا مگر منیر اس کو دیکھ کر زور سے ہنسے اور موٹر آگے نکالتے ہوئے چلے گئے کچھ ہی دور آگے گئے ہوں گے کہ عارف کی موٹر تیزی کے ساتھ ان کی موٹر کے پاس آ کر آگے نکل گئی۔ جتو نے کہا "بھئی پھر نکالو" منیر نے پورا اکسیلیٹر دبا دیا موٹر تیز تو ہوئی مگر عارف کے موٹر کی گرد چلے تو انکی موٹر پر بڑی پھر وہ گرد بھی دور ہی ہوتی گئی۔ منیر کی موٹر کا اس سے زیادہ اسپیڈ نکلنا ممکن ہی نہ تھا اور پھر

آگے بڑھ کر ایک چھوٹی چڑھائی آگئی اور اُن کی موٹر آپ سے آپ دھیری ہونے لگی اور اس وقت عارف کے موٹر کی گرد بھی نظر سے غائب ہو گئی۔ خیر جتو اور منیر دونوں خوش تھے کہ تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی مگر نکال تو لی گاڑی اپنی اس کی گاڑی سے آگے۔

کافی دور آگے جاکر ایک چوراہے پر جتو نواب نے کہا "میں یہاں اُتر جاؤنگا۔ راغب کے صاحب کے اسکول جانا ہے۔" منیر نے گاڑی روک لی اور جتو ایک سڑک پر ہو لئے۔ راغب صاحب کے اسکول پہونچے۔ اسکول کے پھاٹک پر کئی لڑکے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے ان کو دیکھ کر اپنے گلے چیخائے گردن ٹیڑھی کی اور آنکھیں مٹکائیں اور باقی ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ جتو ان کی طرف سے مُنہ موڑتے ہوئے اسکول کے اندر گئے اور سائنس روم کے پاس پہونچے۔ وہ دروازے کے پاس کھڑے رہے۔ راغب صاحب کی پڑھاتے پڑھاتے ان پر نظر پڑی اور وہ کمرے سے باہر آئے:

"کیا بات ہے بھئی"

"میں نے اس ڈرائیور کو بہت سمجھایا۔ وہ نہیں مانتا۔"

"کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے مجھ سے نہیں ہوگا"

"اچھا۔ رہتا کہاں ہے"

"وہیں۔ مگر۔ ہاں اس کا گھر ہمارے محلے میں ہے۔ اس کے عزیز رہتے ہیں ہمارے محلے میں وہاں وہ روز آیا کرتا ہے۔"

"بس تم اس کو میرے گھر لئے چلے آؤ ایک دن۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"

اس وقت درجہ میں لڑکوں کے شور مچانے کی آواز بڑھتے بڑھتے اتنی زیادہ ہو گئی کہ راغب صاحب نے پلٹ کر دیکھا اور بولے "بھئی اب لڑکے بہت شور مچانے لگے۔ تم گھر پر آنا۔ اور ڈرائیور کو بھی ساتھ لانا" اور جلدی سے کلاس میں چلے گئے۔

جتو ہٹ آئے۔ وہ بہت ہی متفکر ہو گئے تھے۔ اسکول کے پھاٹک کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ اپنے خیالات میں اسقدر محو تھے کہ انہوں نے دیکھا بھی نہیں کہ وہ کئی لڑکے جو پہلے بھی وہاں کھڑے

تھے کیا کرنے لگے۔ ٹرک پر آگے بڑھ گر وہ جیسے کہ سوتے سوتے جاگ اٹھے اور دل میں بولے "اب کچھ عرصہ تک ان کے یہاں نہ جائیں گے۔ ڈرائیور تو ہم سے بات کرنے کو بھی تیار نہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کے آدمی عجیب گدھے آدمی ہیں" لیکن ان کے دماغ میں یہ بات نہ آئی کہ اگر وہ راغب صاحب سے سفید جھوٹ نہ بولے ہوتے تو راغب صاحب کبھی یہ رائے نہ دیتے۔ اگر یہ بات ان کے دماغ میں آجاتی تو پھر وہ معمولی آدمی نہ ہوتے۔ وہ تو تھے نواب سید محبوب عالم صاحب بہادر رضوی بی، اے۔

(۵)

عارف سہ پہر کے وقت اپنے ایک پروفیسر راما سوامی ہیلیگر نامے کے بنگلے پر پہونچا۔ پروفیسر لان پر آرام کرسی پر بیٹھے تھے پاس ایک چھوٹی میز پر کچھ رسالے اور کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں اور سامنے ایک کرسی پڑی تھی۔ وہ کتاب میں انگلی رکھے ہوئے منہ اٹھائے کچھ سوچ رہے تھے۔ عارف ان کے سامنے پہونچا تو گڑبڑا گئے۔ آرام کرسی پر سے اٹھ کر پھر بیٹھ گئے۔ عارف ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ادبی مسائل پر کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اکدم سے پروفیسر صاحب چونک پڑے اور بولے۔

"او۔ میں بھول گیا تھا۔ مسز پریش۔ تم جانتے ہو۔ نے مجھے بلایا ہے۔"

"اس وقت ان کے یہاں جانا ہے۔"

"ہاں۔ مگر مجھے اب کیا کرنا ہے۔ میں بھول گیا۔ تم نے دیکھا میں نے ڈرائیور کو جانے دیا۔" وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عارف بھی تعظیماً اٹھا۔ وہ بنگلے کے پورٹیکو کی طرف بڑھے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ حد سے زیادہ پریشان معلوم ہو رہے تھے۔ مگر جاتے جاتے پلٹے اور پھر آرام کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے "او۔ ام۔ مجھے اب کیا کرنا ہے"۔ عارف جانتا تھا کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر ہی حد سے زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں اور اس پریشانی پر اسے ہنسی آیا کرتی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ان کا بڑا ادب کرتا تھا اس لئے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے کہا "اچھا جناب میں اجازت چاہوں گا۔"

"نہیں۔ ٹھہرو۔ مجھے تم سے کیا کہنا تھا۔ میں بھول گیا۔ مسز پریش میرے بابت کیا خیال کریں گی

کتنی بھاری غلطی۔ میں بھول گیا۔"

عارف کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کس وجہ سے پریشان ہیں۔ اس نے کہا "آپ کو مسز پریش کے یہاں پہونچنے کی فکر ہے۔ میں آپ کو لے چلوں گا۔"

پروفیسر کا چہرہ بشاش ہو گیا "او۔ ہاں۔ تم تو ان کے گھر سے قریب ہی رہتے ہو۔ اور تمہاری تو وہاں سے پرانی آمد رفت ہے۔ اگر مجھے ٹھیک یاد پڑتا ہے تو جب میں آکسفورڈ سے دوسری دفع واپس ہوا اور ان کے گھر میں ٹھہرا تھا تو تم وہاں بہت آتے جاتے تھے۔ اور وہ ان کی پیاری لڑکی۔ اس کے ساتھ تم بہت دکھائی دیتے تھے۔"

"اور جب مسٹر پریش زندہ تھے۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ جب بھی آپ وہاں آتے تھے مجھے یاد ہے"

"میں اور پریش آکسفورڈ کے ساتھی تھے۔ جب میں پہلی دفع گیا۔ ہم دونوں نے ٹرائی پوس ساتھ کیا۔ میں نے انگلش میں انہوں نے لاڈ میں۔"

"جی آپ مجھے بتا چکے ہیں"

"مجھے ان کی اس لڑکی کا خیال آ رہا ہے۔ کتنی ذہین تھی اور سنجیدہ۔ تم سے کافی بڑی ہوگی تم اس چھوٹی کے برابر ہو۔ وہ تم سے قریب دس برس بڑی تھی شاید"۔

"جی نو برس"

"اچھا۔ اچھا" کہکر پروفیسر اٹھ کھڑے ہوئے "میں ایک منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں" اور تیزی کے ساتھ گھر کے اندر چلے گئے۔

عارف کرسی پر بیٹھا رہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے دل کے ہر زخم کو ایک ٹھیس لگ گئی۔ وہ اپنے ماضی میں گم ہو گیا اور اس کی محبوبہ جس کا ذکر پروفیسر نے بیکار ہی میں چھیڑ دیا تھا اسے بہت یاد آنے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ پروفیسر صاحب کا ایک منٹ کبھی نوّے درجے سے کم نہیں ہوتا۔ اور اسے کم از کم پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔ اس سے کرسی پر نہ بیٹھا گیا۔ اس نے لان پر ایک چکر لگایا۔ اس کی نگاہ اُس کتاب پر پڑی جو پروفیسر اپنی آرام کرسی پر چھوڑ گئے تھے۔

اس نے اٹھ کر اس کتاب کو اٹھایا اور آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھنے لگا۔

آدھے گھنٹے کے بعد پروفیسر باہر آئے کہتے ہوئے "او۔ ام۔ مجھے بڑا افسوس ہے تم کو اتنا انتظار کرنا پڑا" اور تیزی کے ساتھ بنگلے کے باہر آئے۔ عارف ان کے پیچھے پیچھے آیا۔ دونوں موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔

راستے میں پروفیسر نے کہا "مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔ میں بھول گیا۔"

موٹر کافی دور نکل آئی ہوگی کہ وہ بولے "ہاں۔ ام۔ اب مجھے یاد آیا۔ مسٹر پرپش نے لکھا ہے کہ کام بہت اہم ہے جس پر انہیں بات چیت کرنا ہے تو شاید تمہاری میرے ساتھ موجودگی ان کو پسند نہ ہو۔ تم مجھے بس ان کے گھر پر چھوڑ کر چلے جانا۔"

"پھر آپ واپس کیسے آئیں گے؟"

"ان کی موٹر پر"

"نہیں میں آپ کو چھوڑ کر ایک اور جگہ ہو لوں گا اور پھر آپ کو لے جاؤں گا۔ آپ کتنی دیر ٹھہریں گے وہاں"

"ام۔ شاید آدھ گھنٹہ لگے۔ شاید۔ ام۔ زیادہ لگے۔"

"خیر میں گھنٹہ بھر کے اندر ہی آجاؤں گا۔"

مسٹر پرپش کے بنگلے پر پہونچ کر عارف نے باہر ہی موٹر روک لی اور پروفیسر اتر گئے۔ عارف وہاں سے روانہ ہوا۔ کئی سڑکوں پر موٹر موڑتا ہوا آخر کو ایک پتلی سڑک پر آیا اور اس میں کافی اندر جا کر ایک مکان کے پاس ٹھہر گیا۔ برآمدے پر آ کر دروازے کے پاس کھڑا ہوا اور دروازے کو کھٹ کھٹا کر آواز دی "کمار۔ کمار"

اندر سے ایک بوڑھی عورت کی آواز آئی "کون۔ عارف"

"ماتا جی ہاں میں ہوں ماتا جی۔ آداب عرض۔"

ماتا جی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "جیو۔ آؤ۔ آؤ" اور جب عارف اندر آگیا تو

دروازہ بند کرتے ہوئے بولیں "جاؤ۔ اوپر لیٹا ہے۔"

"کیوں؟ کیا طبیعت خراب ہے۔"

"نہیں پڑھ رہا ہے"

"آئیں یہ کوئی پڑھنے کا وقت ہے" کہہ کر وہ دوڑتا ہوا زینہ پر چڑھ گیا۔ اوپر کمرے میں داخل ہو کر کیا دیکھا کہ کمار چارپائی پر کمبل اوڑھے لیٹا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے۔ کتاب چھینتے ہوئے اس نے کہا "ابے یہ کوئی پڑھنے کا وقت ہے۔ ابے اگر تو نہ پڑھے بھی تب بھی فرسٹ ضرور آئیگا۔ تو گڑ جاتا ہے امتحان میں نمبر لانے کا۔"

"میں پڑھ نہیں رہا تھا"

"تو کیا اپنا سر کر رہا تھا؟" یہ کتاب کیوں کھلی تھی۔ اور یہ تیرے چہرہ پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔"

"کیا بتاؤں؟ اس کی صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ کتاب کے ورق پر آجاتی ہے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کیا پڑھ رہا ہوں۔"

"اچھا۔ تو یہ معاملہ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ مگر تو تو اسکو گالیاں دیتا تھا۔"

مگر اب دل دھڑکنے لگا ہے۔ ہاتھ لا دیکھ" اور اس نے عارف کا ہاتھ لیکر اپنے کمبل کے اندر کیا اور اپنے دل پر رکھا۔"

"اوں ہونہہ" عارف نے کہا "یہ کچھ نہیں۔ تیرا دل وِل کچھ نہیں دھڑک رہا ہے۔ سب ہم ابے۔ اتنا دل تو سب کا دھڑکا کرتا ہے۔ اچھا۔ اچھا۔ کپڑے پہن۔ چل میرے ساتھ۔ میں وہیں سے آرہا ہوں اور وہیں جاؤں گا۔"

"کیسے"

"کیسے کیا۔ رہا وہی ہونگا۔ پرانے لوگوں نے غلط بات نہیں کہی تھی پنڈتوں کے بابت کہ ساٹھو برس تک پونگا اور اس کے بعد سٹھیا گیا۔ تو کپڑے پہن تو سہی اور چل میرے ساتھ تجھ کو سب

کچھ معلوم ہو جائیگا۔"

کمار جلدی سے اٹھ کر کوٹھری میں گیا۔ عارف اس کی کتاب دیکھتا رہا۔ وہ کوٹ پینٹ پہنے گلے میں مفلر لپیٹے باہر آیا۔ دونوں اتر سے موٹر میں بیٹھے اور مسز پریش کے مکان پر پہونچ گئے۔ عارف نے ہارن بجایا۔ تھوڑی دیر میں ایک آدمی آیا اور بولا "آئیے۔ میم صاحب بلاوت ہیں"

"کہدو ہمارے ساتھ ایک اور صاحب ہیں۔ کمار نام ہے"

نوکر اندر گیا اور پھر باہر آ کر بولا "آپ دونوں آئیں"

عارف موٹر سے اس طرح اترا جیسے کہ اس کے جسم میں دم ہی نہیں رہ گیا تھا اور کمار اس کے ساتھ آیا۔ لان پر مسز پریش۔ نرملا اور پروفیسر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بھی جا کر بیٹھ گئے۔

"یہ عارف تو میرے یہاں آتا ہی نہیں اب۔ اس کا بھائی آتا رہتا ہے اور میرے بہت سے کام کر دیتا ہے"

"واہ مامی۔ واہ۔ ابھی میں اسی دن آیا تھا۔ اچھا پروفیسر صاحب اب چلئے گا؟"

"ہاں۔ ہاں" کہکر پروفیسر اٹھے۔ نرملا اور مسز پریش ساتھ ساتھ آئیں۔ موٹر کے پاس پہنچکر نرملا کمار سے کہنے لگی "آپ کل صبح آ جائیے کچھ باتیں ڈسکس کرنا ہیں"

"سمجھا ہے پونگے" عارف نے کہا "نیرا تم جانتی نہیں یہ پنڈت ہے اپنی قوم سے اس لئے پونگا ہے۔ اور اس کا دل بالکل گھنٹے کی طرح دھڑکنے لگتا ہے۔ اگر کہیں تمہارے ساتھ ڈسکس کرتے کرتے بجنے لگا گھنٹہ گھر کی طرح تو پھر تم تو بے ہوش ہو جاؤ گی ڈر کے مارے۔ خیر مگر ٹرائی"

پروفیسر گاڑی میں بیٹھ چکے تھے اور مسز پریش دروازہ بند کر چکی تھیں۔ عارف اور کمار بھی آ کر بیٹھ گئے۔

پروفیسر کو ان کے گھر اتارنے کے بعد کمار، عارف کے پاس آ بیٹھا تھا۔ عارف کہنے لگا "کیا سمجھے بیٹا کمار۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ خیر سنو۔ پرانے زمانے والے لوگ جو تھے وہ اکثر باتیں بڑی حماقت کی کہہ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔"

"کیوں۔ اس میں کیا غلط ہے؟"

"نہیں مرد ناقص العقل ہوتے ہیں عورت نہیں۔ دیکھ لو۔ ہم۔ تم۔ ہیلیکر صاحب تین مرد تھے۔ خیر نرملا کو چھوڑ وہ نیوٹرل تھی۔ یا یہ تو بڑے انداز سے نرملا کو دیکھ رہا تھا اور وہ بھی بڑے ناز سے شرما رہی تھی۔ لا میں تیرا دل پھر سے تو دیکھوں۔ ضرور کچھ حرکت میں فرق ہے۔ نہیں تو یہ اثر کیسے پیدا ہوا۔ خیر تو میں تجھے بتا رہا تھا کہ ہم تین مرد اور مسز پریش ایک عورت۔ اس ایک عورت نے ہم تینوں کو الو نہیں بلکہ الو کا پٹھا بنا دیا اور ہم لوگ الو کے پٹھے بنے یعنی خاک نہیں سمجھے اس کا مطلب کیا ہے"

"ارے تو یوں ہی خواہ مخواہ کے لئے مطلب ڈھونڈھا کرتا ہے ہر بات میں۔ ہیلیکر سے تو اس سے پرانی دوستی ہے؟"

"ہاں بہت پرانی۔ یہ ہیلیکر اب حواس خبطہ ہو گئے ہیں بڑے رنگیلے تھے ایک زمانے میں سنا۔"

"آدمی قاعدے کا ہے جس کے گھر رہتا تھا اس کی ہر چیز میں حصہ لگاتا تھا بیوی میں بھی"

"اب یہ مسز پریش اپنے زمانے میں بڑی ہاں بس سمجھ جاؤ۔ یہ خود بڑی جہاں نواز تھیں۔ اور اب ہمیشہ کمند ڈالی۔ یار اس نے کوئی نہ کوئی کرتب ضرور شروع کر دیا"

"پھر تجھے کرتب دکھائی دینے لگا؟"

"یہ مسز پریش ہیں بیٹے۔ تم پونگے کیا سمجھو۔ اور ہم بھی کیا سمجھیں گے۔ ہمارے باپ تک ان کو سمجھتے ہی ہوئے چل بسے۔ خیر آگے کھلے گا ضرور۔ کیا ترکیبیں شروع ہو رہی ہیں؟"

عارف یوں ہی باتیں کرتا ہوا موٹر چلاتا رہا اور رنگمارہ کو اس کے گھر اتار کر اپنے گھر واپس آیا اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ وہ سوچ میں پڑا تھا۔ مری ہوئی شکنتلا کی بڑی، سیاہ، گہری پراسرار آنکھیں اس کے تصور میں تھیں۔ وہ کیا زمانہ تھا جب چار برس کے سن میں وہ جسٹس پریش کے گھر گیا تھا۔ والد مرحوم کی انگلی پکڑے۔ شکن نے اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔ منہ پر چٹ چٹ پیار کئے تھے۔ چمٹا لیا تھا۔ اس وقت اسے کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔ مگر اب وہ زمانہ ہائے۔ کاش وہ زمانہ لافانی

ہوتا۔ ارے وہ زمانہ پھر واپس آجائے۔ اگر جنت میں وہ عالم واپس نہ آیا تو جنت فضول ہے۔ مجھے اس زمانے کی کوئی اور بات یاد نہیں مگر شگن کا وہ چہرہ یاد ہے۔ وہ کیا تھی۔ آسمان کا نور۔ اس وقت سے آخر تک وہ بالکل نہ بدلی۔ وہ کیا تھی۔ اٹرنل ٹرتھ آف تھنگز (دنیا کی اشیاء کی دائمی حقیقت) میں بڑھتا گیا۔ کیوں بڑھا۔ میں ہمیشہ اتنا ہی چھوٹا رہتا تو اس سے دور نہ ہوتا جاتا۔ جب وہ بی۔ اے کا گون پہن کر آئی ہے۔ وہ علم و حکمت کی دیوی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ مجھے اسی طرح چمٹا لے جیسے پہلی دفعہ چمٹایا تھا۔ مگر میں اس سے دور ہو چکا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان یہ کیا چیز حائل ہوتی جارہی تھی۔ میٹریلسٹک پرنسپل آف دی ارتھ (زمین کا مادی اصول) اس کے چہرہ پر جو خوشی طاری ہو جاتی تھی وہ بھی تبدیل ہونے لگی۔ شرم بھی میری رقیب بن کر اسے مجھ سے دور کرنے لگی۔ اور وہ رقیب جس کے ساتھ اس کی شادی ہوئی۔ ہائے اس دن مجھے محسوس ہوا کہ میرا کوئی نہیں۔ میں اکیلا ہوا جارہا ہوں۔ میری روح نکلی جارہی ہے۔ شادی کے بعد وہ وہی رہی۔ مہینوں میں کبھی گھر دکھائی تو دے جاتی تھی۔ مگر ہائے موت یہ میرا سب سے بڑا رقیب۔ اس کے مرنے کی خبر آئی تھی۔ وہ سپرد آگ ہوگئی۔ زندگی ختم ہوگئی۔ آفاقی اصول زندگی ختم ہوگیا۔

وہ یوں ہی سوچ رہا تھا کہ اس کے بھائی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہے تھے

"عارف یہ اس وقت ہی سے لیٹ گئے کیا طبیعت خراب ہے"

"جی نہیں اچھا ہوں۔ آج ذرا تھک گیا۔ آپ ٹہلنے جارہے ہیں"

"ہاں۔ یہ تھکنا کیسا۔ اس نوجوانی میں"

"آج کہیں دل نہیں لگا بھائی جان۔ کمار کے یہاں گیا اس کی طبیعت خراب تھی بس موڈ بگڑ گیا۔ اب رات ہو رہی ہے پڑھنے لگوں گا ٹھیک ہو جائیگا"

اس کے بھائی چلے گئے۔ وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ یہ زندگی کیا ہے۔ یہاں دائمی حسن کو آگ میں جلا کر خاک کر دیا جاتا ہے۔ کاش میں بھی وہاں ہوتا جہاں وہ جلائی گئی میں بھی آگ میں

کود کے جل جاتا۔ چتا کی آگ میں نہ دیکھ سکا۔ مگر اس کی شادی میں بھی تو آگ جلائی گئی تھی اور اس آگ کے چاروں طرف وہ پھری تھی اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ۔ اس آگ کا شعلہ مجھے بھیانک ضرور لگا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ آگ اسے جلادے گی۔ کاش میں اس آگ میں کود جاتا۔ اس شادی والی آگ نے ہی اُسے جلادیا۔ وہ آگ میرے دل میں آگئی۔ مجھے زندگی بھر جلاتی رہے گی۔ میں کیا ہوں شیلی نے کہا ہے "لاسٹ اینجل آف اے ریونڈ پیراڈائز (ایک برباد شدہ جنت کا راہ گمشدہ فرشتہ)

اندھیارہ چھا گیا۔ اس نے سرہانے سے بیڈ سوئچ دبایا کمرے میں روشنی ہوگئی۔ وہ پڑھتا رہا۔

رات میں جب وہ کھانے پر گیا تو اس کی بھابی نے اس کے ماتھے اور گالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا "طبیعت تو خراب نہیں ہے؟"

اس کے بھائی جان جو کرسی پر پلتھی مارے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے بولے "یہ ہوتا کیا ہے اسکو۔"

"کہیں مسز ہریش کے یہاں تو نہیں گیا تھا" بھابی نے کہا اور پھر نوالہ چباتے ہوئے بولیں "اس دن مجھے وہاں لے گیا تھا۔ وہاں سے آکے چپ چپ سا ہو گیا۔ یہ وہاں جانے سے ہی ہوتا ہے"

عارف نے ٹیڑھی نگاہ سے بھابی کو دیکھا اور اسے خیال ہوا کہ عورتوں کو صحیح بات سمجھ لینے کی کتنی صلاحیت ہوتی ہے۔

"میں سمجھتا ہوں بیگم۔ اب اس کی شادی کر دو"

"ہاں میں بھی یہی کہنے والی تھی"

"نہیں بھائی جان میں شادی نہیں کروں گا۔ ابھی۔ ایم۔ اے کرنا ہے اور پھر آکسفورڈ پڑھنے جانا چاہتا ہوں"

"د آکسفورڈ؟"

"جی ہاں۔ آپ مجھے ڈھائی سو روپیہ مہینہ بھیج دیا کیجئے گا۔ بس"

"کہاں ولایت جائیگا۔ وہاں کوئی میم ویم پھانس لے گی۔ احمق تو ہے" بھابی بولیں۔

"میں میم دیم سے نہیں پھنسنے والا"

"ہونھ"، کہکر بھابی نے اپنا رخ عجیب انداز سے پھیرا۔ عارف کو بھابی کے گالوں کی بجلی کی روشنی میں چمک سے اُن کی نرمی اور اُن کے اس مادی کیف کا احساس ہوا جو وہ اکثر ان کو چھوکر محسوس کیا کرتا تھا۔ شکن کے تصور کے ساتھ کوئی ایسا احساس وابستہ نہ تھا۔ عورت کا عشق عجیب چیز تھا مگر اس کے جسم کا احساس؟ یہ بھی کچھ ہے ضرور۔ وہ میز پر سے اُٹھ گیا۔ اپنے کمرے میں آکر وہ لیٹ گیا اور لیٹا لیٹا دو بجے رات تک پڑھتا رہا۔ لکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔ پھر سو گیا۔ صبح تک عجیب گڑبڑ قسم کے خواب دیکھتا رہا۔ عجیب گڑبڑ خواب تھے جو بیان نہیں کئے جا سکتے۔ بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ شکن کی روح کے احساسات اور بھابی کے جسم کے احساسات عجیب گڑبڑ طریقہ پر ملے جلے ہوئے محسوس ہوا کئے۔ دن نکلتے پر وہ غسل خانے میں گیا تو وہ امراؤ جان ادا کا یہ شعر گن گنا رہا تھا ؎

دردِ دل کی لذتیں صرفِ شبِ غم ہو گئیں
طولِ فرقت سے بہت بیتابیاں کم ہو گئیں

III

نویدِ امن ہے بیداد......

(۱)

"مجھے یہ نہیں اچھا لگتا۔ میری لڑکی سے اس کو پان لگوا کے دیتی ہو اور وہ ملعون ہے کہ اِدھر صبح ہوئی اور اُدھر آن کھڑا ہوا" نواب صاحب نے تڑپ کر اپنا لحاف الٹتے ہوئے بیگم صاحب سے کہا۔

"تمہیں اس سے یوں ہی جلن ہے گی۔ میری مری بہن کی نشانی ہے گا۔ ایسا با ادب لڑکا معوذ مجھے سلام کئے بغیر دکان نہیں جاتا کہتا ہے کہ آپ کی دعا لے کے جاتا ہوں تو بکری خوب ہوتی ہے۔"

"جھوٹا ہے۔ مکّار ہے ملعون۔ میں اپنی لڑکی کی شادی ہرگز اس سے نہیں کروں گا۔"

"واہ میں تو ضرور کروں گی۔ تم نے اکبر جہاں کی کی۔ قیصر کی کی۔ میں بھر پائی۔ انوری اب میں خود کروں گی اپنی مرضی سے۔"

"میرا بس چلتا تو اس ملعون سے پردہ کرا تا۔ آ کے دیکھتا کیسے ہے۔ میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ انوری سے میں منع کر دوں گا۔ کل سے جب وہ آیا کرے تو یہ پھوپھی اماں کی طرف چلی جایا کرے۔"

"پھوپھی اماں۔ پھوپھی اماں۔ بڑی آئیں وہاں سے۔ گھُسنے بھی دیتی ہیں میری لڑکیوں کو

اپنی طرف۔ بخس بخس۔ کندھوں پر زلفیاں پڑی ہیں۔ خصموں کے گھر سے اُلٹی ڈولیاں پھریں گی۔ یہ تو کلام ہے ان کا میری لڑکیوں سے ایک ملے گی تو روادار نہیں وہ ادمان کے یہاں گھس جایا کرے کیوں گھس جایا کرے۔ ہے گا۔"

"بک بک نہ لگاؤ فضول کی"

"خوب اور وہ بچہ کچھ کہتا بھی ہو۔ ایسا سیدا نیک لڑکا ہے۔ بس مجھے جی و جان چاہتا ہے اس کی جلن ہے گی کہ میرا کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ تمہارے بچے ہیں کہ کتے پر موتنے والے نہیں۔ وہ ہی میری خدمت میں سرجوتی اور پاؤں پھٹیا کر دیتا ہے جب کبھی بھی میں پڑتی ہوں۔"

نواب صاحب جھلا کر اپنے پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور جواب دینے ہی والے تھے کہ پھوپھی اماں کی طرف سے آبادی خانم کی آواز آئی "اے منجھو نواب صاحب آپ کو بیگم صاحب یاد فرماتی ہیں۔ کچھ طبیعت ناساز ہے۔ ہم رات بھر بیٹھے رہے ہے۔"

نواب صاحب اکدم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھوپھی اماں کی طرف آئے اور پاس آ کر بولے "میں پھوپھا ابا کو اور آپ کے صاحبزادوں کو اطلاع کردوں"

اوہو۔ بابا جان، ہزار دفع منع کر چکی کہ اس مردوے کا میرے سامنے نہ نام آیا کرے۔ وہ وہ تمہارا پھوپھا ابا جائے اپنی باغ والی کے کلیجہ میں اس کا علاج کرے۔ اور میرے سلڑکوں کو بھی بابا جان پھسلا لیا۔ جادو کیا۔ جادوگرنی ہے وہ موئی مالن۔ میں تو زندگی بھر نہ صورت دیکھوں نہ دکھاؤں، خبردار میرے سامنے یہ ذکر نہ ہوں۔ اگر میں تم کو اجیرن ہوں بابا جان تو میرا کام نہ کیا کرو۔"

"نہیں پھوپھی اماں۔ میں نے تو یوں ہی کہا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بس بابا جان بس۔ اب حکیم کو بلاؤ۔"

نواب صاحب لپکتے ہوئے اپنی طرف واپس آئے اور جلدی سے اچکن اور ٹوپی پہن کر گھر سے باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک حکیم کو لے کر آئے سب طرف پردہ کرایا۔

بیگم صاحب کی مسہری کے پاس۔ ایک طرف پردہ پکڑ کر نواب صاحب کھڑے ہوئے اور دوسری طرف آبادی خانم۔ حکیم صاحب پردہ کے ادھر ایک مونڈھے پر بٹھائے گئے۔ بیگم صاحب نے پردہ سے باہر ہاتھ نکالا۔ حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "حال بتائیے"

"بابا جان سنی بندوں کو برابر پنجانہ ہو رہا ہے مروڑ سے۔ سنی بندوں کو نزلہ ہو گیا ہے۔ سنی بندوں کی سانس پھول جاتی ہے۔ سنی بندوں سے اٹھا بھی نہیں جاتا۔ سنی بندوں کا دل دھڑکتا ہے۔

"یہ سب تو سنی بندوں کا حال ہے" حکیم صاحب نے کہا "آپ اپنا حال بتائیے۔ آپ کو کیا مرض ہے؟" اور ان کی آواز جھلائی ہوئی تھی۔

"اے بابا جان منجھو یہ کیسا حکیم پکڑ لائے۔ کوئی گنوار دیہاتی ہے۔ ہماری بولی نہیں سمجھتا"

"آپ کو کوئی مرض نہیں" کہکر حکیم صاحب اٹھ کر چل دئے۔

نواب صاحب پردہ چھوڑ کر حکیم صاحب کے پیچھے لپکے۔ گھر سے باہر پہونچ کر حکیم صاحب بولے "یہ کیا لغویت ہے۔ آپ اسی لئے مجھے لائے تھے"

"معاف فرمایئے حکیم صاحب۔ وہ سٹھیائی ہوئی عورت ہیں"

"خوب مجھے مطب سے بھی اٹھایا"

"اچھا فیس تو لے لیجئے"

"جی نہیں۔ آپ کے گھر میں تعصب کی حد ہے۔ میں فیس نہیں لوں گا"

نواب صاحب نے فیس کے دو روپے اپنی جیب میں رکھے اور پھوپھی اماں کے پاس آئے اور کہنے لگے "غضب کر دیا آپ نے بھی۔ وہ حکیم سنی ہے اور آپ اس سے یوں بولنے لگیں اور فیس تو اپنی وہ لے ہی گیا"

"اوئی۔ بابا جان۔ واہ تو تم ایک سنی گھیٹر لائے تھے۔ موا کافر سے بدتر۔ آبادی خانم لاؤ میری کلائی تو غوطہ کراؤ"

"خیر اب یہ دو روپے تو گئے۔ یہ حکیم سستا تھا متقی مرزا صاحب پانچ سے کم نہ لیں گے۔ پانچ روپے لے کر نواب صاحب پھر گئے اور حکیم متقی مرزا کو لے آئے۔ انھوں نے سب

حال سنا۔ استخارہ دیکھ کر نسخہ لکھا۔ نواب صاحب دوا بندھوا لائے۔ اس سب کام میں دوپہر ہوگئی۔ نواب صاحب نے اب منہ دھویا اور اپنے پلنگ پر کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

اسی وقت قمر نواب آئے اور اپنے خالو کے پاس جاکر بولے "خالو ابا۔ سُنا۔ آپ کی پھوپھی اماں کی کچھ طبیعت ناساز ہے۔ جبو نواب نے کالج جاتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ میں حاضر ہوں جو آپ فرمائیں خدمت کے لیے"

نواب صاحب نے نوالہ چباتے ہوئے کہا "نہیں نہیں۔ تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہے"

قمر نواب سوچ کر آئے تھے کہ خالو کو خوش کرنے کا شاید یہ ذریعہ نکلے مگر ان کے خشک جواب نے انہیں چپ کر دیا۔ ان کی خالہ جو اپنے پلنگ پر کھانا کھا رہی تھیں بولیں "تم کیوں ہلکان ہو۔ بیٹا۔ وہ آپ سب کر لیتے ہیں گے"۔

قمر نواب کی آنکھیں انور کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اُنھوں نے دیکھا کہ قیصرا اپنے پلنگ پر بیٹھی سنگھار کر رہی تھی مگر انور کہیں نہیں دکھائی دیتی تھی۔ وہ بیٹھے بھی نہیں بلکہ "خیر خالہ اماں۔ میرا جو فرض تھا میں نے ادا کر دیا۔ اب میں جاتا ہوں دوکان خالی ہے" کہکر جانے لگے۔ جاتے ہوئے جبو نواب کے کمرے کے پاس آئے۔ بیچ کا دروازہ کھلا تھا اس میں قدم رکھا تو دیکھا کہ بائیں طرف پلنگ پر انور بیٹھی ہے اور جبو نواب کی لڑکی اس کی گود میں سو رہی ہے۔ ان کو محسوس ہوا کہ اُسے ایسی جگہ پر اس لئے بٹھایا گیا تھا کہ وہ اسے نہ دیکھ سکیں۔ اور اسی وقت نواب صاحب کے چیخنے کی آواز آئی "یہ کیا ہے کمو حرام نادی اچھال چھکا۔ ذرا دیر کھڑی نہیں رہتی غیبانی سے یہ برتن لے جا مجھے پانی دے"، قمر نواب نے کسی پُراسرار طریقہ پر یہ محسوس کیا کہ یہ ڈانٹ ان ہی کے لئے دی گئی اور وہ ایکدم سے کمرے کے باہر آگئے اور دیوڑھی کی طرف روانہ ہوگئے۔

نواب صاحب چوکھٹ پر ہاتھ دہونے لگے اور پھر پھوپھی اماں کی طرف گئے۔ وہ آرام کر رہی ہیں تو آکر اپنے پلنگ پر بچھونا بچھاکے لیٹ گئے۔ سہ پہر کو نور میاں کے یہاں سے آدمی

آیا اور اس نے کہا "میاں دو تین دن یہاں ٹھہریں گے منیر میاں کی شادی کے سلسلے میں انتظام کرنا ہے تو نواب صاحب کو بلایا ہے مشورہ کرنے"

نواب صاحب کپڑے پہن کے پہلے پھوپھی اماں کی طرف گئے اور پوچھا "حضور کچھ حال کہلوا بھیجئے گا میں حکیم صاحب کے یہاں جا رہا ہوں۔"

"واہ - بابا جان - کوئی دوا امرت تو ملتی نہیں اکسیر تو تھی نہیں بابا جان - ہاں کچھ افاقہ ہے۔"

"تو میں یہی کہوں گا"

اور وہ نور میاں کے گھر پہونچے - نور میاں اپنے دیوان خانہ کے بغیچہ میں گول چبوترے پر آرام کرسی بچھائے بیٹھے تھے - پاس ایک معمولی کرسی پر آصف صاحب بیٹھے تھے اور چبوترے پر چار پانچ اور خالی کرسیاں پڑی تھیں - نواب صاحب کو آتا ہوا دیکھ کر نور میاں کھڑے ہو گئے اور بولے "آیئے نواب صاحب - آداب بجا لاتا ہوں" آصف صاحب بھی کھڑے ہو گئے اور بولے "آداب عرض" نواب صاحب ان لوگوں کے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئے - تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد نور میاں بولے "نواب صاحب مجھے کبھی امید نہیں تھی کہ اتنا اونچا گھر مجھے منیر کے لئے ملے گا۔"

"اسے خدا کی دین ہے میاں" نواب صاحب بولے "اور اس کے بڑے بڑے ہاتھ ہیں۔ اور پھر آپ کی عقلمندی بھی تو شامل حال ہے۔"

نور میاں بہت خوش ہو کر مسکرائے اور نواب صاحب کہتے گئے۔ "اور پھر منیر میاں کے لئے زیبا ہے - ماشاء اللہ سے خدا نے اقبال مند بنایا ہے - ذہانت میں فرد - انتظامی قوت کیا کہنا - انشاء اللہ ڈپٹی کلکٹر ہوں گے۔"

"ہاں نواب صاحب آپ بتائیں کہ کیا کیا انتظامات ہوں - برات تو ریاست سے جائے گی ہمارے راجہ صاحب کی رائے ہے۔"

"واللہ یہ خوب ہوا - واہ واہ - آدمی سب مفت کے مل جائیں گے اور ریاست کا

سب جلوس اور ریاست سے میاں کی سسرال بھی قریب ہے - یہاں سے طوالت ہوگی۔ واللہ یہ خوب ہوا - واہ"

اتنے میں منیر میاں اور عارف گھر کے اندر سے نکل کر آئے۔ منیر میاں کے خوبصورت چہرہ پر حد سے زیادہ بشاشت تھی مگر عارف کے بلیے چہرہ پر سنجیدگی تھی اور کشادہ پیشانی پر ہلکا سا بل تھا۔ منیر باہر کی طرف چلے گئے اور عارف نے اپنے بھائی کے پاس آکر کہا "بھائی جان اب چلئے بھابھی موٹر میں بیٹھ گئیں"

نور میاں نے عارف کی طرف رخ کر کے دیکھا اور بولے "تم پرسوں نہیں چلو گے"

"جی بالکل نہیں"، عارف نے کہا "بھائی صاحب تو جائیں گے۔ بھابی اکیلی گھر میں ہیں اور اور دو بچے بیمار ہیں اور پھر کالج میں پارٹی ہے"

"لاحول ولا قوۃ - یہ کالج کی پارٹی کی ایک ہی رہی"

"جی - پارٹی جانے سے زیادہ ضروری ہے"

"یہ لڑکا عجب کوڑھ مغز ہو کے رہ گیا ہے - تم آصف اسے سمجھانا"

آصف نے کرسی سے اٹھ کر کہا "اس کی عقل بہت موٹی ہے میں سمجھاؤں گا"

دونوں بھائی گھر کے اندر چلے گئے

نور میاں نے نواب صاحب سے کہا "دیکھا آپ نے نواب صاحب - یہ لڑکا عارف کتنا مغرور ہے - اسے صاحب میرے گھر میں کا بھانجہ ہے - آپ جانتے ہیں - وہ چاہتی ہیں کہ اچھی جگہ شادی ہو جائے جیسے منیر کو ویسے ہی اس کو سمجھتا ہوں - وہ ہے کہ اکڑا جاتا ہے"

"اے میاں وہ مثل نہیں کہی ہے کہ اندھے کو دیا نون اندھا کہے میری آنکھیں پھوڑتی ہیں تو وہ مثل ہے گی - میاں فرعونیت ہے فرعونیت - باپ نے پیسا چھوڑا ہے - بھائی نے ڈھیل چھوڑ رکھا ہے - جو چاہیں کریں - بس وہ ہیں کہ ہم چنگے گلی تیلی"

"میں نے کہا کہ منیر کی ہونے والی سالی سے یہ شادی کرے تو وہ وہاں جائیں گے

بھی نہیں"

"جی جناب وہی فرعونیت ہے۔ سعادت مندی بھی بڑا وصف ہے تو وہ وہاں چھو کر بھی نہیں گزری"

"جانے دیجئے۔ ہمیں کیا"

"ہاں آپ کی جوتی کی نوک پر ہیں"

پھر منیر میاں کے بیاہ کی بابت باتیں ہوتی رہیں۔ اسی سلسلے میں نواب صاحب نے کہا "مجھے ایک فکر کھائے جاتی ہے۔ میری منجھلی لڑکی انورا اب بیاہنے کے قابل ہو چکی ہے، اپنے خاندان والوں میں بس نہیں کرنا چاہتا۔ ایک کا میاں رنڈی باز"

"نواب مرزا نے تو رنڈی بازی چھوڑ دی"

"ہاں چھوڑ دی مگر میاں چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔ اور صاحب دوسری کا میاں مر ہی گیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کوئی زمیندار کا لڑکا ہو تو اس سے کر دوں اس تیسری کی"

"تو یہ کون بڑی بات ہے نواب صاحب۔ میرے سامنے ایک نہایت عمدہ لڑکا ہے۔ ہمارے راجہ صاحب کا عزیز۔ ایک مسلم گاؤں کا مالک، سن بھی بیس اکیس کا ہو گا۔ بس ایک ماں کا دم ہے"

"اور ہے ہماری قوم کا شیعہ"

"جی ہاں نہیں تو میں آپ سے ذکر ہی کیوں کرتا۔ میں نے آپ سے اب تک ذکر نہیں کیا۔ کہ آپ اپنے خاندان میں کریں گے۔ اور سید ہے لڑکا سید تقی حسین"

"تو تو میاں آپ بالکل اطمینان سے طے کر دیجئے شادی۔ میں بالکل راضی ہوں"

"آپ پرسوں چلیں گے میں سب کچھ آپ کو دکھا دوں گا۔ آپ اپنی بیگم صاحبہ سے مشورہ کر لیجئے"

چنانچہ جب جھٹ پٹے کے وقت نواب صاحب اپنے گھر واپس آئے تو پہلے اپنی پھوپھی

اماں کی طرف گئے۔ پھوپھی اماں کہہ رہی تھیں "باباجان یہ مُردہ جان لیوا ہوگئی۔ باباجان کیا کہوں"
منجھو نواب بڑھ کر ان کے سامنے آئے اور بولے "یہی تو میں دو گھنٹے سے بحث کر رہا تھا حکیم صاحب سے ان ہی نے تمام طب کی کتابیں الٹ ڈالیں سب جگہ یہی لکھا ہوا ہے کہ پیچش کو جلد روکنا سخت مضر ہے۔"

"تو باباجان کب تک"

"بس یہی دو چار دن میں"

"اچھا۔ یہ بھی دیکھتے ہیں باباجان"

نواب صاحب پلنگ کی پٹی پر ٹک کر بولے "پھوپھی اماں آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے"

"کا ہے کا باباجان؟"

"انور کی نسبت کا"

"نا نا نا۔ باباجان۔ میں کان پکڑتی ہوں باباجان۔ اور وہ ماں بس کی گانٹھ ہے۔ میں نہیں بولوں گی باباجان...... ابادی خانم جانماز لاؤ میری باباجان نماز کا وقت ہو گیا ہے گا"

"میں تو آپ کی رائے کے بغیر قدم آگے نہیں اٹھا سکتا ہوں گا"

"نا باباجان۔ اتنی بڑی تو ز ہنیا ہے اس لڑکی کی باباجان .... ابادی خانم تیمم کی کشتی"

ابادی خانم نے تیمم کی کشتی بڑھائی اور نواب صاحب اپنی طرف چلے آئے۔ یہاں انور باورچی خانے سے لالٹین جلا کر دالان میں لئے جا رہی تھی۔ اس نے لالٹین کو شہ نشین کے کھمبے میں ایک کیل پر لٹکا دیا اور خود شہ نشین پر نماز پڑھنے لگی۔

نواب صاحب اپنی بیگم کے پلنگ پر ان کے سامنے بیٹھ گئے اور بولے "بیگم ایک بات ہے بہت ہی اچھی نورمیاں نے کہی"

"اے ہٹو۔ مجھے تم مردوں کی باتیں نہیں اچھی لگتیں۔ بے فضول کے لئے۔ کوئی پھبتی دیتی

چھوڑ دی بڑا کمال کیا جگ جیت لیا"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں بڑی ضروری بات" اور اُنہوں نے شہ نشین کی طرف دیکھا۔

"تو ہے کیا کہہ چکئے"

"ایک زمیندار کا لڑکا ہے"

"ہاں ہاں تو میں سمجھی انور کے لئے کہا ہوگا"

"بات تو پوری سنو کہ تڑپ کے بول اٹھیں۔ ارے گاؤں ہے۔ اکیلا لڑکا۔ جوان۔ خودمختار۔ بس ایک ماں کا دم ہے"

"نا صاحب۔ میں نہیں کروں گی۔ بس دیکھ چکی"

"تو کیا لڑکی کنڈی رہے گی؟"

"ابھی اس کا سن ہی کیا ہے"

"واہ شرع سے وہ ہو چکی بالغ"

"ہٹو۔ بڑے شرع لے کے آئے۔ یہ افیم بھی تو شرع نے کہا ہے پینے کو"

"لاحول ولا قوۃ۔ کہاں کیا بات ہو رہی تھی اور کہاں افیم لے دوڑیں"

"خیر میں اس کی شادی نہیں کروں گی وہاں"

"ہاں یہ کیوں نہ کہو کہ اس ملعون اپنے بھیتجے کے ساتھ کرو گی۔ آتا ہے میری لڑکیوں کو گھورتا ہوا۔ بدنگاہ کہیں کا ملعون۔ میں اب سے اسے اپنے گھر میں نہیں گھسنے دونگا۔ واللہ اس کا میری لڑکیوں سے پردہ جائز ہے۔ وہ نہ آیا کرے یہاں"

"وہ آئیگا۔ اور آئیگا۔ نہیں میں نہیں رہونگی یہاں"

نواب صاحب بہت ہی زور سے جھلا گئے تھے اور بہت ہی سخت جواب دیتے مگر شہ نشین پر سے انور کی سُریلی آواز نہ آئی "بھائی اُبا آپ کی افیم صندوق پر کھلی رکھی ہے آپ نے پی لی"

افیم کا نام سنتے ہی نواب صاحب بیگم صاحب کے پاس سے جلدی سے اٹھ کر

صندوق کے پاس آئے۔ ایم پی۔ اپنی اچکن اور ٹوپی اتار کر ٹانگی اور اپنے بچھونے میں بیٹھ کر لحاف کو اپنے اوپر ڈالا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے "سمجھ لو بیگم۔ سونے کی چڑیا ہے۔ ہاتھ میں آکے اڑی جاتی ہے۔ سوچ لو۔ اپنی اوندھی عقل پر نہ جاؤ۔"

"آپ رہنے دیجئے ہم سب سمجھتے ہیں گے۔"

دونوں خاموش رہے۔ انور نماز پڑھ کر باورچی خانہ میں گئی اور حقّہ بھر کر لے آئی کیونکہ ممّو کہیں گئی ہوئی تھی۔ نواب صاحب حقّے کے دم لگانے لگے۔

(۲)

اتوار کے دن "شبوں" ہی سے نواب مرزا بہادر عارف کے گھر پہونچے۔ برآمدے میں چاپ پاکر عارف نے منہ اٹھا کر دیکھا اور بولا "آگئے نواب آپ۔ میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔"

نواب کمرے کے اندر آگئے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے "آہا کیسے نہیں میرا آپ کا طے نہیں ہے گا کہ ایک اتوار بیچ چھوڑ کے آیا کروں۔"

"نہیں میں نے ویسے ہی کہا۔"

عارف اٹھ کر جوتی پہننے لگا۔ نواب مرزا بولے "اور آپ نے شناہش جبّو کی باتیں۔ میں نے آپ کو پوچھا تو کہتا ہے میں ان سے نہیں بولتا" اور انہوں نے اپنے سر کو ٹیڑھا کر کے ہلایا اور بولے "میں واللہ ایک جھاپڑ مار دیتا شالے کے۔"

"ارے۔ تو جبّو مجھ سے خفا ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا اچھا اسی لئے ادھر آئے ہی نہیں اس دن سے اور کالج میں بھی دکھائی تو دئے مگر کترا کترا کے بغل نکل گئے۔ مگر یہ کیوں۔"

"ارے آپ اس کو سر پر چڑھائے ہیں۔ وہ ہے کمینہ جوتے سے بات کیا کیجئے۔"

"ارے نہیں نواب ایسا نہ کہئے۔ وہ بہت اونچا انسان ہے"

"اونچا نہیں ٹھینگا ہے۔ کسی طرف سے بی۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا۔ ارے دیکھئے" اور

انہوں نے اپنے داہنے ہاتھ کی کہنی کے نیچے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی رکھی اور کلائی پر سے داہنا ہاتھ بڑھا کر کے نیچے کو ڈگمگایا اور کہا "یوں چلا آرہا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کوئی بی۔ اسے ہے یا گھس کھدا" اور پھر انہوں نے اپنی کمر پر دونوں ہاتھ ٹیک کر کہا اوپر کا آدھا دھڑ ہلایا اور بولے "یوں ہل رہا ہے جب چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کتاب کی شکل ہی نہیں دیکھی شالے نے۔"

عارف اب میز کے پاس آکر دراز میں سے کچھ نکال رہا تھا۔ بولا "ٹھیک کہتے ہیں آپ بی۔ اسے پاس کرنے سے جسم بدل جانا چاہیئے ضرور۔"

"اور کیا منیر میاں کو دیکھئے معلوم ہوتا ہے فسٹ کلاس پڑھا لکھا آرہا ہے" اور وہ تن کر کھڑے ہو گئے اور تیوری چڑھا کر عارف کو دیکھنے لگے۔

عارف نے دراز سے کنجی نکال لی تھی اور وہ اس کنجی کو نواب کو دیتے ہوئے قہقہہ مار کر ہنسا۔ دولہا بھائی نے کنجی لیتے ہوئے اپنی پوری بتیسی باہر نکال دی۔ عارف بولا "آپ چل کر گراج کھولیں میں آپ کے لئے پان لے کے آتا ہوں" اور گھر کے اندر جانے لگا۔

دولہا بھائی موٹر گراج کے پاس گئے۔ موٹر نکال کر باہر لائے۔ اتنے میں عارف بھی پان لئے ہوئے باہر آیا۔ دولہا بھائی نے دو پان منہ میں رکھ کر ان کے بھپے میں ٹیوب لگایا اور اپنا کوٹ اتار کر موٹر میں ڈالا۔ ٹیوب کا سرا ہاتھ میں لے کر وہ موٹر کو دھوتے رہے اور عارف دیکھتا رہا۔ عارف کا نوکر دو بنڈل بیڑی کے بھی لے آیا تھا اور موٹر دھونے کے بعد وہ بیڑی پینے لگے۔

عارف نے ان کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولا "نواب۔ آپ آج کچھ افسردہ معلوم ہوتے ہیں۔"

"اسے ایسے وہ نہ ہوں گے تو کیا ہونگے!!"

"آخر وجہ بھی؟"

"اب آپ سے کیا بتائیں۔ آپ کیا سمجھیں گے ابھی بچے ہیں...... جانے دیجئے۔

لائیے اب میں موٹر کے نیچے لیٹ کے گریزنگ اور آئیلنگ کر دوں"۔

"نہیں۔ واللہ بتائیے۔ گریزنگ آئیلنگ بعد میں ہو گی۔ آئیے دیکھئے وہ چائے آگئی، پہلے چائے پی لیجئے"

دونوں کمرے میں آئے اور ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئے اور باتیں بھی کرتے جاتے تھے

"بھائی نواب۔ یہ آج چپ خاموشی کیسی۔ آخر بات کیا ہے"۔

"کچھ نہیں میاں۔ وہ جتو بالکل لب لب ہے۔ بی۔ اے ہو جانے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ آپ سے بگڑا ہے کیوں؟ آپ بھی اتنے سر چڑھاتے ہیں تعریفیں کرتے ہیں، شالے کی۔ ارے جوتے سے بات کیا کیجئے ٹھیک رہے گا شالہ۔ خفا کیوں ہے"۔

"آپ جانے دیجئے یہ راز ہے"

"راز! راز۔ چھپانے والی بات۔ ہمارا صاحب بولتا ہے سیکرٹ سیکرٹ۔ ادھر کوئی چھپانے کی بات ہوئی اور وہ بولا نواب سیکرٹ اور ہم سمجھ گئے"۔

"ہاں سیکرٹ ہے۔ تو آپ اسے جانے دیجئے۔ اپنی پریشانی کا حال بتائیے"

"ہماری بات بھی سیکرٹ ہے۔ سیکرٹ۔ آپ اپنی بتائیے تو ہم اپنی بتائیں"

"اچھا ہم اپنی بات بتاتے ہیں۔ مگر سیکرٹ ہے۔ جتو کے گھر میں کسی کو نہ معلوم ہونے پائے"۔

"ہم بھی اپنی بات بتائیں گے مگر وہ بھی سیکرٹ ہے۔ اس شالے جتو کو نہ معلوم ہو۔ بس چاہے دنیا بھر میں ڈھنڈورا پٹ جائے۔

"بس تو ٹھیک ہے ہم اپنی بات کہیں اور آپ کسی سے نہ کہئے اور آپ اپنی بات کہیں اور ہم کسی سے نہ کہیں"۔

نواب مرزا کرسی سے اچھل کر بولے "بس بس واللہ۔ کنٹرک کنٹرک ہو گیا۔ دیہاتی کہتے ہیں، نہ میں کہوں توری نہ تو کہے موری"

"اچھا سنئے۔ وہ ادھر سڑک کے آگے جا کے ایک بنگلہ ہے نہیں۔ مسز پرشی کا"۔

"ہاں۔ ہاں۔ وہی۔ نیلے رنگ کی اسٹوڈی ہے ان کے کہیاں۔ وہ ڈرائیور ہے گنیش ہماری ورکشاپ میں لاتا ہے گاڑی۔"

"ہاں وہی۔ ان کے ایک لڑکی ہے جوان ہمارے ساتھ پڑھتی ہے۔"

"ہاں۔ میں نے دیکھا ہے۔ بڑی جنٹلمین لڑکی ہے۔"

"عارف کو ہنسی آئی۔ پھر وہ بولا" تو اس لڑکی پر جبو عاشق ہے"

"آپ کو والعد۔ اے نہیں۔ یہ منہ شالے کا یہ مسور کی دال۔ یہ روٹیاں لگی ہیں شالے کو"

"تو میں نے کہا ان سے کہ تمہارا عشق سچا ہے۔"

"سچا ہے۔ بس یوں ہی تو آپ اسکو شہر پر چڑھا لیتے ہیں۔ اور آپ کیا جانیں کہ سچا عشق کیا ہوتا ہے۔ وہ شالہ کیا کرے گا سچا عشق سچا عشق ہم کرتے ہیں" اور دولہا بھائی نے اپنے سینے پر داہنا ہاتھ مارا اور بولے" تو اسی پر بگڑ گیا ہوگا۔ اوندھی تو اس کی کھوپڑی ہے شالے کی۔ آپ نے تعریف کی وہ بگڑ گیا۔"

"نہیں بگڑا اس پر نہیں۔ میں نے کہا تم بس الگ ہی رہو۔ وہ کہنے لگا اس لڑکی سے ملاقات کرادو۔"

"اشا۔ کوئی ٹکا بھی شالے کے ابا تک کے پاس نہیں اور ملاقات کرنے چلے ہیں۔ خوب"

"بس وہ چلے گئے۔ اسی پر شاید بگڑ لے ہیں"

"اچھا تو نخرے کر رہے ہیں بیٹا، میں آپ سے بتاؤں۔ اب کی ملے تو دو لاتیں دیجئے شالے کو سب ٹھیک ہو جائے۔ ملاقات کرنا بھی بھول جائے۔ عشٹ کریں گے شالے"

"اچھا۔ تو اب آپ اپنا سیکریٹ بتائیے"

"ہمارا سیکرٹ سچے عشٹ کا معاملہ ہے"

"اچھا آپ کو عشق ہو گیا؟"

"اب کیا بتائیں آپ سے" دولہا بھائی نے اپنی گردن ڈال دی اور دل پر ہاتھ رکھا

"آپ بھی کہیں گے بیہودہ ہے گا۔"

"ارے آپ کہیں بیہودہ بات کر سکتے ہیں۔ واہ۔"

"اشا" اور وہ اُٹھ کر عارف کے بالکل پاس آ گئے اور اس کے کان کے پاس اپنا منہ لا کر بولے "اش اجتو سے کہیے گا نہیں۔ ہمارے شہر کی قسم۔"

"ہرگز نہیں۔ اور وہ تو ہم سے بولتا بھی نہیں"

"اش لب لب کے کان تک نہ پہونچے کہیں۔ مجھے ایک عشق ہو گیا ہے۔"

"کہاں کیسے؟"

"اب سُنئے۔ چوک میں چائے کی دوکان کے سامنے اوپر۔ اف۔ کیا حسن ہے۔ موٹے موٹے گال رس بھرے۔ یہ قبڑے (قبضے) بش نہ پوچھیے دل لوٹ گیا۔ پش گیا۔ ہائے ہائے" اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی رانیں پیٹیں اور الگ آ کر بیٹھ گئے۔

"تو اس میں زحمت کیا ہے۔ چوک میں ہے تو رسائی کیا مشکل ہے"

"یہی آپ سمجھتے نہیں واللہ۔ یہی تو میں نے کہا آپ بچے ہیں"

"اچھا تو آپ سمجھائیے۔"

"اب کیا سمجھاؤں آپ خود سمجھ لیجیے"

"میں تو نہیں سمجھ سکتا۔ آپ خود کہتے ہیں"

"ارے میاں سمجھ کیوں نہیں سکتے۔ اشا میں سمجھاتا ہوں وہ مثل نہیں کہی ہے بے زر عشق ٹیں ٹیں"

"اچھا۔ ہم اب سمجھے۔ ٹکے نہیں ہیں۔"

"یہی تو رونا ہے۔ جب ہم ینگ تھے ینگ تو لاکھوں روپیہ بہا دیا اشی رشتے۔ ایک دن رنڈی کہنے لگی ہم نے نہیں دیکھا کہ کوئی دش روپیہ کے نوٹ کی سگرٹ بنا کے پیئے۔ ہمارا دشیقہ نیا نیا کھلا تھا کوئی پانچ شال کا جمع ملا تھا۔ بش نکال ہی تو لیا جیب شے دش کا نوٹ

اور بنا کے سگرٹ پی ڈالا۔ اور اب پچیس روپیوں کو ترستے ہیں"

"کل پچیس کا معاملہ ہے۔ اچھا۔ آپ چلئے آئیلنگ کیجئے۔ میں ابھی لایا"

"آپ کو واللہ" اور ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ عارف لپک کر گھر کے اندر گیا اور وہ موٹر کے پاس آ گئے۔

عارف دوڑتا ہوا اندر گیا اور بھابھی کو برآمدے میں دیکھ کر بولا "بھابی بھابی پچیس روپئے دیدو فوراً"

"ہائیں ہائیں یہ جلدی کاہے کی ہے کوئی آندھی آئی ہے"

"ہاں بالکل آندھی آئی ہوئی ہے۔ چڑھی ہوئی ہے۔ جلد سے جلد دیدو"

"آئیں۔ یادحشت۔ یہ کیا ہونگے"

"ارے رنڈی بازی ہوگی ان روپیوں سے۔ بس جلدی اٹھو"

"ہٹ بدتمیز"

"بدتمیز و دتمیز کچھ نہیں۔ بہت سخت ضرورت۔ میرا پورا جسم بے قرار ہے" اور یہ کہکر اس نے بھابھی کو اٹھا لیا اور ان کو ہاتھوں پر لیئے ناچنے لگا۔ وہ "ارے ارے" کہتی رہیں مگر نچاتا ہوا ان کو لاکر تخت پر بٹھا دیا اور تخت کے کونے سے صندوقچہ کھسکا کر بولا "جلدی نکالو۔ جلدی"

"ارے۔ ارے۔ پاگل ہوا ہے۔ جا نہیں ملیں گے روپئے"

"کیوں نہیں ملیں گے۔ واہ ایسی سخت تو ضرورت ہے اور نہیں ملیں گے۔ کیسے نہیں ملیں گے جلدی دو بھابھی نہیں تو میں کنجی کھول کے نکال لوں گا"

"آخر ہوں گے کیا بتا تو دے"

"بتا تو دیا کہ رنڈی بازی ہوگی اور کیا"

"تو ہرگز نہیں ملیں گے روپئے اس بیہودگی کے لئے نہیں"

"تو پھر سمجھ لیجئے بھابھی۔ اب جھپٹتا ہی ہوں کنجی آپ کے ازاربند سے۔ پھر آپ کہیں گی

بیہودہ کہاں ہاتھ لا رہا ہے۔ بس سیدھی طرح دیدیجئے۔"

"مجال بڑی ہے تیری"

"اچھا" کہکر اس نے بھابی کو لٹا دیا اور پھر داہنے طرف کروٹ کردی تو ان کے ازار بند میں بندھا ہوا کنجی کا لچھا اس طرف لٹک گیا۔ وہ بولا "یہ قدرتی مدد ہے۔ آپ سے آپ" لچھا الگ آگیا" اور فوراً لچھے کو کھینچ کر کنجی صندوقچہ میں لگا کر اُسے کھول لیا۔ بھابی اُٹھتی ہی رہ گئیں اور جب بھابی اٹھ بیٹھیں اور صندوقچہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے ان کو لاکر پلنگ پر رکھ دیا۔ پھر تخت پر جاکر صندوقچے سے نوٹ نکالے اور صندوقچہ کھلا چھوڑ کر باہر جانے لگا تو بولا "اب آپ صندوقچہ بند کرلو۔ کنجی تمہارے ہی پاس ہے۔ ہمیں فرصت نہیں۔"

باہر آکر عارف نے دیکھا کہ دولہا بھائی موٹر کے نیچے لیٹے گریزنگ کر رہے ہیں اور اپنی نہایت سریلی آواز میں گا رہے ہیں "اپنی شادی شلوتی تنکی جھلک دکھائے۔" وہ بولا "روپئے لے آیا۔ آپ کے کوٹ میں رکھ دوں۔"

وہ موٹر کے نیچے سے بولے "نہیں۔ اپنے پاس رکھئے۔ ابھی جلدی کاہے کی ہے۔"

"واہ میرے خود جسم بھر میں ہیجان برپا ہوگیا"

دولہا بھائی نے یہ سنا ہی نہیں۔ اپنا کام کرتے رہے۔ موٹر کی سروس مکمل ہوگئی۔ دولہا بھائی روپئے لے کر دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔

عارف کو یہ احساس تھا کہ اس نے نواب مرزا کو روپئے دے کر جیسے کوئی جسمانی لطف اٹھایا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس نے بھابی کے ساتھ کچھ زیادتی کی۔ وہ گھر میں آیا تو دیکھا کہ بھابی پلنگ پر پھولی ہوئی بیٹھی ہیں۔ پاس آکر اس نے کہا "بھابھی۔ مزاج شریف۔"

"ہٹو۔ ہم سے نہ بولا کرو۔ بدتمیز کہیں کے۔ میری کمر میں موچ آگئی۔"

"اچھا تو یہ ہے ع نازک ہے مزاجِ حسن بہت سجدوں سے بھی برہم ہوتا ہے۔"

"ہم تجھ سے نہیں بولتے ہیں لڑکے۔"

"ہم تو تجھ سے بولتے ہیں لڑکی - لڑکی کی یعنی عورت ذات کی صفت کیا؟ یہی کہ کبھی کوئی چیز آسانی سے دے ہی نہ - پہلے ناز نخرے - یہ وہ - تُن پھُن ضرور کرے - بھابی تم بالکل عورت ہو اگر تم آسانی سے روپئے دے دیتیں تو عورت نہیں تھیں"

"اور تم بالکل مرد ہو - بے رحم - بدتمیز - مجھے اٹھا اٹھا کر پٹخ پٹخ دیا"

اسی لئے تو میں کہتا ہوں - میرا اور تمہارا جوڑا قدرت نے بنایا - ایک پوری عورت ایک پورا مرد"

"پھر تو اپنی بدتمیزی پر اترنے لگا"

"یہ لیجئے - یہ بدتمیزی ہے - بالکل سچی بات اور شرع سے جائز - اچھا بھابی - پیاری بھابی جان - اب تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو" اور اس نے بھابی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا - بھابی مسکرادیں - اس نے تالیاں بجا کر کہا "بس اسی وجہ سے تو تم دنیا بھر کی عورتوں سے بہتر ہو - دوسری عورتیں بگڑتی ہیں تو پھر منائے نہیں مانتیں - تم فوراً مان جاتی ہو - بس بس اب میں جاتا ہوں پڑھنا ہے اور وہ دوڑتا ہوا چلا گیا -

"مگر سنو تو - بات تو سنو" بھابی چلائیں -

وہ واپس آگیا تو بولیں "مجھے تم سے ایک بات کہنا تھی - میری بہن انٹرنس کا امتحان دے گی - کل پرسوں یہاں آجائیگی - تم اسے پڑھا دیا کرنا"

"مجھ سے تو پردہ ہوگا"

"ہاں - پردے سے پڑھایا کرنا"

"مگر بھابی آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں - پڑھانا - بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے   ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس میں نہیں پڑھا سکتا"

"کیوں نہیں پڑھا سکتے؟"

"بس نہیں پڑھا سکتا"

"بس باتوں ہی کے چلکنے ہو۔ جب کوئی ذرا سا کام کرنے کو کہا بس نہیں کر سکتا۔ جاؤ۔ تم بالکل ناکارہ ہو"

عارف نے غور سے بھابی کے چہرہ کو دیکھا۔ تنگ پیشانی۔ چھوٹی آنکھیں۔ ڈھلے ہوئے گال۔ بڑا دہانہ، مگر ان سب پر ایک عجیب پُر اسرار حسن تھا جو اسی کو دکھائی دیتا تھا۔ بھابی لیے عجیب قاتلانہ انداز سے آنکھیں پھیر کر دیکھ رہی تھیں۔

"اچھا بھابی" وہ بولا "ہم پڑھا دیا کریں گے۔ ضرور۔ ہر صبح اٹھ کر پہلا کام یہی"

(۳)

منیر کی منگنی ہو چکی تھی۔ مارچ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور آج اس کا مانجھا تھا۔ قریب چار بجے مرزا کے یہاں جبو نواب ایک کرسی پر۔ منیر اور مرزا پلنگ پر دیوار سے لگے ہوئے اور مصباح صاحب پلنگ کی پائنتی لحاف پر بیٹھے تھے۔ مرزا کے زانو پر حسین عورتوں کی تصویروں کا ایک البم کھلا رکھا تھا اور منیر بھی اسی کی طرف متوجہ تھے۔ مرزا ہر تصویر کو دیکھکر کچھ ناگفتہ بہ حرکتیں کرتے یا باتیں کہتے۔ منیر خوش ہو ہو کر ہنستے۔ مصباح بھنّاتے اور جبو ایک سے دوسرے کو اور دوسرے سے تیسرے کو دیکھ کر خاموش رہتے۔ سب تصویروں میں مرزا کو ایک تصویر سب سے زیادہ پسند آئی۔ اسی تصویر کو چومتے ہوئے وہ بولے "یہ تصویر اُن سے بہت ہی مشابہ ہے"

"کن سے؟ دیکھوں" مصباح بولے اور البم لے لیا۔

"اُن ہی بیگم سے جن سے میری شادی ہونے والی ہے"

"آپ نے انہیں دیکھا ہے۔ آپ سے تو پردہ ہے"

"بچپن میں ایک دفعہ اس گاؤں گیا تھا جب دیکھا تھا۔ اب ایسی ہی ہو گئی ہونگی"

"ہونہہ" مصباح نے کہا "خوب۔ آپ کا یہ عقیدہ ہے۔ خیر مگر تم سے زیادہ خوبصورت نہیں"۔

مرزا مسکرائے۔ مصباح سے البم منیر نے لے لیا۔ جمّو بولے "اے مرزا صاحب آپ کو کیا۔ آپ کی ان سے شادی ہو ہی جائے گی"۔

"نہیں" منیر نے کہا "تمہیں نہیں معلوم ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ان کے چچا ان پر مَرا کرنے والے ہیں"۔

"اور محبوب صاحب وہ چچا والی ایسی بدصورت ہے میں کیا کہوں۔ مگر ہمارے ابا جان پر چچا جان کا بڑا زور ہے۔ بڑے میاں ہل نہیں سکتے۔ چوں نہیں کر سکتے اور اب کی چھٹیوں میں میں گیا اور انہوں نے کھینچ لیا"۔

منیر اپنے زانو پر البم کھولے ہوئے تصویر کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اکدم سے بولے "خیر۔ یہ تصویر دیکھو"۔ اور البم جمّو کی طرف بڑھا دیا۔ جمّو بولے "یہ تو بالکل تم سے ملتی جلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں زنانے کپڑے پہنا دئے ہیں"۔

مرزا نے البم ان سے لے کر غور سے دیکھا اور آنکھیں مٹکائیں اور بولے "نہیں۔ ان کی ہونے والی بیوی سے ملتی جلتی ہے"۔

مصباح نے تصویر لے کر دیکھی اور "ہونہہ" کہکر بولے "کیسے معلوم"

"سب ہی لوگ کہتے ہیں" منیر میاں بولے۔

"کون سب لوگ۔ تمہاری ماں؟ انہوں نے یہ البم دیکھا اور تمہاری ہونے والی بیوی کو دیکھا۔ تمہارے گھر کی نوکرنیاں تو اور ہی کچھ کہتی پھرتی ہیں"

منیر میاں سٹ پٹا گئے مگر بولے "اچھا تو آپ کی رازداں ہماری نوکرنیاں ہیں۔ کس سے اتنی رسم ہے؟" اور وہ کھسیانی ہنسی ہنسے۔

مرزا بھی ہاتھ پر ہاتھ مار کر متعدد "کھی" والی ہنسی ہنسے۔

مصباح تیوری پر بل لاکر بولے "مجھ سے کسی سے بھی رسم نہیں۔ پورے احاطہ میں مشہور ہے"

"اچھا تو احاطہ والیوں سے آپ کی گھٹتی ہے۔ وہ کسگر والی تو نہیں؟" اور جتو کی طرف طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ کر بولے "لو جتو یہ بھی تمہارے رقیب ہیں"

"محبوب صاحب کو نہ کہیئے" مرزا بولے "اب انہوں نے نیچے طبقہ والیوں سے آنکھ لگانی چھوڑ دی۔ اب اونچے طبقہ کی طرف نگاہ ہے۔ آخر گریجویٹ ہیں ماشاء اللہ"

"وہ۔ وہ تو تم پر مرتی ہے" مصباح بولے

"مرزا نے ایک "کھی" کی اور بولے "اس بات کو چھوڑ دو۔ میں اس کے پھندے میں نہیں آنے والا۔ بات ان کی ہو رہی ہے۔ یہ مرے جاتے ہیں اور وہ پھرتی ہے۔۔۔۔۔"

اس وقت کسی کے زینہ پر نہایت جلدی چڑھنے کی آواز آئی۔ سب لوگ اُدھر دیکھنے لگے۔ عارف آموجود ہوا۔ جتو کا اسے دیکھتے ہی جیسے دم نکل گیا۔ آنکھیں زمین پر جھک گئیں اور گردن آگے کی طرف لٹک گئی۔

"آیئے۔ آیئے" مرزا نے کہا "آپ ہی کی کسر تھی عارف صاحب"

"میری کسر کیوں؟"

"یہ البم دیکھیئے"

عارف نے کھڑے ہی کھڑے ہاتھ میں البم لیا اور یہ دیکھ کر کہ اس میں عورتوں کی تصویریں ہیں، اس کو مرزا کے پیروں پر پٹخ کر کہا "آپ ہی کے لئے بہتر ہیں۔ آپ انہیں تصویروں سے اپنے خوابوں کے لئے مواد جمع کیجیئے۔۔۔۔ اچھا منیر میں تم سے ایک بات کہنے آیا تھا"

"ارے اس میں دو تصویریں تو دیکھ لو" مصباح نے کہا "ایک ان کی ہونے والی کی ہے اور ایک ان کی"

"مجھے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں واقف ہوں دونوں کی خوش فہمیوں سے اور تمہاری بھی۔ مجھے جلدی ہے۔ منیر میں نے جابجی کو پہونچا دیا ہے۔ میں تمہارے مانجھے میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔ پروفیسر ہبلیکر کے یہاں پارٹی ہے"

"اچھا۔ ہبلیکر کے یہاں" مرزا بولے "تھی۔ ہاں صاحب۔ اور نرملا کی پارٹی کی ہوگی انہوں نے اور وہاں اس کی۔ تھی۔ تھی"

"ماں کا کیا ذکر؟ ہم اسٹوڈنٹس کی پارٹی ہے"

"ماں کی اب کیا ضرورت۔ وہ بڈھی ہو گئی۔ بڑی بہن کو بھی مار اُتارا۔ اب اس لڑکی کی باری ہے"

"اپنی حماقت ختم کرو مرزا۔ تم کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے ہو۔ لاکھ مرتبہ یہی کہہ چکے ہو۔"

"نہیں صاحب۔ آپ کے ہبلیکر صاحب بڑے پارسا ہیں۔ جب ہی تو ایک مرتبہ جیل جاتے جاتے بچے تھے کیونکہ پرنسپل انگریز تھا"

"نانسنس۔ اچھا منیر میں چلا" اور وہ دروازے کی طرف پلٹا۔

"ارے۔ ان محبوب صاحب کو بھی لیئے جایئے۔ اور کچھ نہیں تو ہبلیکر کے گھر کا طواف ہی کرتے رہیں گے۔ وہ نکلے گی تو دیکھ کے اپنے ہونٹ چاٹ لیں گے"

عارف پلٹا اور جگنو کو دیکھ کر بولا۔ "ارے جگنو تم مجھ سے خفا ہو گئے ہو۔ خیر میں خفا نہیں ہوں۔ مگر تم ان اسکاونڈرلس کے ساتھ بیٹھ کے اپنی ہیروازم میں دھبہ لگاتے ہو۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ موٹر میں بیٹھے رہنا۔ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے وہ بہتر ہے۔ تمہاری ہیروازم ان کی اسکاونڈرلزم سے تو دور رہے گی"

جگنو اٹھ کھڑے ہوئے۔ منیر نے کہا "اما۔ ہمارے مانجھے میں نہیں شریک ہو گے؟"

"اس وقت تک ہم آجائیں گے۔ کیوں عارف؟"

"ممکن ہے۔ مگر منیر تم سے کہدیا کہ بہت ممکن ہے میں نہ آسکوں اس وقت تک۔ ہاں بھابھی کو لینے تو آؤں گا ہی"

دونوں وہاں سے چلے آئے اور موٹر پر روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور جا کر جگنو نے کہا "منیر نے ایک تصویر دکھائی تھی جو اس کی خود کی صورت سے ملتی ہے اور کہہ رہے تھے کہ ان کی

ہونے والی بیوی ایسی ہے"

"واہ ری خود فریبی۔ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا ہی تھوڑا۔ ٹھیک ہے جو باپ کہیں وہی بیٹے یقین کرلیں۔ خیر شادی ہو جانے دو۔ پھر دیکھنا کیسی کیسی باتیں گڑھی جائیں گی۔ کیسے کیسے اسٹائل سے عیب پوشیاں ہونگی"

"عیب پوشیاں؟"

"اور کیا۔ ابھی یہ ڈھونگ رچایا جا رہا ہے کہ یہ ملے گا اور وہ ملے گا اور جب کچھ نہیں ملے گا تو کہا جائیگا کہ وجہ یہ ہوئی اور وہ ہوئی مگر سب کچھ جیسے مل ہی گیا یا ملنے والا ہے"

"تو کیا مال، خوبصورتی سب ڈھونگ ہے اور نیا موٹر نہ ملے گا"

"موٹر نہیں۔ ہوائی جہاز ملے گا۔ سب ہوائی باتیں ہیں۔ بڑے ہوا باز ہیں ہمارے خالو"

"تم کو کیسے معلوم؟"

"میرے بھائی جان ان لوگوں کو جانتے ہیں خوب۔ معمولی زمینداری ہے۔ پکّے مقدمہ باز ہیں وہ لوگ اور دو بہنیں ہیں۔ بدشکل۔ پھوہڑ۔ شادی کہیں ہوتی نہیں۔ یہ اپنی خوش فہمیوں میں پھنس رہے ہیں۔ اور سُنا۔ ہم کو بھی پھانسا جا رہا تھا۔ بڑی سے تو منیر کی ہو رہی ہے چھوٹی سے ہماری شادی کی تجویز تھی۔ ہماری بھابھی نے۔ پھر ہماری بھابھی ہے۔ کھری کھری سنادی"

"اچھا۔ اور سُنا۔ میری بہن انور کی بھی ایک جگہ کسی بڑے زمیندار سے نسبت ٹھہرا رہے ہیں۔ ہماری بھابھو اماں نہیں راضی ہیں مگر ان کو بھی شیشے میں اتار لیا جائیگا۔ آج آئی ہوئی ہیں گی منیر کے مانجھے ہیں"

"انور کی؟ اس کی تو قمر سے ہوگی"

"بھابھو اماں تو یہی چاہتی ہیں مگر دیکھئے ان کو بدلتے کتنی دیر لگتی ہے"

"یہ تو برا ہوگا۔ یہ نہ ہونے پائے۔ تم کچھ نہیں کر سکتے"

"میں۔ میری کیا مجال ہے"

"ارے ہاں۔ تم اتنے دنوں سے غائب جو رہے ہو تو میں تمہاری ہیروازم سے کچھ نامانوس ہوگیا۔ تم کیا کر سکتے ہو سوائے رونے کے۔ تمہاری مظلومیت ہی میں تو تمہاری ہیروازم مضمر ہے ...... خیر دیکھوں گا اگر قمر خود کر سکے وہ تم سے بہت ہی کم ہیرو ہے۔"

"مگر اس سے نہ کہنا۔ وہ انور کی جہاں سے بھی شادی آتی ہے وہاں پہونچ کر کیا کیا کہتا ہے نہ معلوم کہ سب معاملہ پلٹ جاتا ہے۔"

"یہ ہے تو میں اس سے ضرور کہوں گا۔ ابھی۔ اس کی دوکان کی ہی طرف سے نکلونگا۔"

"نہیں۔ ورنہ ہم اتر کر چلے جائیں گے۔"

"جاؤ گے تم کہاں اتنے دن تم نہیں آئے ہم بالکل اکیلے تھے۔ اب تمہیں ہم جانے دیں گے بھلا۔ تم گنگ لیر ہو ہم فول۔ تم ڈن کو نٹروت ہم سانکو پانزا۔ بغیر تمہارے ہم نامکمل، اور غیر دلچسپ ہیں۔ تم ہیرو ہو، ہماری زندگی کے ڈرامے کے۔"

یوں ہی باتیں کرتے ہوئے وہ قمر کی دوکان کے پاس سے گذرے۔ عارف موٹر روک کر پکارنے لگا "قمر یہاں آنا ایک منٹ۔ بہت ضروری بات ہے۔"

قمر پاس آئے تو اس نے کہا "تری بربادیوں کے مشورے ہیں گلستانوں میں۔"

"کیوں؟ کیسے؟"

"انور کی شادی ہمارے خالو کسی اپنے تعلق رکھنے والی ملک کے ساتھ ٹھہرا رہے ہیں میرے خالو کو راضی کرلیا۔ اب خالہ رہ گئی ہیں۔"

"سچ!" اور قمر سکتے کے عالم میں آگئے۔

"سوچنا اس کو۔ کل صبح پڑھنے آؤ گے۔ جب تفصیل سے باتیں ہوں گی۔"

اور یہاں سے عارف نے موٹر تیز کی تو پروفیسر ہیلیکر کے گھر پر جاکے رکا۔ مسز برنیش کی موٹر باہر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھ کر کہا "اچھا نیرا آگئی" اور جتو کو موٹر میں بٹھا چھوڑ کر بنگلے کے اندر چلا گیا۔

اندر لان پر کرسیاں پڑی ہوئی تھیں - پروفیسر آرام کرسی پر بیٹھے تھے - ان کے داہنے نرملا بیٹھی تھی اور اس کے بعد کمار اور پھر دوسرے لوگ بیٹھے تھے - پروفیسر نے دیکھتے ہی کہا "ہلو عارف - ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے ! ام"

"مجھے ذرا دیر ہو گئی - منیر کی شادی کے سلسلے میں تقریب تھی - منیر کو آپ جانتے ہیں"

"منیر ؟ کون ہمارے یہاں پڑھتا تھا"

"ہمارے ساتھ تھا - خوش رو لڑکا"

"وہی جو لپسٹک لگاتا تھا - او - ام - مجھے یاد آیا - مگر - ام - شادی کی ایسی جلدی کیا تھی؟"

"ان کے والد کو جلدی تھی - وہ تو میری شادی بھی کرا دینے کو کہتے ہیں"

"او - تمہاری شادی ! ام - تم نہ کرنا ہرگز تم آکسفورڈ جاؤ - تم وہیں کے لائق طالب علم ہو"

عارف یہ باتیں کرتا جا رہا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ کمار اور نرملا ایک دوسرے سے بہت ہی گھلے ملے نظر آرہے تھے - نرملا بار بار اپنی کرسی پر کمار کی طرف جھکتی اور کوئی بات کہتی - کمار کے چہرہ پر کچھ مردنی سی چھا جاتی - عارف کو خیال ہوتا کہ کمار کا دل ضرورت سے بہت زیادہ دھڑک رہا تھا -

اتنے میں خانساماں نے آکر کہا "حضور میز تیار ہے - پروفیسر بوکھلا کر اٹھے اور بولے "آیئے سب لوگ" سب لوگ برآمدے میں آئے جہاں ایک بڑی میز پر سب سامان لگا ہوا تھا - اس میز پر سے پلیٹیں اٹھا اٹھا کر ان میں مختلف چیزیں لے لے کر سب لوگ الگ ہوتے گئے اور کھاتے گئے - کمار عارف کے پاس آیا تو عارف نے اس کے کان میں کہا

"ابے نکل تو نہیں پڑے گا باہر"

"کیا ؟"

"یہی تیرا دل - بہت پھڑپھڑا رہا ہے کہ نہیں"

قبل اس کے کہ کمار کچھ کہے نرملا ان دونوں کے پاس آگئی اور انگریزی میں بولی "مسٹر

کمار ٹہلتے ہوئے آرہے تھے۔ میں اپنے ساتھ لے آئی۔"

"اچھا" کہکر عارف نے اسکو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ میز کی طرف چلی گئی۔ عارف نے کمار سے کہا "یہ تو معاملہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔"

اتنے میں نرملا پھر آگئی "تیراده پرماتنک کہاں گیا۔ دکھائی نہیں دیتا۔"

"اس کے باپ نے اس کو کلکتہ کی ایجنسی میں بھیجدیا۔ اچھا ہوا گیا۔ بور تھا۔ مامی نے سر چڑھا رکھا تھا۔"

عارف نے کمار کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کچھ ہلکی سی سرخی آکر چلی گئی۔

"عارف تم سے زیادہ تو کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا۔ مگر کمار نے بھی بہت پڑھا ہے۔ اف۔ فوہ میں اتنا نہیں پڑھ سکتی۔"

"کمار کو تو پڑھنے کی تو بس واجبی واجبی ضرورت ہے۔ مگر اسے امتحان میں فرسٹ فرسٹ آنا آتا ہے۔"

"تو کیا بغیر پڑھے ہی۔ تم اپنی الگ ہی اڑایا کرتے ہو بے پر کی۔"

"ارے اس کو عادت ہے فرسٹ آنے کی۔"

"عادت؟" اور وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

پروفیسر ادھر کی طرف آئے اور بولے "کیا ہے۔ کاہے پر تم ہنسیں۔"

"یہ عارف کہتے ہیں کہ کمار کو فرسٹ آنے کی عادت ہے۔ جیسے امتحان دینا بھی میکانیکی عمل ہے۔"

"او۔ ام۔ ہاں۔ عارف کی ہر بات معنی خیز ہوتی ہے۔ بات ٹھیک ہے۔"

"آپ کی بھی یہ رائے ہے" نرملا نے پوچھا۔

"بالکل۔ تجربہ یہ کہتا ہے ام۔ امتحان میں اچھا لکھنا محض کرتب ہے ام۔ شروع سے اگر عادت پڑ جائے تو لڑکا ہمیشہ اچھا ہی لکھتا ہے ام۔ بالکل عادت ہے۔ ٹھیک کہتا ہے عارف۔ ام۔"

نرملا پروفیسر کے چہرہ کو غور سے دیکھ رہی تھی - ان کی گول گول آنکھیں بات کرتے وقت باہر نکلی آرہی تھیں اور ان کے چہرہ پر ایک عجیب روشنی، عجیب چمک تھی، اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا - پروفیسر نے اس کو دیکھا اور بولے "تم ناچ کے لیئے تیار ہو کر آئی ہو"

"ارے میں گھنگرو تو لائی ہی نہیں"

پروفیسر گھبرا گئے اور بولے "اب کیا ہوگا"

"اس میں بات کیا ہے" عارف نے کہا "ارے اب جا کر لے آؤ"

"او - ام - عارف تم اپنی موٹر پر لے جاؤ"

"نہیں یہ اپنی موٹر پر جائیں اور کمار ان کے ساتھ جائے گا"

نرملا اور کمار بنگلے سے باہر آئے - جگو - نے عارف کے موٹر میں سے ان دونوں کو دیکھا - ان کی نگاہ نرملا کے چہرہ پر جمی اور ان کے جسم بھر پر ایک موت کا سا عالم چھا گیا - نرملا اور کمار موٹر میں داخل ہوئے اور موٹر روانہ ہوگئی - جگو جذبۂ محبت کے دورے سے چونکے اور انہیں خیال ہوا کہ وہ چوک گئے ورنہ ان کو چاہیئے تھا کہ وہ فوراً اتر کر کمار سے ملتے اور اس طرح شاید یہ بھی ممکن ہو جاتا کہ نرملا سے کمار ان کا تعارف کرا دیتا - مگر پھر انہوں نے سوچا کہ کمار ہندو ہے اور متعصب ہے - اسے تو ان کا نرملا کو دیکھنا بھی گوارا نہیں - اچھا ہوا جو وہ نہیں اترے ...... پھر انہوں نے سوچا کہ آخر موٹر میں بیٹھے تو رہے ہی اگر اتنی دیر نرملا کے ڈرائیور سے دوستی کرنے کی کوشش کرتے تو اچھا تھا - چنانچہ انہوں نے ٹھان لی کہ اب اگر کبھی ایسا موقع ملا تو وہ منت دربان ہی پر صرف ہوگا - فی الحال تو وہ یہ خیال کر رہے تھے کہ اب نرملا اور کمار تو گئے ہی، عارف بھی آتا ہی ہوگا باہر - کوئی دس منٹ تک وہ انتظار کیا کیئے کہ اب عارف آئے اور اب آئے - مگر اتنی دیر میں نرملا کی موٹر پھر واپس آگئی تو ان کی سمجھ میں آیا کہ پارٹی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ کمار اور نرملا کسی کام سے جا کر واپس آگئے -

اپنے موٹر سے اتر کر نرملا تو سیدھی بنگلے میں چلی گئی - کمار دوسری کھڑکی سے اتر کر پھیر لیکر

جو جانے لگا تو اس کی نگاہ عارف کے موٹر پر پڑی اور اس نے دیکھا کہ جتو اس میں بیٹھے ہیں۔ وہ رک کر بولے "ارے بھائی جتو تم ہو۔ کیسے"

جتو موٹر میں سے اتر کر بولے "عارف کے ساتھ گھر چلا جاؤنگا"

"کیا تم اس کے ساتھ آئے تھے"

"نہیں میں ادھر سے گزرا تو موٹر میں بیٹھ گیا۔ عارف کو جانا میری طرف ضرور ہوگا منیر کا مانجھا ہے"

"خیر بیٹھے رہو۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ اگر وہ نہ گیا ادھر تو پیدل جانا"

"دیکھا جائیگا" جتو نے کہا۔

کمار بنگلے کے اندر چلا گیا۔ پارٹی کے سب لوگ ڈرائن روم میں جا رہے تھے۔ یہاں کافی جگہ خالی تھی اور اس جگہ پر پیروں میں گھنگرو باندھ کر اور ساری کو اچھی طرح لپیٹ کر نرملا ناچنے لگی۔ عارف اور کمار قالین پر بیٹھے تھے اور سب لوگ کرسیوں پر۔ سب ناچ دیکھنے میں محو ہو گئے۔

درمیان میں عارف نے کمار سے کہا "ابے آج تو بہت لفٹ مل رہی ہے"

"ہاں جذبۂ دل کا اثر ہوتا ہی ہے"

"مجھے بھی کچھ یقین ہو رہا ہے۔ مگر دیکھ ادھر دیکھ۔ یہ گت"

کمار نے دیکھ کر کہا "مگر فلرٹ ہے"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ محبت اور لڑائی میں سب جائز ہے"

"ہاں۔ باہر تیری موٹر میں جتو آکر بیٹھ گئے ہیں"

"آکر بیٹھ گیا معنی۔ وہ میرے ساتھ آئے تھے"

"آئیں تو مجھ سے جھوٹ بولے"

"تم نہیں جانتے۔ وہ شاہی خاندان کا ہے۔ سیاست سے بات کرتا ہے۔ وہ میرے

ساتھ ہی آیا تھا نہ معلوم کیا کیا امیدیں لئے ہوئے مگر تم رقیب سے سچی بات بتانا عقلمندی کے خلاف تھا۔"

"مگر اس کی محبت ایک گناہ ہے۔ اس کے بیوی ہے"

"واہ بیٹے۔ لگے تم وید شاستر پڑھنے۔ اچھا دیکھ ناچ دیکھ"

اور دونوں محویت سے ناچ دیکھتے رہے۔ کمار کا چہرہ اترتا گیا۔ عارف کو خیال آرہا تھا کہ نرملا شکن کی سگی بہن ہوتے ہوئے بھی اس سے کتنی مختلف تھی۔ شکن کی نامی کوئی نہ ہوئی۔ انور کچھ اسی کی سی ہے۔

ناچ ختم ہوگیا۔ سب لوگ جانے لگے۔ عارف، نرملا، اور کمار تینوں ساتھ ساتھ بنگلے سے باہر آئے۔ عارف نے کہا "کمار چل تجھے تیری گلی کے نکڑ پر اتارتا ہوا نکل جاؤں گا۔"

"نہیں" نرملا بولی "یہ میرے ساتھ جائیں گے۔ ہم لوگ ذرا کتابوں کی دوکان پر جائینگے اور پھر مجھے ان کا گھر بھی دیکھنا ہے۔"

عارف آکر اپنی موٹر میں بیٹھ گیا۔ جتو محویت سے نرملا کی موٹر کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ موٹر کچھ دور لے جاکر عارف نے کہا "اب تو نرملا اکیلی ہی موٹر لے کے نکل آتی ہے"

"آج ڈرائیور ساتھ بھی نہیں تھا"

"ٹھیک ہے۔ کمار اور اس میں التفات بڑھ رہا ہے۔ ڈرائیور کی موجودگی کھلتی ہوگی"

جتو نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

عارف نے کہا "تم یہ شعر پڑھو ؎

ہیں ایک وہ بھی کہ جن سے ہے تم کو راز و نیاز اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا"

جتو کچھ نہ بولے۔ شاید اس شعر پر غور کرتے رہے۔

دونوں جب منیر کے گھر پہونچے تو مانجھے کی رسم ختم ہو چکی تھی۔ باہر کے ایک کمرے میں منیر سر پر زردکام دار ٹوپی پہنے اور جسم پر سرخ پوتھ کی شیروانی پہنے بیٹھے تھے۔ کمرے میں تائین

کے فرش پر ان کے پاس مرزا۔ زیدی۔ نقوی۔ عباس علی اور کئی اور صاحب بیٹھے تھے۔

"آئیے آپ ہی لوگوں کی کسر تھی" مرزا بولے

جوتے اتار کر فرش پر آتے ہوئے عارف نے کہا "بھئی مرزا۔ اسے آج منیر کے مانجھے کے دن تو کوئی نئی بات کہتے۔ ہمیشہ وہی آئیے آپ ہی کی کسر تھی۔ عجیب بھٹے سے آدمی ہو یار بندھے ٹکے جملے اور فقرے تمہاری زندگی ہے"

"تو میں آپ کا سا ذہن کہاں سے لاؤں"

"میرا سا ذہن۔ مجھ سے اچھا ذہن منیر کے پاس ہے تھوڑا سا ان سے لے لو"

"اونہہ" مصباح بولے "یہ کیسے قسم کی باتیں کرنے لگے عقلمند آدمی"

"عقلمند آدمی!" اور عارف ہنسا

"تم دیر میں آئے" نقوی بولے "عباس علی ایک سہرہ کہہ رہے ہیں اس کے کچھ شعر ابھی سنائے تھے"

"ان کا سا سہرا تو میں نے بھی کہا ہے۔ ایسا سہرا کہ اردو ادب بھر میں نہ نکلے"

"کیسے؟" زیدی نے پوچھا۔

"بات یہ ہے ماسٹر صاحب کہ اس بیسویں صدی میں ہر چیز کی آسانی ہو گئی۔ اما جتو بجلی جلا دو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو گیا ہے۔ یہ دیکھیے پرانے زمانے میں چراغ۔ تیل۔ بتی۔ دیا سلائی تمام زحمت کے بعد یہ روشنی آتی۔ اب جتو نے کھٹ سے بٹن دبایا۔ پورا کمرہ روشن ہو گیا۔ اسی طرح شاعری بھی ہے۔ بس ادھر کھٹکا دبایا اور سہرا۔ غزل نظم جو کہیے موجود ہوئی"

"بھئی یہ کھٹکا کیسا ہے" زیدی نے پوچھا۔

"لائبریری میں شاعروں کے دیوانوں والی الماری کا۔ ادھر کھٹکا کھولا اور جس قافیہ ردیف بحر کا سہرا چاہا سامنے آ گیا۔ اور بس نقل کر کے محفل میں لے آئے۔ اب کسی گدھے کو پرانے شاعروں کا علم ہی نہیں جو کچھ کہے"

"تو آپ" عباس علی بھنا کر بولے "چوٹ کر رہے ہیں کہ میں چرائے ہوئے شعر پڑھتا ہوں"

"واہ یہ تو تم نے چور کی ڈاڑھی میں تنکے والا مضمون کر دیا" مصباح بولے۔

"یہ سب باتیں جانے دو یار۔ کچھ اور باتیں کرو" منیر بولے۔

"ہاں۔ یار۔ میں یہاں بیٹھ گیا۔ ذرا دریافت کر لوں کہ بھابھی کب چلیں گی"

"نہیں ٹھہرو۔ چائے آتی ہوگی" منیر نے کہا "اور ہم دریافت کروائے دیتے ہیں"

عارف بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی گپیں اڑتی رہیں۔

اس درمیان میں نواب مرزا بہادر ایک نئی شان سے اس کمرے میں یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے "لیجئے صاحبان۔ ٹھیک سے بیٹھ جائیے چائے آگئی" ان کے سر پر ایک زرد مخملی ٹوپی رکھی تھی جو کسی زمانے میں کام دار ہوگی اور اب بھی اس پر کہیں کہیں ایک آدھ تار لگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کے تن پر ایک زربفت کی شیروانی زیب تن تھی جس پر سنہرے پھول اگر سب نہیں تو دو تہائی ضرور چھپی چکے تھے۔ ان کو سب نے ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ عارف نے کہا "ارے بھائی نواب آپ خوب آگئے۔ ذرا کسی سے دریافت کرا لیجئے کہ ہماری بھابھی کب چلیں گی"

"ارے آپ کی وہ نوکرانی نے یہ یہ۔۔" انہوں نے اپنی چھوٹی سی ناک پکڑی "نتھنوں میں دم کر دیا۔ بڑی وہ ہے۔ اب کیا کہوں آپ لوگوں کے سامنے"

"کہو کیوں نہیں" زیدی بولے "ہم تو تمہارے برابر دار ہیں اگر یہ سب بچے ہیں"

"اب کیا کہوں۔ اے وہ شالہ خیراتی کہاں رہ گیا چالا رہا تھا۔ اب کیا کہوں راغب صاحب۔ وہ ہے بش وہی۔ وہی۔ مکارا"

"بس اتنی سی بات" عارف نے کہا "اور اس نے کیا کیا۔ اور آپ چاندی کے تو کپڑے پہنے ہیں آج وہ پگھل گئی تو کیا ہوا"

"دیکھئے عارف میاں۔ آپ کو واللہ مذاق نہیں زیب دیتا۔ اتنے بڑے وہ یہ سب

کیا کہتے ہیں" انہوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر ہاتھ ہٹا کر بولے "فلاسفر ہو کر"

"ارے اس نے کیا کیا۔ اف" مصباح بولے

"ناک میں دم کر دیا"

"ارے بھئی کیسے ؟"

"کوئی ستر دفع آئی ہوگی عارف میاں آگئے، عارف میاں آگئے بس ناک میں دم ہو گیا"

"تو بھابھی جانے کے لیے پوچھوا رہی ہوں گی"

اس وقت خیراتی چائے لے کر آگیا۔ نواب مرزا سب کو چائے اور شیرمال دینے لگے

"اور کچھ نہیں ہے نواب ؟" عارف نے پوچھا

"اور کیا میں نے تو کہدیا کہ دیکھئے نا دیہاتی لوگ۔ مانجھا بھیجنے چلے تو اتنی بھی ہنڈیاں نہ

بھیجیں جو سب مہمانوں کو دی جائیں"

"کفایت شعار لوگ ہیں" منیر نے کہا

"بس اب سنبھل جائیے نواب" عارف نے کہا "منیر کی سسرال والے ہیں ذرا اب

سمجھ بوجھ کے ان کے بابت کچھ کہئیے گا"

"یہ کیا۔ اما اب ہم ان کو گالیاں دینگے گالیاں۔ ہمارا رشتہ ہے"

"خیر آپ جانیں آپ کا کام جانے"

غرض سب چائے پیتے رہے۔ درمیان میں نواب مرزا نے جنو کو جھڑکا "اما عجب آدمی ہو

آدمی ہو کہ ہنشاخہ۔ گھر میں اکیلی انور ہے اور سب یہاں آگئے۔ اب رات ہو گئی ہے۔ جاؤ

جلدی ڈولی لاکے پہونچا دو اپنی ماں اور بہن کو"

چنانچہ اپنی چائے ختم کرتے ہی جنو چلے گئے۔ عارف بھی اٹھا اپنی بھابھی اور ان کے بچوں

کو موٹر میں بٹھا کے گھر چلدیا۔ زیدی اور ان کے ساتھی بھی چلے گئے اور منیر کے پاس مرزا اور

مصباح بیٹھے رہے۔ جنو دروازے پر ڈولی لگوا کے پھر یہاں واپس آئے اور بیٹھ گئے مصباح

نے ان کو دیکھ کر کہا "عقلمند آدمی - یہ کیا خبط ہے کہ وہاں گھنٹوں موٹر میں بیٹھے رہے - بس اس لئے کہ نکلے گی دیکھ لیں گے - ہونھ "

"اور" مرزا بولے "اس نے ان کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھائی ہوگی - کوئی دھگڑ نیا ساتھ ہوگا لئے چلی گئی ہوگی "

منیر نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جگنو کو دیکھا یعنی ان سے عارف کے ساتھ چلے جانے کا بدلہ لیا - وہ کچھ نہ بولے - کہاروں کی آواز آئی "میاں آیئے - سواری ہوگئی" اور وہ باہر آکر ڈولی کے ساتھ ہو لئے -

گھر پہونچ کر والدہ اور قیصر کو اتروایا اور کہاروں کو رخصت کیا - ان کی والدہ کہے جا رہی تھیں "نور میاں کی بیوی تو بڑی تعریفیں کرتی ہیں" اور جب آدھے گھنٹے کے بعد نواب صاحب آئے تو انہوں نے یہی جملہ ان کے سامنے بھی دوہرایا -

"تو آپ تمہاری کیا رائے ہے ؟" نواب صاحب نے پوچھا -

"نور میاں کی بیوی جو بیان کرتی ہیں - اگر وہ سچ ہے تو پھر بڑا اچھا ٹھکانا ہے گا"

"میں جو تم سے کہتا تھا ارے اپنی اولاد کا کوئی بھی بڑا چیتا ہے گا - آخر نور میرے کلیجے کا ٹکڑا نہیں ہے گی - تمہیں اپنی بہن کے لڑکے سے محبت سہی اس کی بھی کہیں اچھی جگہ شادی کرو - ہم خوش، ہمارا خدا خوش - اپنی لڑکی کی قسمت کیوں خراب کرو مفت خدا میں نہ لینا ایک نہ دینا دو "

"میرا یہ مطلب نہیں کہ میں سولہ دُں آنے راضی ہوں - میں تماؤ طنا نہیں کہ گھڑی میں کچھ اور گھڑی میں کچھ - ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو "

"ہونھ - پھر وہی - ہو نہ عورت - ارے میں نے دنیا بھر میں دریافت کر لیا - جو ہے سو تعریفیں ہی کر رہا ہے "

"اوں اوں، کہکر بیگم صاحب نواب صاحب کے پاس آئیں اور کان میں کہا "ارے

پہنچے رہتے ابھی۔ اگر وہ سن لیگا تو وہاں دوڑ جائیگا اور سب ٹائیں ٹائیں پھس ہو جائیگی"

"اچھا۔ اچھا۔ تو پھر اس بات کو چھوڑ دو"

(۴)

عارف کا صبح اٹھتے ہی یہ فرض تھا کہ اپنی بھابی کی بہن کو پڑھائے۔ پڑھانے کا انتظام یوں کیا گیا کہ گھر کے اندر دالانے برآمدے سے ملحق کمرے کے ایک دروازے میں ایک میز ڈالدی جاتی اور دروازے پر پردہ اس طرح لٹکایا جاتا کہ میز کے آدھوں آدھ پر گرتا۔ پردے کے ادھر بھابی کی بہن عابدہ بیٹھتیں اور اُدھر عارف۔ عابدہ کتاب کو میز پر اس طرح رکھتیں کہ ان کے دونوں ہاتھ معہ کتاب کے عارف کو بھی دکھائی دیتے۔ اسے اس طرح پڑھاتے ہوئے کافی دن ہوگئے تھے اور عابدہ کے ہاتھوں سے اسے کافی دلچسپی ہوگئی تھی۔ وہ کافی اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اسے اپنی شگن کے ہاتھوں کا کوئی خاص خیال نہیں تھا اور وہ یہ تصور کرنے لگا تھا کہ شگن کے ہاتھ بھی اسی طرح کے ضرور ہونگے اور اس لئے وہ اسے خوبصورت معلوم ہونے لگے تھے۔

آج اتفاق یہ ہوا کہ عابدہ کا پیر اس کے پیر سے لڑگیا۔ اس کے جسم بھر میں عجیب قسم کی سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے اپنی کرسی میز سے ذرا الگ ہٹالی اور میز کے نیچے دیکھنے لگا۔ عابدہ کے پیر اسے دکھائی دیئے اور ایک پیر کی پنڈلی کھلی ہوئی تھی۔ بھری بھری گوری گوری پنڈلی کچھ عجیب چیز تھی۔ وہ دیکھتا رہا اور عابدہ کو پڑھتے ہوئے سنتا رہا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ایک دفعہ اس پنڈلی سے اس کی پنڈلی چھو جائے۔ عابدہ پڑھتے پڑھتے ایک جگہ پر اٹکی تو اس نے اپنی کرسی کو آگے بڑھایا اور اپنی پنڈلی کو عابدہ کی پنڈلی سے ملا دیا۔ عابدہ نے اپنی پنڈلی ہٹالی اس وقت عارف کو عجیب احساس ہوا۔ عورت کے گوشت کا احساس۔ اس نے اب تک اپنا ہوش سنبھالنے کے بعد اگر کسی عورت کو چھوا تھا تو وہ اس کی بھابی تھی۔ بھابی کو اٹھا لینے

میں اسے عجیب سنسنی محسوس ہوا کرتی تھی مگر اس وقت جو سنسنی اسے محسوس ہوئی تھی وہ بھی تو اسی طرح کی مگر بہت زیادہ گہری بہت زیادہ لطیف جیسے کہ بھابی کے گوشت سے کہیں زیادہ لذیذ گوشت سے وہ ملوث ہوا تھا۔

وہ پڑھا کر اپنے کمرے میں گیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ جو سنسنی اس نے آج محسوس کی تھی اس کا تصور بار بار آتا اور وہ بار بار اس سنسنی کو محسوس کرنے لگتا۔ اس نے اپنے تئیں سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا کہ یہ سنسنی پست چیز تھی اور اگر وہ ایسی چیزوں پر دھیان دے گا تو اس کے ارادوں میں فرق آنے لگے گا۔ اس نے شکن کی یاد میں زندگی گزارنے کی ٹھانی تھی اور وہ ادب کا اعلیٰ عالم اور اعلیٰ ادیب ہوگا۔ اسے ایسی سنسنی خیز باتوں سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ اور وہ کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد قمر نواب اپنا کام دکھانے آئے۔ عارف نے ان کی مشکلات کو حل کیا۔ اور پھر کہنے لگا "اماں قمر سنا تمہاری خالہ بھی دہیں شادی کر دینے پر راضی ہوتی جاتی ہیں"

"خالہ اماں ہاں" اور انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مصرع پڑھا" ع

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

"تعجب تو نہ ہونا چاہیئے۔ آخر ہیں جیتو کی ماں۔ جیتو کی ہیر دازم کا کافی حصہ ان سے ورثہ میں ملا ہوگا"

"ان لوگوں میں کسی میں استقلال نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں اب پڑھ لکھ کے کیا کروں"

"ارے دھمکی ہی سے مرے جا رہے ہو۔ تم جس میں لکھنوی ہیر دازم اتنی کم تھی کہ تم نے اپنے والد کے مرنے کے بعد دکان کی اور اپنی تعلیم جاری رکھی"

"مگر کچھ دل بیٹھا جاتا ہے"

"نہیں۔ عرفی کہتا ہے ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی   حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

ابھی تو محض بات چیت ہے اگر کوئی قدم آگے بڑھایا جائے گا تو ہم مدد کرنے کو تیار ہیں پوری پوری طرح"

قمر نواب چلے گئے اور عارف اپنی کتاب پڑھنے لگا۔ کتاب شیکسپیر کا ڈرامہ "انٹونی اینڈ کلیو پاٹرا" تھی۔ وہ اس ڈرامے کے اس مقام پر پہونچا تھا جہاں کلیو پاٹرا کے جسم کا احساسی اثر بہت گہرا ہو جاتا ہے۔ وہ پہلے بھی اس سین کو پڑھ چکا تھا اور وہ اس اثر کو سمجھتا تھا مگر آج یہ اثر اس کے اعصاب پر طاری ہونے لگا اور اس کے جسم میں عجیب سنسنی دوڑنے لگی۔ اس نے کتاب بند کر دی۔ اس نے سوچا کہ کیا انٹونی کی طرح وہ بھی احساسی تاثرات کا بندہ ہو جائے گا کیا اس پر بھی کوئی ٹریجیڈی چھا جانے والی تھی۔ مگر پھر اسے خیال ہوا کہ وہ اس ڈرامے کا غلط اثر لے رہا تھا۔ وہ ڈرامے کے ایک ٹکڑے ہی میں اٹک کر رہ جاتا تھا۔ پورے ڈرامے کو جو اعلیٰ ٹریجیڈی ضرور ہے اس سنسنی خیزی کی صفائی کرنا چاہیے۔ اور وہ پھر پڑھنے لگا۔ پڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ ڈرامے کو ختم کر ڈالا اور اسے محسوس ہوا کہ سچ مچ اس کے جذبات کی تشکیل ہو گئی۔ وہ اطمینان کے ساتھ آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹا تھا۔

پیر کی چاپ پاکر اس نے آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھا کہ جگو نواب اپنی پوری کج ادائی کے ساتھ سامنے کھڑے ہیں۔ جگو نواب عارف کی مسہری کے پاس آرام کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے "تمہارے بڑے بھائی نے تمہیں بلایا ہے۔ کام زیادہ ہے آجکل تو وہ دفتر سے شام کو آتے ہیں۔ وہ تم سے جلد سے جلد ملنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں خود عارف کے گھر جاتا مگر شام کو تھکا ماندہ آتا ہوں تو کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا"

"بات کیا ہے تم سے کچھ کہا"

"ہاں۔ دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ کہنے لگے کہ نرملا اس کو تباہ کر دے گی۔ جب دیکھو موٹر آ گیا اور اسے ٹھیک سے پڑھنے نہیں دیتی"

"اچھا" اور وہ کچھ دیر کے بعد بولا "اب میں بالکل سمجھ گیا"

"کیا سمجھ گئے؟"

"اب پورا معاملہ صاف ہو گیا۔ دیکھو پورا پلاٹ اس ڈرامے کا یوں ہے۔ نرملا کو فرسٹ آنے کا بڑا شوق ہے۔ بی۔ اے میں کمار فرسٹ تھا اور ٹرمنل امتحانوں میں بھی اس سے بہت آگے رہا۔ چنانچہ اس کو گرانے کی ترکیب شروع کی گئی اور اب جاری ہے۔ اور موقع یوں مل گیا کہ کمار بیٹا خود پھنسنے کو تیار تھے۔ ہیں نے غلطی کی یار۔ میں نے ہی تو ان دونوں کو ملایا تھا۔ تم تو تھے۔ کنووکیشن والے دن سینما میں۔ خیر اس ملا دینے نے ایک موقع دیا۔ نرملا سمجھ گئی کہ یہ بدھو اس اپنے حساب عاشق ہیں اور ان کو نچایا جا سکتا ہے۔"

"تو نرملا کو تم ایسا جانتے ہو۔"

"کیوں۔ وہ ایسی اور اس کی ماں ایسی۔ میاں آپ ہیرو ہیں اور لہٰذا آپ کے تصور میں وہ ہیروئن ہے۔ میرے سامنے وہ خود ہے جیسی وہ ہے حقیقت میں۔"

"اچھا پلاٹ بیان کرو۔ فلسفہ چھوڑو۔"

"خیر کمار کو نچانے کی غرض سے اُسے لفٹ دینے کی ضرورت تھی اس سے واقفیت بڑھانا ضروری تھا تو اس میں ہبلیکر صاحب سے مدد لی گئی۔ اس کی ماں کے اشارے پر ہبلیکر نے پارٹی جھاڑ دی۔ دونوں میں راہ و رسم بڑھ گیا۔ بس اب وہ اس پنڈت پونگے کو پورا پورا الو بنا رہی ہے اور وہ ہل نہیں سکتا بنے گا اور بنے ہی جائیگا۔ اچھا چلو ابھی چل کے اس کے بھائی سے باتیں کریں۔"

"مگر وہ تو دفتر گئے۔ کمار گھر ہی پر ہے۔ میں اوپر اس کے پاس گیا تو بولا کہ مجھ سے اب بالکل پڑھا ہی نہیں جاتا۔ دھیان ہی نہیں جمتا۔"

"وہ مارا۔ لے اب کہاں جاتا ہے۔ یہی تو ترکیب تھی نرملا کی اماں کی۔۔۔۔ چلو اسی وقت ہی چلیں گے اس کا بھائی نہیں تو وہ تو ہو گا ہی۔"

وہ اُٹھ کر کپڑوں کی کھونٹی کے پاس گیا اور پھر پلٹ کر بولا "اماں اب گرمی میں کون کپڑے

پہنے چلو ایسے ہی چلیں گے"

دونوں کمار کے گھر پر پہونچے اور اس کے کمرے میں گئے۔ دیکھا کہ وہ کھرّے پلنگ پر لیٹا تھا سینے پر کتاب رکھی ہوئی تھی اور آنکھیں چھت پر لگی ہوئی تھیں، عارف نے داخل ہوتے ہی کہا "آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مرگئی بکری" اور اس کے پاس پلنگ پر جا بیٹھا اور بولا "کہو بیٹے یہ کیا معاملہ ہے۔ ہم ادھر منیر کی شادی وادی میں گئے ہوئے تھے اور تم نے اپنا یہ حال کرلیا یہ کیا معاملہ ہے؟"

"ارے یار پڑھنے میں دھیان ہی نہیں لگتا۔ امتحان کے کُل نو دن رہ گئے ہیں"

"یہ سب جو ہم کو بنا چکے۔ وہ دیکھو میز پر لگے ہوئے کھڑے ہیں یہ جو ان کو دیکھو غور سے دیکھو۔ ان کے دل میں تمہارے دل سے کم گرمی نہیں مگر دیکھو کوئی فرق نہیں ؎

ہر ایک فصل میں بس مثل سرو ایک ہے رنگ　　　بہار سے انہیں مطلب نہ کچھ خزاں سے غرض

"ارے ان کو کیا فکر۔ سب کچھ معلوم ہے جو آئیگا امتحان میں اور یہ ویسے ہی فرسٹ ہیں اپنی کلاس میں فرسٹ ڈویزن بھی ملجائیگی"

"ہاں یہ پیدائشی ہیرو ہیں۔ اور تم ہو کہ ہیرو ہو ہی نہیں سکتے بالکل۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اب تمہارے ارادے کیا ہیں"

"ارادے؟ ارادے کیسے! یہاں زندگی سے بیزار ہیں"

"اچھا۔ تو یہ ارادے ہیں۔ مگر یہ سب کیوں۔ اب تو دن رات مزے ہی لگتا ہے راوی تو پھر یہ بیزاری کیسی"

"ارے یار وہ آگ کو بھڑکا رہی ہے بجھا نہیں رہی ہے"

"تو تو خود بجھا دے نا"

"میں بجھا دوں۔ کیسے بجھا دوں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں سوسائڈ کرلوں گا"

"سوسائڈ۔ یہ تو بڑی نیک نیت ہے۔ اس کام میں تو دیر کرنا ہی نہ چاہئے۔ ابھی کرلے

ہم دونوں گواہ بھی ہو جائیں گے ..... مگر ٹھہریں انتظام کرتا ہوں“!

اور عارف اچک کر باہر آیا اور زینہ پر کھڑا ہو کر بولا ”ماتا جی : ماتا جی. آنگن میں آیئے“

”کیا ہے بیٹا“ انہوں نے آنگن میں آکر کہا۔

”آپ کے یہاں کوئی پستول۔ بندوق اور نہیں تو کوئی ذرا بڑی اور تیز چھری ہی بھی ہے کہ نہیں“

”ارے کیا کرے گا۔ تو ہمیشہ پگلے پن کی باتیں کرتا ہے“!

”نہیں۔ ماتا بہت سخت ضرورت ہے۔ یہ آپ کا پوت سپوت جو ہے نہیں وہ خودکشی کرنے کو کہہ رہا ہے“!

”آئیں یہ کیا“

کمار کمرے سے باہر نکل آیا اور عارف کے پاس کھڑا ہو کر منہ نیچے کر کے بولا ”ماتا تم اسکی بات نہ سنو۔ یہ یوں ہی پگلا ہے“

”اچھا ماتا اب آپ زحمت نہ کریں۔ میرا مطلب حل ہو گیا۔ جب تک یہ لیٹا تھا تو مجھے یقین تھا کہ یہ خودکشی دل سے کرنا چاہتا ہے تو میں نے دوست کی حیثیت سے اس کی مدد کرنا فرض سمجھا اور آپ کی آخر آپ اس کی ماں ہیں اس کو سب سے زیادہ چاہنے والی آپ کی مدد لینا ضروری سمجھا۔ اب یہ ٹھیک ہو گیا۔ یہاں تک لپک کے آیا اور مسکرا بھی رہا ہے۔ اب میں اسے ٹھیک کروں گا۔ آپ زحمت نہ کریں“

”عارف نے کہا“ اب بھی سوسائڈ کرو گے“

”تو عجب آدمی ہے۔ یہ ماتا سے کہنے کیوں دوڑ گیا“

”یہی تو تیرا علاج ہے۔ مجھے بڑا غصہ آرہا ہے تجھ پر اور نرملا پر بھی۔ اسے جا کر ابھی پھٹکاروں گا چاہے وہ ڈائن اس کی ماں مجھے کھا ہی کیوں نہ جائے“

”ارے آج تجھے کیا ہو گیا ہے“

"یہ سب آگ میری ہی لگائی ہے اور میں ہی اسے بجھاؤں گا۔ کیا تجھے یقین ہے کہ نیرا تجھے چاہتی ہے"

"نہیں وہ فلرٹ ہے مجھے نچا رہی ہے"

"خیر یہاں تک تو تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ مگر جانتے ہو کہ وہ تمہیں ڈسٹرب کرنا چاہتی ہے تاکہ تم پڑھ نہ سکو اور وہ فرسٹ آجائے"

"میں سمجھتا ہوں۔ مگر میں اپنے دل کو کیا کروں"

"دل؟ دیکھو ان کو جتو کو۔ ان کے پاس بھی دل ہے۔ اسی لکھنو کی زمین سے اُگا ہوا دل۔ اسی گومتی کے پانی سے سینچا ہوا دل۔ مگر یار ایک فرق ہے۔ تم برہمن ہو۔ تمہارے خون کا ایک ایک کارپسل بھگتی بھگتی پکارتا ہے اور دل و دماغ دنیا کو ترک کر دینے سو سائڈ کر لینے کی طرف متوجہ ہیں۔ یہ مغل بادشاہوں، لکھنو کے نوابوں کا خون ہیں عشق بھی ایک عیاشانہ جہت ہے ان کے لئے۔ ایک زندگی کا جزو ہے ع خط لکھیں گے گرچہ مضموں کچھ نہ ہو۔ یہ ایک عجیب چیز ہے۔ اس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا،......ان کی ہیروازم میں پہلے عقیدہ کر دیکھ......

"ارے ارے۔ بس۔ ہو چکا تیرا لکچر۔ کوئی کام کی بات کہہ"

"کام کی بات یہ ہے کہ ادھر یہ دس بارہ دن جو ہیں اس میں اگر تم نہیں پڑھو گے تو امتحان میں تمہارے سوالات کا ڈھانچہ تو ٹھیک رہے گا مگر مواد کم ہو جائے گا۔ جو چیزیں جوابات میں لکھنے کے لئے حفظ کرنا ہیں، اور جن سے ہی ممتحن اونچے نمبر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے ان سب سے تمہارے جوابات خالی ہوں گے بس تمہارے نمبر گر جائیں گے۔ بس تو تم گھوٹنا شروع کرو۔ ہم جاتے ہیں۔ آؤ جتو چلیں"

عارف اور جتو نیچے آئے تو ماتا نے اشارے سے انہیں برآمدے میں بلایا۔ عارف اُن کے پلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا ماتا نے چپکے سے کہا "وامیم کی لڑکی دیوانہ بنائے ہے آج صیبوں بڑے نے ڈانٹا"

یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا کہ پاگل ہوا ہے۔ مگر اب ٹھیک کر دیا میں نے ماتا جی۔ آپ ایک کام کیجئے۔ آج شام کو جیسے ہی دائیم کی لڑکی آئے بس آپ دروازے پر پہونچ کے بس اُسے آڑے ہاتھوں لیجئے۔ پھر وہ کبھی نہیں آئے گی اور یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بس میں میں آؤں گا چراغ جلے بڑے بھیا سے ملنے اور دیکھنے کہ آپ نے کیا کیا۔"

اور وہ ماتا کے پاس سے چلا آیا۔ وہ اور جگو موٹر میں بیٹھ کر چلے تو جگو بولے "اب کہاں چلوگے۔"

"کہاں؟ گھر"

"تم نے جو ابھی کہا تھا کہ اس کو بھی جا کے ڈانٹوں گا"

"واہ - واہ - او - ہو - ہو - ع ہم تو قائل ہیں تمہاری دانائی کے۔ اچھا چلو میں تمہیں اس کے گھر پر چھوڑ کے اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ تم اس وقت میرے اور کمار کے درمیان کی سب باتیں بیان کر دینا"

"مگر مجھے ....."

"ہاں تم سے وہ ملنے ہی باہر نہ آئیگی۔ ہائے ہائے۔ یہ ظلم یہ ستم۔ او فلک کج رفتار .... میری مدد کی ضرورت ہے۔ میں ساتھ ساتھ چلوں تمہارے جب کام بنے۔ ہائے کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے۔ میں نے تو کمار کے سامنے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ میری خود اس کے گھر پر جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ خاندانی تعلقات کی بنا پر کبھی کبھی جانا ہی پڑ جاتا ہے۔ مگر اس گھر میں جا کر عجیب پُر اسرار اثر ہوتا ہے بھئی۔ میں نہ جاؤں گا وہاں۔"

"میری خاطر سے"

"تمہاری خاطر۔ تمہاری خاطر۔ تمہارے لئے میں ایک بڑی زبردست تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ اب تک کر چکا ہوتا۔ مگر امتحان ہو جانے دو۔ وہ بھی مدہوش ہو رہی ہے پڑھنے میں آجکل وہ پلان چلاؤں کہ مسز پریتش نرملا کو لے کے تمہارے گھر پہونچے اور کہے لیجئے جگو نواب یہ

تحفہ حاضر ہے"

"سچ؟" اور جتو نواب اس طرح مُسکرائے کہ ان کے ہونٹوں نے ہلال کی شکل بنائی۔

عارف نے ایک نگاہ ان کی طرف ڈالتے ہوئے پھر سٹرک پر توجہ کرتے ہوئے کہا "ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد..... کیا سمجھے شہنشاہ جہانگیر بہادر"

"اور دوسرا مصرع"

"وہ ابھی نہ پڑھو۔ جب بھی میرا نام عارف تمہارا سانگو پانڑا گہ تم یہی مصرع پڑھتے ہوئے نرملا کے لان پر پہونچو اور وہ نورجہاں والا مصرع پڑھے ع کلید میکدہ گم شدہ بود پیدا شد۔ اور تم دوڑ کر اس کا مُنہ چوم لو"

(۵)

جتو نواب کو تیاری کی چھٹی کاٹنا دشوار ہوگئی۔ اس سال ہر لمبی چھٹی کاٹنا ان کے لئے دشوار ہی رہی۔ ہر لمبی چھٹی پندرہ دن کی ہوئی۔ دسہرے کی پندرہ دن۔ بڑے دن کی پندرہ دن اور اب امتحان کی تیاری کے لئے پندرہ دن اور ظاہر تھا کہ ؎

پندرہ دن نہ دیکھے جب گُل کو ۔۔۔ کس طرح چین آئے بُلبُل کو

خیر دسہرے اور بڑے دن کی چھٹیوں میں تو دوستوں کے پاس وقت گزار کے غم غلط ہوگیا تھا۔ مگر اس تیاری کی چھٹی میں تو جس کے یہاں جاتے وہ پڑھنے میں لگا ہوا اور پوری دنیا کی طرف سے بے توجہی برتتا ہوا نظر آتا۔ عارف کے یہاں یہ بے کھٹکے جا سکتے تھے اور وہ ان کے پیچھے پڑھنا چھوڑ کر ان سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ مگر عارف کی فلسفہ زدہ باتوں سے ان کی طبیعت الجھتی حالانکہ محبت میں کامیابی کی امید اگر کسی کے ذریعہ ہو سکتی تھی تو وہ عارف ہی تھا۔ عارف نے انہیں انتظار کرنے کو کہا تھا اور اس سے آگے وہ ابھی کچھ نہیں کرے گا لہٰذا اس کے یہاں جانا بے سود ہی تھا۔ منیر میاں ہاں خالی ستھے۔ ان کی موٹر آخر کو ٹھپ ہی ہوگئی تھی اور نئی بیٹری

کی طاقت نے بھی انجن کو اسٹارٹ کرنے سے جواب دے دیا تھا۔ انہوں نے کالج جانا ترک کر ہی دیا تھا اور اب ان کے والد نے رائے بھی دے دی تھی کہ وہ امتحان میں شریک ہو کر وقت نہ خراب کریں مگر جب سے ان کی شادی ہوئی تھی جب سے انہوں نے گھر سے باہر آنا چھوڑ دیا تھا۔ دن رات یا تو بیوی کے پاس رہتے یا سسرال چلے جاتے۔ لہٰذا ان کے یہاں جانا بھی بیکار تھا۔

اب رہا ان کے خود کے امتحان اور اس کے لئے تیاری کا سوال۔ تو یہ سوال ہی بیکار تھا۔ ان کے استادوں نے کتابیں پڑھاتے وقت وہ سب حصے بتا دئے تھے جو امتحان میں آنے والے تھے اور انہوں نے ان حصّوں کو مع ان کے ترجموں کے درجہ ہی میں نقل کر لیا تھا۔ اس طرح نہ ان کو کبھی کتاب خریدنے کی ضرورت پڑی اور ان حصّوں ہی کو کبھی گھر پر پڑھنے کی ضرورت ہی ہوئی۔ پھر کتابوں پر سوالات جو پرچوں میں آیا کرتے تھے ان کے بابت کچھ تھوڑی سی بندھی ٹکی باتیں ان کے استادوں نے اپنی نوٹ بکوں سے ان کو نوٹ کرا دی تھیں جن کے باہر سے سوالات آنا غیر ممکن تھا۔ جگّو نواب نے ان سب باتوں کو الگ الگ چھوٹے چھوٹے پرچوں پر بہت ہی مہین مہین لکھ کر رکھ لیا تھا تاکہ یاد بھی ہو جائیں اور امتحان میں وقت ضرورت کام آئیں۔ امتحان میں بہترین سے بہترین نمبر لانے کے لئے انہیں جو کچھ بھی پڑھنا لکھنا تھا وہ سب تھوڑے سے پرچوں میں سما گیا تھا۔ ان پرچوں کو تیاری کی چھٹی کے پہلے دن ہی دیکھ کر ان کی طبیعت اکتا چکی تھی لہٰذا اب ان کا خیال بھی کرنا ان کے لئے گراں تھا۔ اس لئے چھٹیاں بالکل بیکار کی چیز معلوم ہو رہی تھیں اور کاٹے نہیں کٹتی تھیں۔

اب کیونکہ کالج جانے کا سوال نہ تھا اس لئے دن کا کھانا بھی جلدی نہیں ملتا تھا اور وہ کافی دیر کر کے پلنگ سے اُٹھتے۔ مگر اکثر کسی وجہ سے جلدی ہی اٹھ بیٹھنا پڑتا تو نو دس بجے کے قریب وہ کہیں کا ایک چکر ضرور لگا آتے۔ اور کچھ نہیں تو نرملا کے گھر کا طواف ہی کر کے گھر واپس آتے۔ غرض بارہ بجے تک گھر واپس آجانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور پھر کھانا

کھا کے تخت پر لیٹ کر حقہ پیتے پیتے سو جانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

ان کی بیوی اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی اپنی لڑکی کو دودھ پلایا کرتیں یا کبھی کبھی وہ ان کو اپنی لات سے چھو کر کہتیں "اے کیا سو گئے۔ ارے کوئی بات ہی چیت کرو" اور وہ چونک کر کہتے "ہونھ۔ کیا بات کروں تم سے جاہل کی لٹھ۔ میں سوچ رہا ہوں۔ سو نہیں رہا ہوں تم کیا سمجھو۔ میرا امتحان قریب ہے" اور وہ قہقہہ مار کر ہنستیں اور اکثر ان پر متواتر ہنستے رہنے کا دورہ پڑ جاتا اس ہنسی کو سن کر انور اور ننکو تو ان کے پاس آتی ہی رہتی تھیں مگر اب قیصر بھی آنے لگی تھی۔ قیصر سے اور ان سے اب بات چیت پھر ہونے لگی تھی۔ پہلے تو کسی بات پر دونوں ایک دوسرے سے بگڑ گئی تھیں مگر ادھر ایک دن ہوا یہ کہ لڑکی کے اچھو ہو گیا اور اس کی سانس رکنے لگی۔ انور جو اسے گود میں لئے ہوئے تھی چلائی کہ "قیصر باجی یہاں آیئے دیکھئے یہ کیا ہوا جاتا ہے" اور قیصر نے آکر لڑکی کو گود میں لیا تھا اس کو کاندھے سے لگا کے تھپ تھپایا اور اس کے کانوں میں پھونکیں چھوڑی تھیں اور اس کی سانس آنے لگ گئی تھی۔ جنو کی بیوی جو اسی دوران میں پیٹ پیٹ کر دعا کر رہی تھیں کہ "یا جناب امیر آیئے مدد کو۔ میری لڑکی کو بچایئے۔ میرے سات بچوں میں یہ ایک پھونسڑا ہے" لڑکی کو ٹھیک ہو جاتے دیکھ کر بولیں "اے بہن تم نے میری بچی کو پھر سے زندگی دی" اور قیصر اور وہ دونوں گلے مل کر پرانی بات بھول گئی تھیں، چنانچہ اب کبھی جنو کی بیوی دالان میں جا کر قیصر کے پلنگ پر بیٹھتیں یا قیصر ان کے کمرے میں آکر ان کے پلنگ پر بیٹھتی اور گھنٹوں گھسر پھسر باتیں ہوا کرتیں۔

جنو نواب تخت پر لیٹے ہوئے اپنے حساب سوچا کرتے اور اگر سوچنے اور تصور کرنے کو ایک ہی قسم کا دماغی عمل سمجھا جائے تو سچ مچ وہ سوتے اور جاگتے سوچا ہی کرتے تھے۔ نرملا کی تصویر ان کے تصور میں ہوتی اور وہ اس کی ایک ایک ادا پر سر دھنتے۔ ان کے دل میں خواہشات کا سیلاب اٹھتا اور وہ بے قرار ہو جاتے۔ مگر ان کا صبر بھی کسی ہیرو کے صبر سے کم نہ تھا کیونکہ وہ کلیجے پر پتھر رکھے لیٹے ہی رہتے۔ ان کو پوری امید تھی کہ ایک دن عارف

انہیں اسی طرح نرملا کے پاس پہونچا دے گا جیسے جہانگیر نورجہاں کے پاس پہونچا تھا اور ہر ہیرو کی طرح امید کو قائم رکھنا چاہے وہ کتنی ہی بڑی حماقت پر مبنی ہو ان کی فطرت کا اہم حصّہ تھا۔ جہانگیر کی طرح وہ بھی نرملا سے وصل کو محض وقت ہی کا سوال سمجھتے تھے اور کیونکہ الحمدؔ صابرین کے خاندان سے تھے اس لئے صبر کے ساتھ وقت کا انتظار کرتے رہنا ان کے خون میں شامل تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ جنّو سوچتے سوچتے خرّاٹے لینے لگ گئے تھے کہ قیصرا آکر اپنی بھاوج کے پاس بیٹھی اور کپڑوں کی باتیں کرنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے وہ بولی "اے بھابی آپ نے وہ جارجٹ بھی دیکھی تھی برات میں کتنی عورتیں دوپٹے اوڑھے تھیں وہاں" مجھے بہت اچھی لگی۔ میں تو ایک ڈوپٹہ بناؤں گی ضرور"

"اے بہن تم جو چاہے کرو۔ تمہیں اکٹھا بیس روپئے مل جاتے ہیں گے مہینہ کے مہینہ ہم کہاں سے کریں گے، بھابھو پانچ روپئے تھماتی ہیں اسی میں سارا پاندان کا خرچہ۔ لڑکی کی دوا بھی اور اوپر سے جو کچھ خرچ ہو"

"میں تو بناؤں گی۔ انور کی شادی میں اوڑھنے کے لئے"

"انور کی شادی ابھی کہاں ہوتی ہے۔ دیکھو"

"اے نہیں۔ اب جلدی ہی ہو گی دیکھ لینا"

"کیا کہیں اور ٹھہری ہے"

"ہاں۔ معلوم نہیں کہاں بھائی ابا اور بھابھو اماں کھسر پھسر کیا کرتے ہیں۔ ہم سے سب سے چھپایا جا رہا ہے۔ مگّو نے یوں ہی سا کچھ سُنا تو مجھ سے کہا کہ انور بیگم کی اب شاید قمر نواب کے ساتھ نہیں ہو گی شادی۔ کہیں اور کی باتیں ہو رہی ہیں۔ خیر اتنا تو مجھے یقین ہی کہ قمر سے اب نہیں ہو سکتی۔ بھائی ابا ہمیشہ نہیں چاہتے تھے اور اب بھابھو اماں بھی نہیں چاہتی ہیں"

"ہئے بی چارہ قمر.... مگر چلو اچھا ہی ہے انور کو وہ پسند نہیں"

"پسند نہیں۔ کیسے معلوم آپ کو"

"اے اب جانے بھی دو۔ میں تو جانتی ہوں"

"اے وہ کبھی کسی مردوے کا ذکر ہی نہیں کرتی۔ ایک دفعہ جب آپ زچہ خانے میں تھیں بٹیا ہوئی تھی اور ہم لوگ چھپا کے بھائی صاحب کے ساتھ چہلم کی زیارت کو گئے نہیں تھے تو جن صاحبزادے کے موٹر میں ہم لوگ آئے تھے ان صاحبزادے کا ذکر وہ کبھی کبھی کر دیتی ہے جب بھی مردوں کی باتیں کرو"

"تو کیا کہتی ہے وہ"

"وہ مردوا بس ایک اچھا معلوم ہوا اور سب یوں ہی ہوتے ہیں۔ ایک وہ نہ معلوم کون ہے۔ خوب یاد آیا۔ اتنے دنوں سے کہتی تھی کہ بھائی صاحب سے کبھی پوچھوں گی کون ہے۔ اللہ بھابھی آپ پوچھئے تو ذری" اور اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں مٹکائیں۔

اس کی بھابی نے اپنے میاں کو ہلا کر کہا "اے سنئے تو ایک بات بتائیے"

وہ جھلا کر ان کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے "کیا ہے۔ آخر ذرا آنکھ لگ گئی تو جگا دیا" اور وہ پھر کروٹ بدل کر سونے لگے۔

قیصر نے کہا "اے بھائی صاحب ایک بات پوچھنا تھی آپ سے بہت دنوں سے۔ اللہ بتا دیجئے"

"کیا" جبو نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"چہلم کے دن جن کے موٹر میں اب کی ہم لوگ آئے تھے وہ کون ہیں گے"

"ہمارے دوست ہیں"

"اے ہے یہ تو معلوم ہے اے کچھ حال بتائیے ان کا"

"کیا کرو گی فضول۔ کیا مطلب ان سے"

"اچھا تو جانے دیجئے"

جتو نواب پھر غافل ہو گئے اور وہ دونوں آپس میں پھر باتیں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد قمر نواب کی انگنائی میں گزرتے ہوئے جھلک دکھائی دی۔ جتو کی بیوی نے پکارا

"اے قمر نواب یہاں آنا"

قمر نواب کمرے میں آئے تو وہ بولیں "اے تم جانتے ہو ان کو جن کے موٹر میں چہلم کے دن یہ اور انور کربلا سے آئی تھیں"

جتو نواب جیسے کہ سوتے ہی میں بولے "یہ ان کو کیا معلوم کون تھا"

"معلوم کیوں نہیں" قمر بولے "عارف تھا۔ اس نے مجھ سے خود بتایا"

"تو وہ کون ہیں" قیصر نے کہا "آپ بتائیے۔ بھائی صاحب کچھ بتاتے ہی نہیں"

"بڑے رئیس کا لڑکا ہے۔ وہ خود اب رئیس ہے۔ باپ جج تھے وہ مر چکے۔ بہت سا روپیہ اور گاؤں داؤں چھوڑ گئے ہیں کوئی تین چار سو کی اس کی خود کی آمدنی ہے۔ بڑا عمدہ آدمی ہے مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے اور بھائی اس کے اچھے وکیل ہیں مگر بڑے کنجوس۔ لیکن کنجوس لوگ ہوتے قاعدے کے ہیں۔ انہوں نے اپنے بھائی کا سب روپیہ اور آمدنی الگ کر دی۔ وہ خود اپنی خوشی سے سب آمدنی اپنی بھاوج کے پاس رہنے دیتا ہے۔ اسے پرواہ نہیں ہے کسی بات کی۔ میرا بڑا رفیق ہے۔ سمجھو آدھی سے زیادہ آمدنی میری دوکان کی اسی کی وجہ سے ہے"

"اور اس کا مذہب کیا ہے"

جتو نواب گڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور بولے "سنی ہے بڑا کٹر شیعوں سے نفرت کرتا ہے"

"واہ۔ واہ۔ واہ" قمر نے ان کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "یہی آپ جانتے ہیں سکو؟"

"اماں۔ عباس علی سے پوچھ لو۔ ہمارے پروفیسر سے پوچھ لو"

"خوب خوب۔ وہ گدھے کیا جانیں"

"نہیں تم ہی بتاؤ قمر" جتو کی بیوی بولیں "یہ کچھ نہیں سمجھتے جو کسی نے کہہ دیا وہ آمنا صدقنا"

جو نواب تخت پر سے اٹھ کر کمرے کے باہر چلے گئے۔ قمر نواب نے کہا "وہ کسی مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتا اور کسی سے تعصب نہیں اس کو۔"

"اے ہٹئے یہ کیسے ہو سکتا ہے" قیصر نے کہا۔

"جانے دو تم لوگ نہیں سمجھ سکتیں"

"اچھا اس کے ماں باپ بھائی سب کیا ہیں؟" جمو کی بیوی نے پوچھا۔

"وہ سب سنّی ہیں"

"تو وہ بھی سنّی ہوا" قیصر بولی "اور سنّی سب تعصبی ہوتے ہیں آخر دیکھتی نہیں ہیں بھابی آپ نور میاں کے گھر والوں کو" اور نور میاں کی بیوی اس کی سگی خالہ ہیں"

"تو تو ضرور کٹّر ہو گا بھائی صاحب سچ کہتے ہیں"

"خیر وہ جو کچھ ہو۔ آدمی بہت عمدہ ہے۔ مجھ سے بہت خلوص رکھتا ہے"

"اچھا آپ کا ایسا دوست ہے تو اک دن کہئے اپنے موٹر میں ہم سب کو عجائب خانہ دکھلائے"

"یہ کون بڑی بات ہے جب کہو"

"اچھا پھر کسی دن رکھئے"

"اس کا امتحان ہو جانے دو پھر جس دن کہو...... اچھا اب میں جاتا ہوں"

وہ چلے گئے۔ قیصر اور دولہن بیگم پھر باتیں کرتی رہیں۔ جمو نواب پھر آ کر تخت پر لیٹ رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھے اور شیروانی الگنی سے اتار کر پہنی۔ ان کی بیوی نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو"

"یوں ہی ذرا حضرت گنج تک ٹہل آؤں۔ لیٹے لیٹے طبیعت اکتا گئی"

اسی وقت جمو کی لڑکی نے سوتے سوتے آنکھیں کھولیں اور ایک زور کی چیخ ماری۔ دولہن بیگم اسے سنبھالنے لگیں مگر اس کی چیخ کا اثر یہ ہوا کہ انور دوڑی ہوئی کمرے میں آئی "اے بھابی کیا ہوا میری بچی کو"

دولہن بیگم نے بچی کے منہ میں دودھ دے دیا اور وہ اب چپ ہو گئی۔ انور واپس جانے لگی تو انہوں نے کہا "اے آؤ میاں ذرا ایک بات ہے"

"کیا بات ہے بھابی"

"اے بیٹھو تو۔ آخر"

"اے بھابھی افسر کے پجامہ کو سیتے سیتے اس میں سوئی لگا کے آئی ہوں۔ وہ یوں ہی پلنگ پر پڑا ہے"
"ہر وقت کام ہی کی پڑی رہتی ہے۔ ذرا دل بہلایا کرو۔ تمہیں ہمارا مردہ پیٹے جو جائے"
انور آکر قیصر کے پاس بیٹھ گئی تو دولہن بیگم نے کہا "بڑی چھپی رستم ہو۔ آج ہمیں معلوم ہوا۔ ہم سے چھپاتی ہو اپنے چہیتے کو"۔

انور کا چہرہ فق ہو گیا اور منہ عجیب لطیف انداز میں کھل گیا۔
"ہاں" دولہن بیگم بولیں "ہم سے اڑتی ہو۔ آج قیصر نے بتا دیا کہ کون پسند ہے تم کو"
"یہ بھابھی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے کبھی کسی مردوے کا ذکر نہیں کیا"
"ہاں۔ بالکل بھولی بن جاؤ۔ اے جہلم کے دن جو اپنے موٹر پر لایا تھا اس پر ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو گئیں"
"اچھا" اور انور کھلکھلا کر ہنسی "یہ قیصر باجی نے لگایا ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ لڑکا بہت تیز ہے اور بڑا ہوشیار معلوم ہوتا ہے"
"اور اس کی صورت شکل کی تو تعریف کی نہیں جیسے۔ کیوں قیصر"
قیصر مسکرائی اور ان کو غور سے دیکھ کے ہنس دی
"مجھے یاد بھی نہیں میں نے کیا کہا اور کب؟ مجھے نہیں کوئی پسند وسند۔ مجھے سب مردوں سے نفرت ہے۔ اللہ بھابھی ہمیں ایسی باتیں نہیں اچھی لگتی ہیں۔ اللہ اب ہم جاتے ہیں"
"جاؤ ہم تمہیں ایسا نہیں سمجھتے تھے کہ ہم سے رازداری کرو گی"
"آپ بھی بھابھی۔ سوت نہ کپاس کولھو میں لٹھم لٹھا۔ آئیں"
"اچھا تم گھبراؤ نہیں ہم تمہیں پھر دکھا دیں گے اسے۔ تم بلائیں نہ لینے لگ جانا اس کی کہیں"
"آپ کو مذاق سوجھا ہے۔ ہم جاتے ہیں" اور وہ پلنگ پر سے اٹھ کر کمرے کے باہر چلی گئی۔
قیصر ہنسنے لگی اور دولہن بیگم پر ہنسی کا دورا پڑ گیا۔

IV

درازدستیِ قاتل کے امتحان...

(۱)

امتحان کے پہلے دن صبح سات بجے سے پہلے کالج کے کواڈرنیگل اور برآمدوں میں لڑکوں کی بھیڑ تھی۔ ایک طرف سب سے الگ عباس علی ایک موٹی کاپی ہاتھ میں لئے ہوئے زور زور سے اور جلدی جلدی پڑھتے ہی جا رہے تھے۔ عارف ان کے پاس سے گزرا۔ اس نے کاپی ان کے ہاتھ سے چھین کر بند کر دی۔ وہ اپنے خاص طریقہ پر باچھیں کاڑھ کر اور آنکھیں بند کرکے اس کو دیکھنے لگے۔ عارف نے کاپی کے ٹائیٹل پر پڑھا "نوٹس آف ڈاکٹر گورد پرسنا" قہقہا مار کر ہنسا اور بولا "کیا انگریزی ہے ڈاکٹر گورد پرسنا کے نوٹس۔ ٹھیک تو ہے"

"تو کیا غلط ہے انگریزی"

"نہیں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ تم رٹتے جاؤ" اور کاپی ان کو پکڑا کر آگے بڑھا۔

برآمدے میں ایک جگہ دیکھا کہ نقوی کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اس نے کہا "بھئی تم آج پرچے کے جواب دینے کے بجائے اپنی ڈسکوریوں کے مارے بھور کر دینا سالے اگزامنر کو۔ مگر یار وہ اپنی شاہکار ڈسکوری کے بابت کچھ نہ لکھنا نہیں تو سالا سے اُڑے گا اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے"

"مگر میرا تو کانکولس کا پرچہ ہے آج"

"ارے میں بھول گیا تھا - تم نرگس لے ہی کہاں پائے - مگر تمہاری ڈسکوریاں کالکوس میں کیا کم ہوں گی"

اتنے میں اسے کمارہ آتا دکھائی دیا - پاس آکر کمارہ اس کے ساتھ ہولیا اور دونوں آگے بڑھے - کمارہ کہنے لگا "نرملا، پرمانک کے ساتھ اسی کے موٹر پر آئی ہے"

"اچھا بھو پھر پیدا ہو گیا"

دونوں ہال کی طرف آرہے تھے کہ کیا دیکھا کہ مصباح منہ ٹیڑھا کئے ہوئے یعنی اپنی طرح پر مسکراتے ہوئے اور مرزا دکھی، کر کے اپنی ہتیلی پر ہتیلی مارتے ہوئے چلے آرہے ہیں - عارف نے بڑھ کر پوچھا "کدھر چلے کیا امتحان نہیں دینا ہے - منیر کی طرح"

"اے صاحب وہ بڑے آدمی کے لڑکے ہیں - ان کے والد نے کہا کہ ایم - اے ماسٹری کرنے کے لئے کیا جاتا ہے اور ڈپٹی کلکٹری کے لئے بی - اے کی زیادہ قدر ہوتی ہے میرا باپ چھوٹا موٹا آدمی وہ تو مجھے کلرکی ہی پر دیکھ کے خوش ہو گا"

"اونھ" کہکر مصباح نے بھویں چڑھائیں -

"تو پھر جا کدھر رہے ہو ہال تو ادھر ہے"

"ہماری سیٹ ہال میں نہیں ہے" مرزا بولے "سنا ہے اوپر ہے"

"یہ اس کی سیٹ پر جا ڈٹے عقلمند آدمی - دس کو نئو سمجھے" مصباح بولے -

"یہ معاملہ ہے" عارف نے کہا "یہ ترکیب تھی اس کی انہیں پھانسنے کی - دس کے آگے ایک صفر بڑھا کے ہٹ گئی ہو گی کہ یہ آکر بیٹھ جائیں اسی طرح جیسے پھٹکی میں چڑیا آجاتی ہے اور پھر ایسے پھنسیں کہ نکل ہی نہ پائیں...... وہ آئی نہیں"

"وہ آتی تو سیٹ پر دیکھا انہیں"

"بس وہیں غش کھا کر گر پڑی ہو گی نہیں تو یہ بچ سکتے تھے"

کمارہ زور سے ہنسا - مصباح نے منہ ٹیڑھا کیا - شاید غصہ آگیا یا مسکرانے والے تھے -

کمار نے عارف کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "چل۔ چل بھائی۔ چھوڑ ان لوگوں کو"

دونوں ہال میں پہونچے۔ نرملا اپنی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائی کمار کی طرف سے منھ موڑ کر اس نے عارف سے کہا "کچھ پڑھائی ٹھیک نہیں ہوئی تم تو خوب پڑھ کر آئے ہوگے"

"خوب تو ہم ہمیشہ پڑھے رہتے ہیں۔ جب کہو تب کوئی بھی سوال ہو اس کا تین گھنٹے جواب لکھنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر امتحان کے لئے کون الو پڑھتا ہے"

"دیکھ کے بات کرو۔ ذاتیات پر حملے ٹھیک نہیں" اور وہ ہنسی۔

"ارے۔ ہاں۔ الو نہیں عقلمند۔ یہ کمار پڑھتا ہے امتحان ہی کے لئے۔ واجبی واجبی چیزیں برق کر لیتا ہے اور دیکھنا فرسٹ ہی ہوگا"

"نہیں۔ میں چاہتا ہوں۔ یہ فرسٹ آئیں" کمار بولا۔

"شکریہ میں خوب سمجھتی ہوں ..... مگر ....."

"مگر وگر کا اب وقت نہیں" عارف نے اپنے ہاتھ پر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اماں وقت ہو گیا۔ ابے ہم نے اپنی سیٹ تک نہیں ڈھونڈھی اور گھنٹی بجا ہی چاہتی ہے"

وہ نرملا کے پاس سے ہٹا اور اپنے داہنے طرف رُخ کیا تو کیا دیکھا کہ جگو نواب اس شان سے تین قطار اُدھر بیٹھے ہیں کہ دونوں پیر اسٹول کی جانب، ٹھڈی اسٹول کی پیٹھ پر جمی ہوئی اور دونوں آنکھیں بیک وقت نرملا کے چہرے پر جم جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ عارف اچھل پڑا اور بولا "دیکھ یہ انداز ہوتا ہے ہیرو انہ"

"ارے سیٹ تو دیکھ لے" کمار نے جگو کو نفرت سے دیکھ کر کہا۔

دونوں خالی سیٹوں کو دیکھنے لگے۔ سیٹیں مل گئیں اور دونوں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد عارف نے جگو کو پکارا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ اُٹھے تو ایسے معلوم ہوئے جیسا کہ کوئی کتا اپنا جسم جھاڑنے سے پہلے معلوم ہوتا ہے اور پھر معلوم ہوا کہ وہ

کپکپاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے مگر اسی وقت گھنٹی کی آواز آئی - دروازے سے چار انویجلیٹر جلدی سے اندر آکر ڈائس پر کھڑے ہو گئے اور بولے "ٹیک یور سیٹس" اب جو مستقل طور پر کانپتے ہوئے معلوم ہوئے اور بے بسی کے عالم میں کبھی عارف کو دیکھتے اور کبھی اپنی سیٹ کو عارف نے ہاتھ کا اشارہ دیا کہ نہ آئیں اور وہ اس طرح اپنی سیٹ پر آ گئے جیسے کوئی ڈوبتا ہوا کسی بہتی ہوئی چیز کا سہارا لے لے۔

امتحان کے گھنٹے گزرتے رہے۔ دوران امتحان میں جو بار بار نرملا کی طرف دیکھتے۔ اس کے بال، اس کا سر اور اس کی میز پر جھکی ہوئی پیٹھ سے عجب پُراسرار طریقہ پر محظوظ ہوتے۔ یوں ہی دیکھتے دیکھتے انہوں نے ایک مرتبہ چاروں طرف دیکھا اور اپنی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر کاپی کے اندر کھسکایا۔ اس کے بعد انہوں نے نرملا کی طرف نہیں دیکھا۔ کاپی کے ورق اِدھر اُدھر اُلٹتے گئے اور لکھتے گئے۔ جو کاغذ انہوں نے کاپی کے اندر کھسکایا تھا اور جس کے وجود نے ان کے قلم میں دریاؤں کی روانی بھر دی تھی وہ ان کے حساب خدا تک کی نظروں سے چھپا ہوا تھا۔ مگر شیطان کی نظروں سے کوئی چیز نہیں چھپ سکتی اور چنانچہ تیسرے گھنٹے میں ان کے بازو کو کسی شیطان کے ہاتھ نے چپکے سے اس طرح چھوا کہ وہ ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ پوری کائنات چکرا گئی۔ اس چکر کے عالم سے جب وہ باہر آئے تو انہوں نے گیا دیکھا کہ کاپی میں چھپایا ہوا کاغذ انویجلیٹر کے ہاتھ میں تھا اور تمام عالم ایک عجیب سکوت کے سمندر میں غرق ہوا جا رہا تھا۔ وہ فوراً رو رو کر کہنے لگے "میں نے اس میں سے نقل نہیں کی۔ اس سے پرچے سے کوئی مطلب نہیں۔ یہ تو یوں ہی دوات کے ساتھ لے آیا تھا۔ دوات کے چاروں طرف لپیٹ کے تاکہ........"

"اور کاپی کے اندر بھی گھس گیا"

"جی ہاں۔ وہ اُدھر سے ہوا آ رہی ہے"

"خیر آپ پرچہ کیجئے" کہکر انویجلیٹر ان کے پاس سے چلے گئے۔ ان کے دل میں

پنکھے لگے ہوئے تھے اور قلم اپنی تمام چوکڑی بھول گیا تھا۔ شاید انگلیوں میں قلم کو پکڑنے کی طاقت بھی جاتی رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے اور نرملا کی طرف دیکھتے رہے اور دل میں ناد علی کا درد بھی کرتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ان کے پروفیسر نمبر ۲ ان کی طرف آتے دکھائی دیے اور ان کے پاس آکر ان کی میز پر جھک گئے۔

"ارے میاں" پروفیسر نہایت ہی دھیمی آواز میں بولے "یہ کیا غضب کر رہے تھے تم۔ وہ لئے جا رہا تھا کہ غدر رجسٹرار کے پاس میں نے بڑی منتیں کر کے لے لیا۔ بڑی مشکل سے مانا۔ نہیں تو نہ معلوم کیا کیا ہوتا اور تم نکالے جاتے اور ہمارا مضمون بدنام ہوتا اور ہماری نوکری جاتی۔ عجب آدمی ہو۔ تم سے کہہ دیا کہ جو چاہو لکھو۔ پاس کرانے کا ہمارا ذمہ ہے جو سمجھ میں آئے لکھتے چلے جاؤ"

اور وہ چلے گئے اور جگو کی جو سمجھ میں آیا وہ لکھتے رہے۔

امتحان ختم ہوا۔ جگو سے کئی لڑکوں نے پوچھا کہ کیا معاملہ تھا تو وہ بولے "کچھ نہیں پرچہ میں ایک غلطی تھی۔ وہ پروفیسر آکر بتا گئے"۔

کمار برآمدے میں آیا تو بہت خوش تھا۔ عارف نکل کر اس کے پاس آیا تو بولا "ابے معجزہ ہو گیا۔ پورے چار سوال میں نے کئے اور پانچواں بھی شروع کر دیا تھا کہ گھنٹہ بج گیا"۔

"تو تو ہم سب سے زیادہ نمبر پائے گا۔ ٹرمنل امتحانوں میں تو تو تین سے زیادہ کبھی نہ کر سکا مگر ہر سوال میں نوے فی صدی پائے اور ٹوٹل میں ہر پرچہ کے ہم سے کوئی دس دس نمبر ہی کم رہا۔ اب تو......"

بات ختم نہ ہوئی کیونکہ نرملا ان دونوں کے پاس آگئی اور بولی "کیا ہوا"

"ہوتا کیا" عارف بولا "اب شاید یہ گھوڑا تم دونوں سے آگے نکل جائے۔ مگر ابھی نہیں اگر کل، پرسوں اور چوتھے پرچے تک برابر میں اتنے ہی سوال کر پاؤں تب خوب ہے

ورنہ تم دونوں بڑھتے ہوئے چلے جاؤ۔ مگر یار پرچہ بہت عمدہ تھا۔ ایک ایک سوال کا جواب شام تک لکھا جا سکتا تھا۔"

نرملا اور کمار نے بھی کہا کہ پرچہ بہت اچھا تھا۔

جتو نواب جھومتے ہوئے ان تینوں کے پاس سے نکل گئے۔

نرملا، عارف اور کمار کو چھوڑ کر ایک طرف چلی گئی۔ عارف ادھر کی طرف بڑھا جدھر جتو گئے تھے اور کمار بھی اس کے ساتھ تھا۔ جتو کے پاس پہونچ کر اس نے اس کا کاندھا پکڑا اور کہا "امام سے تو پوچھنا ہی بیکار ہے کہ پرچہ کیسا ہوا۔ نہ تمہارے یہاں پڑھائی ہوئی نہ تم نے کبھی پڑھا اور آج پرچہ بھی خوب کیا ہوگا اور اچھے نمبر بھی ضرور پاؤ گے نہیں تو تمہارے پروفیسر کی خیریت نہیں۔ سوال اٹھے گا کہ ایک لڑکا اور وہ بھی نہ پاس ہو تو پروفیسری ہی نہ ختم کر دی جائے۔"

جتو کچھ نہ بولے۔ کچھ بانکے ترچھے ہوتے رہے۔ غرض یہ تینوں سڑک پر آئے تو دیکھا کہ پرمانک، نرملا کو موٹر میں بٹھائے لئے جا رہا ہے۔ عارف نے زور سے کہا "ابے پھر آگیا یہ" اس نے منہ نکال کر جواب دیا "کوئی زندگی بھر کے لئے تھوڑی گیا تھا" اور موٹر نکلتی چلی گئی۔

آگے بڑھ کر مصباح اور مرزا ملے۔ مرزا جتو کو دیکھتے ہی بولے "کہئے محبوب صاحب کیا عالم ہے۔ بھلا زہے نصیب کہ محبوبہ اور آپ ایک ہی کمرے میں تین گھنٹے رہے اور فارسی کا پرچہ کرتے رہے جس میں لکھنے سے زیادہ معشوق کو بار بار دیکھ لینے کی ضرورت تھی۔"

"آپ کی چونچ کچھ زیادہ کھلی ہوئی ہے" عارف نے کہا "پھکی میں پھنس کر جو نکل آئے" کمار نے کہا "میں ادھر جاؤں گا میری سائیکل ادھر رکھی ہے"، اور وہ چلا گیا۔

جتو نے مرزا کی طرف اپنی پیٹھ کرتے ہوئے کہا "تم مجھے پہلے چوراہے پر اتار دینا میں اپنے چلا جاؤں گا"

دونوں موٹر پر جا رہے تھے۔ جتو نے کہا "کل رات سے دادی اماں کی حالت خراب ہے"
"اماں۔ ان کی تو شاید ہر ہفتہ حالت خراب ہی ہو جاتی ہے۔ مگر وہ مریں دریں گی نہیں۔
پرانی ہڈی ہیں۔ یہ لوگ بہت جھیل جاتی ہیں"
"اگر مر گئیں تو بھائی ایا مصیبت کر دیا کریں گے۔ ان کی افیم کا خرچہ کہاں سے نکلے گا"
"اچھا تو ان کے زندہ رہنے کی ضرورت بس اسی لئے ہے..... مگر وہ مریں گی نہیں
بہتوں کو مار کے مریں گی"

اور چورا ہا آ گیا۔ جتو اتر گئے۔ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

ہل ہانکنے کو دوں بھانکتے صورت حال سے اس شعر کی تفسیر ؎

لڑکھڑاتے ہیں گرے جاتے ہیں تیرے ناتواں　　اے تری قدرت کے صدقے تھام لے بڑھکر ہمیں

وہ قمر کی دوکان کے پاس سے گزرے۔ قمر کو گھٹنوں پر ٹھڈی ٹیکے غم زدہ بیٹھا دیکھ کر یہ ان کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور بولے "کیوں قمر بھائی کیا بات ہے"

"کچھ نہیں"

"ہمانے کہاں گئے تھے۔ دادی اماں کیسی ہیں"

"ٹھیک ہیں اب تو بالکل" قمر نے غمزدہ لہجہ میں کہا۔

"اور کوئی بات۔ یہ آخر تم بول کس طرح رہے ہو۔ کوئی بات ہوئی"

"تم جاؤ۔ گھر۔ وہاں مٹھائیاں اڑاؤ۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو"

"مٹھائیاں کیسی"

"انور کی سسرال سے امام ضامن آیا ہے جھوؤں میں مٹھائی آئی ہے"

"انور کی سسرال کہاں"

"ارے یاد نہیں وہ اپچے کے زمیندار جو ایک کھڑ کھڑیا موٹر پر منیر کی شادی میں آئے تھے۔ موٹے موٹے کالے کالے سرخ زربفت کی اچکن جو کھانے پر خالو ابا کے پاس بیٹھے تھے"

"اچھا وہ جن کے ساتھ دو لٹھ بند پاسی تھے"

"ہاں وہی ان ہی کا رقعہ آیا اور ساتھ ساتھ اور سب کچھ آیا۔ خالہ اماں نے مجھے رقعہ دکھایا۔ مجھے مبارک باد دی اور بہت ہی خوش ہیں پھولے نہیں سماتیں"

"بھابھو اماں بالکل راضی ہو گئیں"

"ہاں بھائی ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے	جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"

جتو اپنے سر کو بالکل داہنے کندھے پر ڈالے ہوئے ان کے چہرے کو دیکھتے رہے اور پھر چونک کر بولے "اچھا تو میں جا کے دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے"

اور وہ تیزی سے لپکتے ہوئے گھر پہونچے۔ ان کے والد پھوپھی اماں کی طرف تھے اور والدہ اکیلی دالان میں بیٹھی تھیں۔ جتو کو آتا دیکھ کر بولیں "آؤ جتو نواب، دیکھو۔ میں تو بہو کو دوڑا نے والی تھی کہ تم کو بلا لائے ہو گا نگوڑا امتحان دمتحان۔ تو دیکھو یہ رقعہ۔ صبح ہوتے ہی یہ رقعہ بھیجا۔ میں نے قمر سے پڑھوا کے سنا۔ نی معلوم اتنی یا ۹ بجے گاؤں ہیں۔ اور لکھو کھا کوٹھیاں۔ تم۔ تمہارے باپ تو سب کچھ دیکھ ہی چکے تھے میں نے کہلوا دیا منظور ہے ہمیں سولہ ڈوں آنے اور وہاں سے یہ دیکھو دو جھوّلے بھر کے مٹھائی آئی اور یہ دیکھو گنگا جمنی خاصدان اس میں امام ضامن آیا اور میں نے خاصدان پھیرا تو ان کے یہاں کی جو آبو جی آئی تھیں وہ کہنے لگیں کہ ہمارے کہیاں پھیرا نہیں جاتا۔ کوئی تین پاؤ کا ہو گا یہ ضرور"

وہ سب یہ کہتی رہیں اور جتو خاموش رقعہ پڑھتے رہے۔ ان پر اس تمام واقعہ کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ دالان میں سے پلٹ کر اپنے کمرے میں جانے لگے تو دیکھا کہ تکّو اپنا دھرا او لہنگا پہنے کانوں میں سلیمے جھالے لٹکائے سرخ لچکا لگا ہوا دوپٹہ اوڑھے چلی آ رہی ہے۔ وہ لاشعوری طور پر رک کر اسے دیکھنے لگے۔ شاید کسی نفسیاتی رو سے اس کا چہرہ ان کے لئے بالکل نرملا کے چہرہ کی طرح ہو گیا تھا۔ انہیں وہ رات یاد آئی جب انہوں نے اس کو چھیڑنے کی

کوشش کی تھی۔ ان کے دل نے کہا کہ کاش وہ کوشش کامیاب ہوتی اور وہ لپک کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

یہاں ان کی بیوی کے پاس قیصر اور انور بیٹھی تھیں۔ انور سر سے دوپٹہ اوڑھے اور سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے چہرہ پر ایک لطیف سرخی دوڑی ہوئی تھی۔ جبو نواب آ کر تخت پر لیٹ گئے۔ قیصر نے اُن سے پوچھا "اے بھائی صاحب آپ نے تو دیکھا ہوگا اسے جسکے ساتھ شادی ٹھہرائی ہے بھائی ابا نے؟"

"ہاں دیکھا ہے"

"کون ہے؟ کیسا ہے؟" ان کی بیوی نے پوچھا "آپ سے جب کچھ پوچھو بس ہوں ہاں کر کے رہ جاتے ہیں کچھ مفصل حال تو بتایئے"

اس وقت انور پلنگ پر سے اٹھ کر کمرے کے باہر چلی گئی۔

"مفصل کیا؟ رقعہ میں سب کچھ لکھا ہے اور سب کچھ صحیح ہوگا"

"اے آخر آپ نے دیکھا۔ صورت شکل کیسی ہے" قیصر نے پوچھا

"صورت شکل۔ موٹا ہے کانی۔ کالا رنگ ہے۔ اجڈ دیہاتی معلوم ہوتا ہے۔ مگر بنا ٹھنا بہت رہتا ہے اور دو دو نوکر ساتھ لٹھ بند موٹر ہے حالانکہ پرانی کھڑکھڑیا ہے مگر ڈرائیور نوکر ہے۔ اچھا کھاتا پیتا رئیس ہے"

"مگر صورت تو ایسی خراب ہے" قیصر نے کہا

"اے بیوی مردوں کی صورت کون دیکھتا ہے" جبو کی بیوی نے کہا "صورت تو عورتوں کی دیکھی جاتی ہے"

"اور قمر کے لئے بجا بھوا اماں نے کچھ نہیں کہا" جبو نے پوچھا۔

"اے وہ کہتی ہیں قمر کی میں اور اچھی جگہ شادی کروں گی کسی رئیس کی لڑکی سے"

قیصر بولی۔

"ٹھیک تو ہے اس کی بھی کہیں اچھی جگہ ہو جائے گی" جتو کی بیوی نے کہا۔

"وہ تو انور کے ساتھ کرنا چاہتا تھا" جتو نے کہا۔

"مگر بھابھو اماں کہتی ہیں کہ اتنا اچھا ٹھکانا تھوڑی اس کے لئے چھوڑ دیا جائے گا۔ ہم اس کا بھی بھلا چاہتے ہیں اپنا بھی اس کا بھی کہیں اونچی جگہ بیاہ کر دیں گے" قیصر نے جواب دیا۔

جتو نواب خاموش لیٹے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ قمر کو انور سے گہری محبت ہے مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے گھر میں محبت کی کوئی وقعت یا قیمت نہ تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ان عورتوں کو شاید محبت سے کوئی مس ہی نہیں ہوتا اور ان کی نظروں میں تمام عورتیں جانور کے درجے سے بھی گری جا رہی تھیں کہ ان کی بیوی کی آواز ان کے کان میں آئی۔ وہ کہہ رہی تھیں

"ہائے بچارا قمر" اور جتو نے فوراً تخت پر کروٹ لے کر بڑے غور سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ انہیں بڑا تعجب ہوا کہ ان کی بیوی جن کو وہ دنیا کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ بے حس سمجھتے تھے ان میں کسی عاشق کی ناکامی پر ترس کھانے کا مادہ تھا۔

"کیوں؟ قمر؟" وہ بولے "ہاں بیچارے کے پٹ پٹ آنسو ٹپک پڑے"

"اے۔ رو رہا تھا۔ ہا" ان کی بیوی نے کہا۔

"اے مردوے ایسے ہی ہوتے ہیں سب اپنے وقت پر مظلوم بن جاتے ہیں اور دوسرے کے وقت پر شیر، پھاڑ کھانے کو تیار۔ مجھے ترس نہیں آتا قمر کے رونے پر، بیوی" قیصر نے کہا۔

اور جتو نے ایک آنکھ سے اپنی بیوی اور دوسری آنکھ سے بہن کو دیکھا۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ کس سے ہمدردی کریں اور انہوں نے کسی طرف رائے دینے کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔

(۲)

امتحان کے چاروں پرچے ختم ہو گئے۔ نرملا نے سب پرچے حسب دلخواہ کئے تھے مگر ایک طرف تو اسے کمار کے بازی لے جانے کا ڈر تھا ہی اور دوسری طرف اسے حارث سے

کھٹکا ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ عارف نے دو پرچے بالکل پورے پورے کئے تھے اور ۲ دو میں
وہ بس ایک ہی ایک سوال چھوڑ آیا تھا۔ اس نے کمار کو یہ کہتے سنا تھا کہ عارف کا فرسٹ
ہو جانا اب کچھ لازمی سا معلوم ہوتا ہے اور اس لئے اسے یہ خوف تھا کہ اس کی پوزیشن کہیں
تھرڈ نہ ہو جائے۔ اس نے اپنی والدہ سے تمام حالات بیان کئے اور ان سے دریافت کیا کہ
اب کیا کرنا چاہئے۔ انہوں نے اپنی لڑکی کی فکر دور کرنے کے لئے یہ سامان کیا کہ ایم اے
کو پڑھانے والے تین پروفیسروں اور دو مخصوص طالب علموں کو چائے پر بلا لیا۔

چائے ختم ہو چکی تھی اور اب سات افراد کی یہ پارٹی لان پر باتوں میں مصروف تھی۔
تین پروفیسروں میں ایک ہبلیکر تھے ہی۔ دوسرے ایک نہایت ذہین اور شاندار صورت
بنگالی پروفیسر رہا تھے اور تیسرے ایک صورت سے فوجی انگریز پروفیسر تھمسن تھے۔ مسز ترلش
نے یہ باتیں کرتے کرتے عارف کی طرف دیکھا اور کہا "اس لڑکے کے بابت آپ کی کیا رائے ہے؟"

"نہایت قابل، نہایت ذہین" رہا نے کہا ؟"

"یہ فرسٹ نہیں ہو سکتا"

"نہیں۔ امتحان ایک کاروبار ہے اور مسلمانوں میں کاروباری رجحان شاذ و نادر ہی ہوتا ہے"

عارف پر غمزدگی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ شکن کا تصور اس کی نگاہوں کے سامنے تھا مگر یہ
الفاظ سن کر وہ چونک پڑا۔ اسے آج پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ شکن ہندو تھی اور وہ مسلمان
یعنی ایسے مختلف جانور جیسے گائے اور بھینس۔ اس کا دل جو افسردگی کے سیلاب میں ڈوبا
جا رہا تھا ایک دم سے باہر نکل آیا وہ پروفیسر رہا کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہے تھے "مجھے
بائیس برس پڑھاتے ہو گئے۔ ہمیشہ تین اچھے لڑکوں میں ایک مسلمان ضرور ہوتا ہے۔"

عارف اس وقت اس گھر میں پہلی دفعہ پورے پورے طور پر اپنے ہوش میں آ گیا
تھا۔ بچپن سے ہر وقت اس کا ہندوؤں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا رہا مگر اس وقت اسے پہلی دفعہ
محسوس ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔ ایک ایسی چیز جس کو دوسرے ہندوستانیوں سے الگ

رکھا جا سکتا ہے۔ تیکن کی یاد اس کے دل سے بالکل غائب ہو گئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر رہا کو دیکھ رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ یہ شخص جس کو حد سے زیادہ عالم، ذہین، تربیت یافتہ اور ہردل عزیز سمجھا جاتا تھا حقیقت میں تنگ نظر اور متعصب ہے۔

اس کی نگاہ کمار اور نرملا پر بھی پڑی جنہوں نے اس بات پر آپس میں کانا پھسکیاں کیں اور دونوں کے چہرے کھِل گئے۔

"مجھے" تمسن نے کہا "ہندو اور مسلمانوں میں کوئی خاص فرق نہیں محسوس ہوتا۔ شاید اس لئے کہ میں ایک غیر ملک کا باشندہ ہوں۔ مگر عارف مجھے اس قسم کے لوگوں میں سے ایک نظر پڑتا ہے جن کو نشٹے نے آزاد روح کہا ہے۔ میکالے کا نصب العین یہ تھا کہ تعلیم کے ذریعہ ہندوستان میں ایسے افراد پیدا ہوں جن کا قالب تو ہندوستانی ہو مگر روح انگریزی ہو۔ عارف ہم لوگوں میں سے ایک معلوم ہوتا ہے۔ بالکل آزاد روح۔"

تمسن کی زبان سے یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔ رہا نے کن انکھیوں سے پہلے عارف کو اور پھر تمسن کو دیکھا۔ ہیبلیکر "ام، کہکر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ رہا نے عارف کی طرف رخ کر کے پوچھا۔

"تم کو بی۔ اے میں تو سکنڈ ڈویژن ملی تھی" اور کمار کی طرف رخ کر کے کہا "اور تم فرسٹ فرسٹ تھے" پھر مسز پرشی کو متوجہ کرتے ہوئے "یہ نرملا تو فرسٹ سکنڈ تھی۔ لڑکیوں کا دل بڑھانا چاہئے۔ میرے خیال میں اگر یہ کمار سے آگے نہ نکل سکی تو اس کے برابر آ جائیگی۔"

"ام۔ام" ہیبلیکر سے نہ رہا گیا "اگر عارف نے سب سوال کئے تو وہ بھی ان سے پیچھے نہ رہے گا۔"

"اس کے جوابات بیکار کے لئے طولانی ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کو مختصر کر سکتا ہے مگر اسے قابو ہی نہیں اپنی طبیعت پر۔"

"میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں" تمسن نے کہا "اس کے جواب بالکل ٹھوس ہوتے

ہیں۔ اس کے معلومات بہت ہیں اور انگریزی بالکل اہل زبان کی طرح لکھتا"۔

"اب ہم لوگوں کو چلنا چاہیئے" کہکر رہا اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب اٹھ کر باہر آئے۔ پروفیسر سب ہیبلیکر کی موٹر میں چلے گئے۔

عارف کمار کو پاس بٹھا کر روانہ ہوا تو اس نے کہا "کیا سمجھے بیٹے"

"نرملا اب فرسٹ ہو جائیگی"

"ہاں۔ اس وقت ہمارے امتحان کا پانچواں پرچہ ختم ہوا اور اس میں نیرا کو سو فیصدی نمبر مل گئے"

"تو تو بہت سنجیدہ بنا ہوا تھا"

"وہ سب سنجیدگی رہا سالے نے غائب کر دی۔ تجھ سے تو نیرا سے گاڑھی چھنی"

"ہاں یار۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آپ کے گھر والوں نے مجھ سے بدتمیزی کی مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ میں آپ سے خفا ہو گئی"

"اور وہ پرماتک کو جو لٹکائے پھرتی ہے؟"

"اس کے لئے تو وہ کہہ چکی ہے کہ ماما نے سر چڑھا دیا ہے وہ خود نہیں چاہتی"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آج ہمارے پروفیسر رہا ہمیں ایک نیا لفظ سکھا گئے۔ بزنس لائک۔ کاروباری۔ وہ رہ رہ کے مجھے یاد آ رہا ہے۔ اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہندوستان کی قوموں میں کون قوم زیادہ کاروباری ہے اور کون کم۔ موضوع اچھا ہے سوچنے کے لئے"

"اس کو یہی لفظ یاد ہے۔ اکثر مضامین پر بھی یہی ریمارک کر دیتا تھا ہمارے"

"ہاں میرے مضامین پر بھی اکثر اس نے ناٹ بزنس لائک کہا۔ مگر اس لفظ کے گہرے معنے مجھے اس نے اس وقت ہی بتائے"

"تم خواہ مخواہ کا فلسفہ چھانٹنے لگتے ہو"

"ارے۔ تو بھی نہیں سمجھ سکا۔ اچھا چھوڑ اس بات کو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تو ہی پنڈت

اور پنڈت اتنا بزنس لائک نہیں ہو سکتا جتنی کہ نرملا جو بنیا قوم سے ہے۔ لہذا پرمانک ایک لکھ پتی کا لڑکا۔ پورے صوبے میں اس کے باپ کی تجارت پھیلی ہوئی۔ وہ نرملا کے لئے کیسے بور ہو سکتا ہے"۔

"کہتی تو وہ یہی ہے"

"خیر اب گل چھرے اڑاؤ۔ تمہارے بھائی نے اور ماں نے ہم سے کہا تھا تو ہم نے روکا تھا۔ اب کیا ہے۔ تم جو چاہو کرو"

دونوں کمار کے گھر پہونچے۔ کمار اوپر چڑھتا چلا گیا اور عارف چلا آیا۔

عارف جب گلی سے نکل کر سڑک پر آیا تو اسے محسوس ہوا کہ آج وہ ایک نئی کیفیت سے دوچار ہوا تھا۔ اس کا دل گھر واپس جا کر خاموش پڑ رہنے کو نہیں چاہتا تھا اس کے دل میں غم جاناں کو کسی طاقت نے دھکیل کر نکال دیا تھا۔ سڑک پر تھوڑی ہی دور جا کر اسے خیال ہوا کہ کسی سناٹے کی سڑک پر جائے اور موٹر کو خوب تیز چلائے۔ کچھ دیر میں وہ شہر سے باہر نکل کر دریا کے کنارے والی سڑک پر آگیا۔ غم عشق کا احساس کیوں آج نہ ہوا۔ بے انصافی کے احساس نے اسے بالکل دبا دیا۔ ہاں بے انصافی دیکھئے تو یہ دنیا کیا کرتی ہے۔ کتنے خود غرض متعصب لوگ ہیں یہ۔ اسے خیال ہوا کہ راغب حسین زیدی سچ کہتے تھے کہ میں ان لوگوں کو غلط سمجھ رہا تھا۔ راغب بہت ہی تنگ نظر آدمی ہے۔ وہ صحیح کہتے ہیں اور میرا اندازہ غلط ہے۔ بالکل صحیح ...... ارے ہاں زیدی کا بھائی اگزامینیشن کلرک ہے۔ ان سے پتہ چل جائیگا کہ کیسے اور کس حد تک بے انصافی کی جائیگی ......

عارف نے گھڑی کو دیکھا۔ ساڑھے چھ کا وقت تھا۔ اس نے موٹر ایک سڑک پر موڑا جو پرانے شہر کو جاتی تھی۔ راغب صاحب کے محلہ میں پہونچ کر موٹر کو اس نے سڑک پر چھوڑا اور گلیوں میں ہوتا ہوا ان کے گھر کی گلی میں پہونچا۔ راغب صاحب ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور دوسری کرسی پر پاؤں پھیلائے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں تسبیح تھی اور ہونٹ ہل رہے تھے۔ عارف کو آتا

دیکھ کر انہوں نے تسبیح کو چوم کر منہ پر ہاتھ پھیرے اور کہا "آؤ میاں عارف کیسے آئے خیریت - آصف تو اچھے ہیں"

"بھائی بارہ بجے گئے ہیں مقدمہ ہے ایک"

"اور لاری سے گئے ہوں گے - اما اتنا روپیہ کیا کریں گے - ایک موٹر نہیں لے لیتے جب تمہارے والد کا انتقال ہوا تو دو دو موٹریں تھیں دونوں بیچ ڈالیں....."

"خیر - بھائی جان کا جو جی چاہے کریں..... میں آپ کے پاس ایک خاص غرض سے آیا ہوں"

"ہاں - ہاں بتاؤ کیا"

"آپ سچ کہتے تھے یہ لوگ چاہے کتنے ہی عالم ہو جائیں مگر تنگ نظری کمینہ پن ان کا نہیں جا سکتا - آج مجھے احساس ہوا - یہ رہا جو ہے وہ مجھے ضرور گرائیگا"

"تم اس کی بڑی تعریف کرتے تھے کہ ایسا عمدہ پڑھاتا ہے اور ایسا ذہین اور قابل ہے"

"خیر وہ جانے دیجئے - آج مسٹر پریش کے یہاں پارٹی میں اس نے ایسی باتیں کیں کہ میں کیا کہوں - جو پرچہ اس کا ہے وہ میں نے سب پرچوں میں زیادہ اچھا کیا ہے - سب سوال کئے ہیں اور بہت اچھے مگر وہ مجھے کم نمبر دیگا ضرور"

"اب تو نہ تعریف کرو گے اس کی"

"دیکھئے جہاں تک اس کی قابلیت کا تعلق ہے وہ تعریف کے قابل ہے مگر..."

"اف فوہ - بس یہی اگر مگر تو تم کو ڈبو دے گی وہ کمینہ کیا قابل ہو سکتا ہے - ہمیشہ اس نے مسلمانوں کو گرایا - اس حرامی کا تو نام گالیاں دے کے لینا چاہیئے"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ میرے نرملا کے اور رکمار کے ہر پرچہ میں الگ الگ نمبروں کا پتہ اپنے بھائی سے لگا لیجئے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کس نے کتنے نمبر پائے اور اس رہا نے میرے ساتھ کس قدر دراز دستی کی"

"ایک کاغذ پر اپنے رول نمبر لکھ دو"

راغب صاحب اٹھ کر گھر میں گئے اور ایک کاپی سے پھاڑا ہوا کاغذ لے آئے۔ عارف اس پر رول نمبر لکھ دیئے۔ اُنہوں نے اس کو لے لیا۔ عارف وہاں سے چلا آیا۔ موٹر میں آکر بیٹھا تو اُسے خیال ہوا کہ اپنی خالہ کے گھر بھی ہوتا جائے۔ چنانچہ وہ خالہ کے گھر پہونچا۔ پھاٹک میں سے گزر کر انگنائی میں اس نے موٹر روکی اور اترا۔ اوپر مرزا کی طرف سے آواز آئی "آداب عرض ہے عارف صاحب" عارف نے منہ اٹھا کر دیکھا تو مرزا کھڑکی پر کھڑے تھے۔

"اما گھر نہیں گئے؟" عارف نے پوچھا

"آج دس بجے والی گاڑی سے ہم دونوں جا رہے ہیں"

عارف پلٹا تو اس کی نگاہ کونے میں تمیز کی موٹر پر گئی اور پھر اس نے منہ پھیر کر مرزا سے پوچھا "کیوں مرزا اس موٹر کا کیا حال ہے"

"بس چھٹ چکی۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ اب انجن کا دم نکل گیا۔ میں نے رائے دی کہ اسے دیہات ہی لے جائیں اور بیل جوت کے چلایا کریں" اور مرزا کھی کھی کرنے لگے۔

"بھئی کہی تو خوب۔ میں بھی ان کو یہی رائے دیتا ہوں"

"وہ ہیں کہاں گئے ہوئے ہیں سسرال"

"تو خیر خالہ وغیرہ تو ہوں گی"

"خالہ بھی ہیں اور وغیرہ بھی۔ کھی کھی کھی"

وہ گھر کے اندر گیا۔ باجی انگنائی میں چہل قدمی کر رہی تھیں اور خود سے کچھ باتیں بھی کرتی جاتی تھیں۔ خالہ انگنائی میں اپنے پلنگ پر بیٹھی منہ بنائے آنکھوں سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

خالہ کو سلام کر کے اس نے پوچھا "کیوں خالہ یہ کیا؟"

"یہی تمہارے خالو نے اپنی لن ترانیوں میں سب گھر کا گھر وارا گو دیا"

باجی بھی پاس آگئیں اور عارف نے ان کی طرف رخ کر کے پوچھا "یہ سب کیا ہے باجی"

"ہے کیا منیر میاں کی دولہن کو آنتوں کی دق ہے"

"آئیں! ایک تو بڑی۔ دوسرے بدصورت۔ تیسرے بیمار۔ خیر روپیہ تو ہے۔ خالو کو تو اس سے مطلب تھا"

"خاک" کہکر خالہ نے اپنا مُنہ بسورا اور ان کی ناک پر سے پٹ پٹ آنسو گرے اور روتی ہوئی وہ بولیں "میں کہتی تھی کہ نوکر ہو جائے تو شادی ہوئے۔ مگر ایک نہ مانے وہ خاک پیٹے"

"تو وہ گاؤں گراؤں کیا ہوئے۔ اور منیر نے تو مجھ سے کہا تھا کہ پرانی پیکار ڈکار رہے تھے۔ میں نے کہا ئی لوں گا تو اب نئی آنے والی ہے دس ہزار کی کلکتہ سے"

"دس ہزار۔ کبھی خواب میں بھی دیکھے ہوں گے ان ناس کاٹوں نے۔ ہائے میرے بچے کو بھی بہکا دیا" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"تو یہ سب ہوا ہی تھی۔ اف فوہ۔ خالو اتنے بڑے ہوا باز ہیں"

باجی پھر انگنائی میں ٹہلنے لگیں اور خالہ کی ناک پر سے اب ایک پوری دھار ٹپکنے لگی۔ تھوڑی دیر سکوت رہا۔ پھر خالہ آنکھیں اور ناک اپنے دوپٹہ سے پونچھتے ہوئے بولیں "بڑے پیر ساب میرے بچے کو بچائیں" اور پھر ان کی ناک سے دھار جاری ہو گئی۔

"خالہ آپ روئیے نہ۔ دونوں کو کچھ عرصہ کے لئے الگ کر دیجئے اور دولہن کا باقاعدہ علاج کرائیے"

"وہ خاک پیٹا کچھ کرنے بھی دے۔ لن ترانیوں میں یہی کہتا ہے کہ جھوٹ۔ وہ بالکل تندرست ہے"

اندھیرا چھانے لگا اور عارف اٹھ کر چلا آیا۔

گھر واپس ہوتے ہوئے راستے میں قمر کی دوکان پر رکا تو دیکھا کہ قمر اکڑوں گھٹنوں میں سر کئے بیٹھے ہیں۔ موٹر سے اتر کر وہ دوکان کے پاس آیا اور قمر کو ملایا۔ قمر نے منہ اٹھایا چہرے کو دیکھ کر عارف نے کہا "ارے یہ چہرہ کیسا ہو رہا ہے۔ کیا رو رہے تھے؟ "

پختہ گان عشق کو رونے سے کیا کام اے ظفر   آگ میں آنسو ٹپکتا ہے کباب خام سے"

"نہیں" اور قمر نے بہت لمبی ٹھنڈی سانس بھری

"یہ معاملہ کیا ہے۔ کل سے تم آنسے لگو ہمارا امتحان ختم ہو گیا۔ اور کل اتوار ہے کل چلو تمہاری ان سب کو عجائب خانہ بھی دکھا دیں"

قمر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "اب وہ لوگ نہ جائیں گی۔ اب مجھے پڑھ کر بھی کیا کرنا ہے"

"ارے کیا ہوا۔ کچھ بات بھی"

"جتو نے تمہیں نہیں بتایا"

"جتو سے مجھ سے بس پہلے دن امتحان کے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد سے دہ گھنٹہ بجنے پر آتے ہیں اور ادھر امتحان ختم ہوا اور وہ غائب۔ دو دن معلوم نہیں ہوا کہاں جاتے ہیں۔ آج کمارے نے بتایا کہ پرمانک کے چپراسی کا کام انجام دیتے ہیں"

"چپراسی"

"ہاں پرمانک کے موٹر کا دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔ صاحب اور میم صاحب بیٹھ گئے۔ موٹر چلدی یہ سلام کئے کھڑے رہے۔ تم کیا سمجھو ہیرو کی یہ بھی شان ہے خدمت خلق"

"اچھا تو سنو جس روز تمہارا پہلا پرچہ تھا اس دن وہی اچیچے کے زمیندار کے ساتھ جن کو تم نے مگدر کہا تھا منیر کی شادی میں ان ہی کے ساتھ سب بات چیت طے ہو گئی اور اب استخارہ ہو کر تاریخ بھی مقرر ہو گئی"

"آئیں۔ یہ کیسے۔ اتنی جلدی۔ اچھا میں ابھی جا کر جتو کے والد کو سمجھاؤں گا"

"ان کی سمجھ میں نہیں آئیگا اور پھر وہ نہ معلوم کیا کیا بکیں تم جانے دو"

"تو زبردستی کرنا پڑے گی" اور عارف تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا "اچھا یار سنو۔ تم ان سب کو لے چلو کل عجائب خانہ دکھانے اور ہم کسی اور شہر پہونچ جائیں جیسے بارہ بنکی اور تمہارا نکاح کروا دیں"

"آئیں" کہکر قمر کچھ کانپ گئے اور بولے "نہیں۔ یہ بڑی بُری بات ہے"

"واہ۔ تم بھی پورے پورے ہیرو ہی ہو یار۔ حمی قدم سے اتنے بے نیاز"

"میری ہمت نہیں پڑتی"

"وہ لوگ اب ہرگز نہ جائیں گی اور اگر قمر قیصرِ جہاں اور جتو کی دولہن چلیں بھی تو انور کو تو خالہ اماں ہرگز نہ جانے دیں گی اس کی تاریخ ٹھہر گئی ہے"

"مگر یار۔ یہ تو نہ ہونے دیا جائے کوئی نہ کوئی ترکیب ضرور ہونا چاہیئے نواب مرزا سے کچھ کام چلے گا؟"

"مجھے تو آگے کوئی امید نہیں" اور قمر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے "تم جو چاہو کرو"

"اچھا سوچوں گا" کہکر عارف چلا آیا۔

دوسرے دن صبح کو نواب مرزا صاحب بہادر جب بیڑی کا دھواں اُڑاتے اور پپ پپ کرتے عارف کے کمرے میں داخل ہوئے تو عارف نے ان سے کہا "موٹر بعد میں دیکھئے گا آج آپ سے ایک خاص مشورہ کرنا ہے پہلے"۔

وہ اپنا ہاتھ موچھوں کی طرف لے گئے اور عارف نے غور سے دیکھا کہ ان کی موچھوں کا صفایا ہو چکا ہے اور اس نے کہا۔

"آئیں یہ آپ کی موچھیں کیا ہوئیں؟"

"ارے بھائی کیا بتاؤں آپ کو۔ میری سسرال میں شادی انور نے کہا کہ آپ کی یہ دمیں کش نے کتر ڈالیں تو شاش نے بہت جھڑکا اور کہا ایسی بچہ نہیں اب کل شادی ہونے والی ہے۔ وہ جب سے بالکل چپ رہنے لگی ہے۔ ہاں تو میں نے کہا کہ بیڑی جلانے میں دیا سلائی ہاتھ سے چھوٹ گئی بس بھر سے جل گئیں"

"اور ان لوگوں کو یقین بھی آگیا۔ یہ نہ سوچا کہ دیا سلائی ہاتھ سے چھوٹ کر اوپر کیسے گئی کہ موچھوں کو جلاتی ہوئی نکل گئی۔ کوئی ہوائی تھی"

"اے میاں - وہ پورا خاندان بمعہ جنو سمیت الو کے پٹھے ہیں۔ سب مان گئے ٹھیک ہے"
"مگر اصل بات کیا ہے ؟"
"آپ کو کیا بتاؤں آپ ابھی بچے ہیں یعنی چالڈ ہیں۔ آپ سے کوئی بات چھپانا تھوڑی ہے۔ یہی مزے ہیں عشٹ کے" اور ان کی کھیسیں بالکل نکل آئیں "آپ کیا سمجھیں۔ معشوٹ نے کہا کہ تمہاری موچھیں بُری لگتی ہیں بش اس وقت نہیں دکھائی دیتا کہ منہ اچھا لگے گا کہ بُرا۔ بش فوراً لپک کے بڑی بی سے قینچی لے آیا اور کتر ڈالیں"۔
"اچھا تو یہ جوش عشق میں ناز معشوق پر صدقے کر دی گئیں"
"آپ تو عربی فارسی بولنے لگے۔ بش غرض کہ" دولہا بھائی کھڑے ہو گئے اور ایکٹ کر کے بتانے لگے "یوں وہ لیٹی دی تھی پلنگ پر اور ادھر سے میں قینچی لے کر آیا اور کہا لو دیکھو اور کھچ کھچ کھچ سب صاف کر دیں"
"واہ نواب واہ - ہیں نہ پورے نواب - مگر آپ سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔ قمر کی حالت آپ دیکھتے ہیں"
"ارے وہ تو بیدم ہو گیا شالا - انور کی شادی ٹھہر گئی اور راشن کا دم آدھا نکل گیا، آدھا باقی ہے۔ میں نے کہا میں بیش جگہ تیری شادی کراتا ہوں ایک سے ایک اشی۔ دش دش ہزار روپیہ جہیز میں ملے"۔
"نہیں وہ انور ہی سے شادی کرے گا۔ اسے سچا عشق ہے"!
"عشٹ - واہ آپ نے بھی پورے چالڈ پنے کی بات کہی۔ عشٹ کہیں بہو بیٹیوں شے ہوا کرتا ہے - واہ" اور وہ قہقہا مار کر ہنسے۔
"خیر - آپ کوئی ترکیب نکالئے کہ قمر ہی کے ساتھ ہو انور کی"
"نا نا" انہوں نے اپنا سر ڈگڈگی کی طرح ہلایا اور داہنے ہاتھ کو سانپ کے پھن کی طرح ادھر ادھر پھرایا اور بولے "اب کش نہیں ہو شکتا۔ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت تو اب

رونے سے کیا ہوتا ہے"

"آپ اپنی ساس سے کہئے کہ وہ غریب مر جائے گا"

"آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں - وہ قمر شالا مرے ورے گا نہیں - یوں ہی شنک شنک کے چلتا رہے گا"

"خیر میں چاہتا ہوں کہ قمر ہی کے ساتھ شادی ہو اور آپ کو کوئی ترکیب کرنا پڑیگی"

دولہا بھائی نے اپنے گول دیدے مٹکا کے عارف کو دیکھا اور بولے "اونھ ہوں اب کوئی ترکیب نہیں چل سکتی - ماں باپ دونوں فراٹے بھر رہے ہیں فراٹے - فراٹے"

"تو پھر اب کسی طرح ان کی رائے نہیں پلٹ سکتی"

"ہرگز نہیں"

"اچھا تو اب زبردستی کرنا پڑے گی - ہم انور کو قمر سے بھگوا دیں گے"

یہ سنتے ہی دولہا بھائی اچک کر کھڑے ہو گئے اور بولے "ارے - ارے - یہ غضب - ارے ہمارے پورے خاندان کی ناک" انہوں نے بائیں ہاتھ کی چٹکی سے اپنی مختصر ناک پکڑی اور داہنے ہاتھ کی انگلی اس پر پھیرتے ہوئے بولے "کٹ جائیگی بالکل - ایسا نہیں کیجئے گا ہی نہیں"

"ایسا ہی کرنا پڑے گا"

"ارے آپ کو کیا پڑی جو پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالیے"

"اس سے قمر کو عشق ہے اور میں ......"

"عشٹ" دولہا بھائی بات کاٹتے ہوئے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے "پھر وہی عشٹ - آپ نہیں جانتے عشٹ کیا ہوتا ہے - قمر کو بالکل عشٹ نہیں"

"کیوں - کیوں نہیں ہے عشق"

"آپ کی کتابوں والا - وہ لیلیٰ مجنوں والا عشٹ ہوگا اس کو - لاحول ولا قوت"

"تو لیلیٰ مجنوں والا عشق عشق نہیں ہوتا"

"بالکل نہیں۔ یہاں مردہ عجائب گھر میں تصویریں لگی ہیں۔ ایک تصویر میں لیلےٰ مجنوں ہیں۔ واہ کیا چوگھٹ تصویر ہے۔ لیلےٰ کھڑی دی ہے مجنوں بالکل سینک سلائی سے بیٹھے دے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دم نکلا جارہا ہے۔ یہ کوئی عشق ہے۔ اگر مجنوں شاہ کو عشق ہوتا تو لیلےٰ کا کھڑا رہنا کیا معنے فوراً دبوچ لیتا اس کو جیسے ہی آئی تھی وہ شامنے"

"تو آپ کی رائے میں عشق ایسی کچھ چیز ہے"

"ہاں۔ دیکھئے" اور انہوں نے بائیں ہاتھ کی مٹھی باندھی اور بولے "یہ جیسے کوئی چڑیا بیٹھی دی ہے" اور داہنے ہاتھ کو پھیلا کے یوں گھمایا جیسے کوئی پرندہ اڑتا ہے اور کہا "یہ چیل آرہی ہے اور یوں آکر چڑیا کو جھپٹا مار کے لے اڑی" اور اپنے داہنے پنجے میں بائیں مٹھی پکڑلی اور بولے "یہ ہوتا ہے عشق سچ مچ کا"

عارف نے ان کی حرکت کو غور سے دیکھا اور کچھ سکوت کے بعد کہا "کہتے تو ٹھیک ہیں آپ ؏ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق"

"واللہ۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ کیا شاعر ہے۔ میرے دل کی بات کہدی۔ بس جیسے بلی بے کھٹک دھم سے کودی اور کبوتر کو اٹھا کے لے گئی۔ یہی ہوتا ہے عشق۔ قمر شالا کیا جانے"

عارف مسکرایا مگر سنجیدہ ہو کر بولا "خیر مجھے قمر کی شادی کسی طرح کرانی ضرور ہے اور اس میں آپ کو مدد کرنی پڑے گی میری"

"اشا۔ آپ نہیں مانتے جو بھی کہئے ضرور کیجئے۔ میں ضرور مدد کروں گا گلے گلے پانی"

"دیکھئے ترکیب یہ ہے کہ اک دن قمر نے کہا تھا کہ میں اپنے موٹر میں قیصر انور اور جتھو کی بیوی کو زندہ عجائب گھر دکھالاؤں۔ مگر اب قمر نے بالکل ڈھیل ڈالدیا کہتا ہے کہ وہ نہ جائیں گی۔ آپ اب ان لوگوں سے کہئے اور راضی کیجئے۔ جب وہ چلیں گی تو قمر کو ساتھ لیں گے اور بجائے عجائب خانے کے بارہ بنکی پہونچ جائیں گے اور وہاں قمر کا نکاح کر دیں گے انور کے ساتھ"

"واہ۔ خوب۔ خوب۔ خوب ترکیب سوچی آپ نے۔ واللہ یہی کیا جائے۔ یہ دونوں شاش

ششرے شب فراٹے بھرنا بھول جائیں۔ کہتی کیا ہیں وہ شاش کہ تمہیں وہ بڑا کام دلوا دے گا۔
میں واللہ نعلت ہے جو ہم تلف کے ہاتھ دیکھوں۔ واللہ شب ٹیں بھول جائیگی ششری"

"تو سب ٹھیک رہا"

"بالکل ٹھیک۔ اب کی اتوار کو ہمیں بھی تو چھٹی ہے شاتھ چلنے کی"

اور پھر دونوں کمرے کے باہر آکر موٹر کو دھلوانے میں مصروف ہو گئے۔

(۳)

"کل سے امتحان ہے" عارف کی بھابی نے کہا "ایسا پڑھانا کہ پاس ضرور ہو"

"واہ۔ یہ عین وقت پر ہم پر ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے۔ پہلے سے کہا ہوتا کہ پاس کرانے کے لئے پڑھانا ہے تو شاید کچھ ہو بھی سکتا"

"پاس کرانے کے لئے نہیں تو کیا تیرے سر کے لئے پڑھوایا جا رہا ہے۔ لڑکے"

"اس کے لئے تو نہیں کم از کم دو سال اور پڑھانے کی ضرورت ہے۔ بالکل کچھ آتا ہی نہیں۔ ہائی اسکول کوئی تماشہ مقرر کر لیا ہے آپ نے"

"اور گھر پر ماسٹر سے جو پڑھتی تھی"

"اپنا سر پڑھتی تھیں یا پھر ماسٹر کا سر پڑھتی تھیں۔ خط بالکل چوتھے درجہ کے لڑکوں کا سا۔ گرامر بالکل صفا۔ الفاظ آتے ہی نہیں۔ ایک جملہ بھی ٹھیک نہیں لکھ سکتیں۔ کتابیں بالکل تیج ہی نہیں پڑھیں۔ سب وقت خراب ہو رہا ہے۔ آپ کا حکم ہے میں بجا لا رہا ہوں"

"وہ ماسٹر جو پڑھاتے تھے ان کی تو بڑی تعریفیں سنی ہیں۔ حساب میں تو بڑے قابل مشہور ہیں"

"یہاں حساب تو نہیں کچھ آتا ہے۔ مگر خالی حساب ہی تھوڑے ہے۔ اس کے ساتھ الجبرا اور جامٹری ہے وہ بالکل کوری۔ کوئی خالہ جی کا گھر ہے۔ یہ کہا کس نے کہ امتحان دھڑ سے دلا دیا جائے۔ شاید اُن ماسٹر صاحب نے کہا ہو گا۔ گدھے کے بچے۔ اپنی ٹیوشن کے مارے بڑے بڑے

سبز باغ دکھانا جانتے ہیں یہ ماسٹر لوگ "

"ارے یہ تو پاگل ہوا ہے۔ یہ کیا بکنے لگا"

"کچھ نہیں۔ یہ ہرگز نہیں پاس ہو سکتیں۔ کسی مضمون میں نہیں سوائے اردو کے"

"واہ۔ کیوں نہیں پاس ہوں گی۔ تم کسی کی قسمت دیکھ آئے ہو"

"خوب قسمت۔ اگر یہ پاس ہوگئیں تو پارسال لاڈو کو امتحان میں بٹھا دینا وہ بھی پاس ہو جائے گی یا بدھو کو بٹھا دیا جائے وہ تو اخبار پر تاریخ دیکھ لیتا ہے۔ صفا فرسٹ آجائیگا"

"فضول کی بکواس مت کرو۔ سیدھے سیدھے بیٹھ کے پڑھاؤ" اور بھابی نے اس انداز سے بھویں چڑھا کر درشتی کی نگاہ سے اُسے دیکھا کہ اس کے لئے سوائے حکم بجا لانے کے اور کوئی چارہ ہی نہ رہا۔

پڑھائی ہوتی رہی۔ بھابی خاموش لیٹی رہیں۔ کچھ دیر کے بعد عارف کی پنڈلی پر اس کی شاگردہ کی پنڈلی آکر چپ سے لگی۔ عارف نے میز کے نیچے دیکھا تو پردہ کے ادھر صرف جوتیوں کی نوکیں دکھائی دیں۔ اس سلسلہ میں کافی دن ہوئے کہ اس نے ایک عزم باندھا تھا مگر وہ عزم موم کی طرح پگھل کر دھواں بن کر اڑ چکا تھا اور اب روز اس کی شاگردہ کی پنڈلی کے درمیان ایک لطیف ڈرامائی کشمکش جاری رہتی تھی۔ یہ میز کے نیچے والے واقعات اس وقت ہوتے جب بھابی سو گئی ہوتیں یا برآمدے سے اٹھ کر کہیں چلی گئی ہوتیں۔

آج جیسے ہی عارف کی نگاہ جوتیوں کی نوکوں پر پڑی ویسے ہی پردہ کے اُدھر اسے ایک ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی شاگردہ جیت کی ہنسی ہنس رہی ہے اور اس کو شکست ہو گئی۔

اسی وقت بھابی خراٹے لیتے لیتے جیسے کہ نیند پھاڑ کر بولیں "یہ ہنسی کاہے کی"

"آئیں بھابھی آپ سو نہیں رہی ہیں۔ یہ آپ کے پیٹ میں ہمارا بچہ جو ہے وہ شاید آج بڑی زبردست دوڑ لگا رہا ہے"

"یہ کیا بدتمیزی؟"

"بات یہ ہے بھابی کہ جب سے وہ ڈاکٹرنی آپ کو دیکھ کر گئی اور یہ کہہ گئی کہ لڑکا پیٹ میں دوڑ بہت رہا ہے تب سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لڑکا تین چوتھائی سے زیادہ یعنی روپیہ میں قریب چودہ آنے میرا ہے اور باقی بھائی صاحب کا"

"ارے ۔ ارے بدتمیز تجھے یہ بھی دھیان نہیں کہ پردہ کے اُدھر ایک بن بیاہی لڑکی بیٹھی ہے"

"وہ کچھ نہیں سمجھتیں ۔ اور سمجھیں بھی تو ان کے لئے سمجھنا ضروری ہے ۔ یہ بھی علم ہے اور پھر استاد کی ہر بات سنجیدگی سے سننا چاہیے ...... یہ بچہ اتنا زیادہ میرا ہے آپ کو بالکل شک نہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ اس قدر دوڑتا ہے ۔ بھائی جان ٹھس آدمی ۔ ان کے بچے بھی ٹھس ۔ ارے رونے تک میں ٹھس ہیں ۔ ہم تیز آدمی ......"

"بس ۔ بس ۔ بس ۔ نہیں مارتی ہوں جوتی کھینچ کے!"

"یہی تو آپ کی بری عادت ہے کہ ہماری بات پوری نہیں سنتیں ۔ واہ کیا ناقدری دنیا ہے ۔ ہم ایسی زبردست تو بات کہتے ہیں کہ دنیا کے سارے حقائق اس کے سامنے گرد ہیں اور جس کو سنانا ہے بات وہ بیزار ہے ؏

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"

پردے کے اُدھر سے پھر کھلکھلاہٹ کی آواز آئی ۔ عارف خاموش ہو گیا ۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی شاگردہ غالب کے اس شعر کو شاید اپنے اوپر لے گئیں ۔

خیر پھر پڑھائی ہونے لگی ۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی پنڈلی پر عابدہ کی پنڈلی آ کر لگی اور الگ ہو گئی ۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ عابدہ نے غالب کے شعر کے کیا معنے لگائے ۔ اس نے بھابی کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا "بھابی سو گئیں؟"

"نہیں ۔ کیا ہے؟"

"بات یہ ہے بھابی کہ آپ کی یہ بہن تو امتحان میں فیل ہوں گی ہی۔ اس میں جو شک کرے وہ کافر۔ مگر اب ہم بھی فیل ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں"

"تم کیسے فیل ہو گے ؟"

"اے صاحب۔ ہم نے پڑھ لکھ کے جو کچھ حاصل کیا تھا عقل۔ ہوش۔ غرض وہ سب آپ نے درازدستی سے اپنی بہن کو ہم سے پڑھوا کر بالکل گڑبڑ کر دیا۔ اب ہمارے اندر کوئی دم ہی نہیں رہ گیا۔ بس آپ پاس ہو گئیں اور میں فیل"

"یہ کیا گول گول باتیں کر رہا ہے ؟"

"اچھا جانے دیجئے۔ آپ کی موٹی عقل کے لئے یہ بات بہت ہی باریک ہے"

عارف پڑھاتا رہا۔ میز کے نیچے پنڈلیوں کا تصادم بھی جاری رہا۔ پڑھائی ختم ہو گئی تو عارف اٹھ کر اپنی بھابی کے پلنگ کی پٹی پر جا بیٹھا اور بولا "بھابی ایک واقعہ سنو۔ بڑا دلچسپ"

"ہٹ بیہودے"

"نہیں۔ آپ کے ولیعہد بہادر زاہد صاحب کا نہایت دلچسپ کارنامہ۔ اس لڑکے میں بھی ہمارے خون کا بہت کافی حصہ شامل ہے"

"پھر وہی بیہودگی۔ آج تو اچھی طرح پٹے گا میرے ہاتھ سے"

"اچھا واقعہ بعد میں سننا۔ پہلے یہ قسم سے بتا دو کہ زاہد کے پیدا ہونے سے پیشتر میں تمہارے پاس نہیں سویا کرتا تھا"

بھابی ہنس کر بولی "تو اس وقت سات آٹھ برس کا تو تھا ہی۔ میں تجھے اپنے پاس سلا لیتی تھی"

"خیر ہمارے سن سے کچھ نہیں ہوتا۔ لڑکے میں ہمارا حصہ مسلّم۔ خیر تو ہوا یہ کہ پچھواڑے والی کھڑکی کے پاس تو میری مسہری بچھی ہی ہوئی ہے۔ میں لیٹا پڑھ رہا تھا کہ میرے کان میں آواز آئی "چھوڑ دے تو بتاؤں سالے۔ چھوڑ دے تو بتاؤں سالے" میں پلنگ پر بیٹھ گیا تو دیکھا کہ اُدھر

بغیچہ میں بدھو کا لونڈا میاں زاہد کے دونوں ہاتھ پکڑے کھڑا ہے اور یہ تلملا تلملا کے کہہ رہے ہیں "چھوڑ دے تو بتاؤں سالے۔ ابھی ڈھیر کر دوں تیرا سالے" میں نے چیخ کے کہا "واہ اتنی تو طاقت ہے نہیں کہ ہاتھ چھڑا لیں اور ڈھیر کر دینے کی ہمت ہے" میری آواز سنتے ہی ادھر کی طرف بھاگ کر غائب۔ میں نے بدھو والے سے پوچھا 'ابے کیا بات ہے'، تو وہ بولا "ہمکا گھی لگے مارن۔ ہم ہاتھ پکڑ لیہا۔ تو چھڑائے ناہیں پاوت رہیں" اور چلا گیا"

عارف ہنسا اور سب ہنسنے لگے۔

پھر عارف بولا "تو یہی حال ہے ہمارا تمہارے آگے۔ جیسے اس لونڈے کی یہ ہمت تو تھی نہیں کہ مار سکے۔ ویسے ہی تم ہمیں جو چاہے کہو ہماری ہمت جوابی حملے کی نہیں۔ بس تمہارے دونوں ہاتھ پکڑ لیں گے تاکہ ہمیں اور زیادہ نہ مار سکو"

بھابی اٹھ کر بیٹھیں۔ عارف کھڑا ہو گیا "اب تم مارنے ہی والی ہو۔ میں چلا" اور باہر چلا آیا"

اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹ کر اسے خیال ہوا کہ اس قصہ میں عابدہ نے کوئی معنے نہیں پہنا لئے۔ مگر "اونھ ہو گا" کہکر اس نے سرہانے سے اسٹیونسن کے مضامین کا مجموعہ "درجنس پور سک" اٹھایا۔ اس کتاب کو اس نے آج ہی شروع کیا تھا اور اس کے شروع والے مضامین جو شادی کے بابت ہیں ان کو وہ پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے وہ اس جملہ پر آیا جس کا مطلب ہے کہ موت کی طرح شادی سے بھی چھٹکارہ ناممکن ہے۔ وہ چونک پڑا اور سوچنے لگا "یہ گیا۔ مرنا تو ہر ایک کو ہے مگر یہ ضروری تو نہیں کہ ہر ایک شادی ضرور کرے۔ شادی اپنی مرضی کی چیز ہے۔ چاہے آدمی کرے یا نہ کرے۔ بہت لوگ نہیں کرتے۔ اسٹیونسن کی رائے صحیح نہیں.... مگر بات تو کچھ ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ بس شادی بھی شاید سیل فنا کی طرح آتا ہو اور انسان کو اس سیل میں بہہ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا ہو۔ اسٹیونسن کا تجربہ یہی ہو گا۔ حقیقت یہی ہو...... مگر نہیں شادی مناسب چیز نہیں۔ بیکن نے کہا نہیں ہے کہ بیوی اور بچے انسان کے ہر بڑے

کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ ہر اُس شخص کو جسے کوئی بڑا کام کرنے کا امبشن ہو ہرگز شادی نہ کرنا چاہیئے۔ مانا کہ شادی موت کے طوفان کی طرح آئے مگر اُسے اس طوفان کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ان کے ساتھ بہہ نہ جانا چاہیئے۔۔۔۔۔" اور پھر وہ کتاب کھول کر پڑھتا رہا اور بیچ بیچ میں اسی طرح سوچتا رہا۔

شادی والے مضامین ختم کر کے اس نے محبت والا مضمون شروع کیا۔ اس نے وہ جملہ پڑھا جس کا مفہوم ہے کہ اس مسبب الاسباب دنیا میں محبت ہی ایسی چیز ہے جو اسباب سے بالاتر ہے۔ "آئیں اس کا کیا مطلب" اس نے سوچا "محبت اندھی ہوتی ہے۔ ٹھیک۔ مگر اس جملے کے اس سے زیادہ کچھ اور معنے ہیں۔ یا نواب مرزا بہادر نے جو محبت کی تعریف کی تھی وہ مضحکہ خیز ہے مگر ہے یہی کچھ۔ چیل چڑیا کو جھپٹا مار کر لے گئی۔ اقبال نے زیادہ سنجیدہ طریقہ پر کہا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل تھی محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور نواب مرزا بہادر کود پڑنے کو لے اُڑے اور کیا بولے کہ بلی کبوتر پر کود پڑی اور دبوچ کر لے گئی۔۔۔۔۔۔

اس وقت کھڑکی میں سے کاغذ کا ایک گولا آ کر اس کے پیٹ پر گرا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے باہر دیکھا کہ ایک نہایت سڈول جسم کی لڑکی —— جوانی کا مجسمہ بھاگی ہوئی جا رہی ہے۔ اس نے فوراً محسوس کیا کہ جیسے وہ خود بلّی ہے اور وہ لڑکی کبوتری ہے اور جی بے تحاشہ یہ چاہا کہ کھڑکی میں سے کود کر اس لڑکی کو دبوچ لے۔ مگر کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور وہ تاکتا ہی رہ گیا تھا۔

جیسے کہ تھک کر وہ مسہری پر پڑ گیا۔ جیسے کہ اس نے بجلی تیزی سے کوندتی ہوئی دیکھی۔ وہ تیزی کے ساتھ دوڑتا جاتا ہوا جسم اس کے سامنے تھا اور اس میں ایک عجیب لذت تھی جوانی روانی۔ رونہ مستی۔ اب تک اس نے دو اور لڑکیوں کو غور سے دیکھا تھا۔ ایک اس کے تصور میں بسی ہوئی اس کی روح میں گھلی ہوئی شگن اس کا جسم عجیب نازک جسم تھا۔ آسمانی جسم۔ فرشتوں

کا سا جسم محویت میں ڈال دینے والا جسم۔ خود کو بھلا دینے والا فنا فی اللہ کر دینے والا جسم،
دوسری انور جس کی اس نے محض شکل ہی دیکھی تھی جسم برقع میں ڈھکا ہوا تھا۔ مگر جو لڑکی اس وقت
اُس کے سامنے سے گزر کر گئی تھی اس کی صورت اس نے دیکھی ہی نہیں اور اس کا جسم بالکل
نئے قسم کا اثر ڈالنے والا جسم تھا۔ کبوتری کا جسم جو بلی کو اپنی زبان سے اپنے ہونٹ چاٹنے
پر مجبور کر رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ لڑکی عابدہ کے سوا کوئی نہیں تھی جو بنگلے کے پچھواڑے والے
دروازے سے بغیچہ میں ہو کر اس پر کاغذ کا گولا پھینکنے آئی تھی۔ وہ اسے چھیڑنا چاہتی تھی۔ اف۔
وہ نہ جانتا تھا کہ اس کا جسم ایسا قیامت ہے۔

اس نے کاغذ کے گولے کو اٹھا کر کھولا۔ حساب کی کاپی کا کاغذ تھا۔ اس پر سوال کئے
ہوئے تھے اور کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ اس نے ہر طرف پھیر کر کاغذ کو دیکھا۔ کہیں پر بھی کوئی ایسا
لفظ تک نہ تھا جس سے اسے محبت نامہ تصور کیا جا سکے۔ اور اس پر جو حساب کا سوال کیا ہوا
تھا وہ بھی چھٹے درجہ کا تھا۔ زاہد کی کاپی کا کاغذ تھا۔ اس نے پھر گولا بنا کر کھڑکی سے باہر پھینک
دیا۔ مگر وہ نئی کیفیت جو اس نے محسوس کی تھی وہ اب تک طاری تھی۔ بلکہ تمام دن اور تمام
رات طاری رہی۔

دوسرے دن تڑکے ہی اٹھا یا گیا تاکہ اپنی موٹر میں عابدہ کو امتحان دلوانے لے جائے
وہ گراج سے موٹر نکال کر پورٹیکو میں لایا اور اسٹیرنگ پر بیٹھا رہا۔ بھابی عابدہ کو برقع میں لپیٹا ہوا
ساتھ لئے آئیں اور پچھلی سیٹ پر بٹھا کر عارف سے بولیں "تم جلدی سے انہیں اسکول اتار کر آؤ
تو ناشتہ کرو۔ میں انتظار کر رہی ہوں"

کوئی پانچ منٹ میں عارف نے اسکول کے پھاٹک پر موٹر روک دی اور اتر کر پیچھے
کا دروازہ کھولا۔ عابدہ دروازے میں سے نکلنے لگیں تو برقع میں پیر الجھا اور منہ کے بل آ ہی
رہتیں کہ عارف نے بڑھ کر ان کو سنبھال لیا۔ عارف کے ہاتھوں میں سنبھلتے ہی وہ مچھلی کی
طرح تڑپ کر اسکول کے پھاٹک میں ہو رہیں۔

عارف اسٹیرنگ پر آکر بیٹھا تو اس پر ایک اور نئی کیفیت طاری تھی۔ اس کے ہاتھ ایک عجیب قسم کی نئی لذت سے ہمکنار ہوئے تھے۔ اسے اپنی بھابی کے جسم کا احساس تھا۔ مگر جس جسم کا اُسے اس وقت احساس ہوا تھا اس کے مقابلے میں بھابی کا جسم بالکل پھیکا۔ ٹھنڈا بے مزہ تھا۔ حالانکہ کئی کپڑوں کی تہوں کے اندر وہ جسم تھا مگر اس کی لذت سے ہاتھ محظوظ ہوئے۔ اس کے جسم میں کچھ زیادہ زور پیدا ہو گیا تھا اور وہ تیزی کے ساتھ موٹر واپس لئے آرہا تھا۔

گھر کے اندر پہونچا تو بھابی ناشتے کا سامان لگائے بیٹھی تھیں۔ گھر کے اور سب لوگ اب تک سو رہے تھے۔ بھابی پیالی میں چائے انڈیلنے لگیں۔ اس نے کہا "بھابی اب تم اپنی بہن سے میری شادی کرا دو"

"بھابی نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا" اور کہا "اچھا۔ یہ ارادے ہیں۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوگی۔ اور تمہارے ساتھ کیوں ہو۔ اس کی کئی اور جگہ بات چیت ہے"

"اچھا۔ تو یہ معاملہ ہے۔ سیدھی انگلیوں کبھی آج تک گھی نہیں نکلا"

"کیا کہا تم نے"

"کچھ نہیں بھابی۔ میں نے مذاق میں کہا تم سے۔ میں شادی وادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتا۔ ہاں تم سے شادی کر سکتا تھا۔ مگر اب اگر تم بھی راضی ہو جاؤ تو تم سے بھی شادی نہ کروں اب طبیعت ہٹ گئی بالکل ہٹ گئی۔ اچھا ہوا جو تم نے آج تک مجھ سے شادی نہیں کی میری طبیعت ہٹ جاتی اور تم نہ بھائی جان کی رہتیں اور نہ میری"

بھابی کچھ نہ بولیں۔ عارف ناشتہ کر کے باہر آیا مسہری پر لیٹا تو اس کے ہاتھوں میں وہی سنسنی دوڑ گئی جو عابدہ کے جسم کو چھونے سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ تذبذب میں تھا۔

اور اسی تذبذب میں وہ کئی دن تک رہا۔

---

(۴)

کمار اور نرملا سے کافی گاڑھی چھننے لگی - ایک ہفتہ تک وہ برابر نرملا کے گھر جاتا رہا اور اس سے گھنٹوں باتوں میں محو ہوتا رہا - اس کے بڑے بھائی اور ماں کو اس معاملہ کی خبر لگی تو انہوں نے اس کو اس کے منجھلے بھائی کے پاس بنارس بھیجدیا - اس کا جی ہرگز جانے کو نہ چاہتا تھا - مگر منجھلے بھائی کے خط پر خط آرہے تھے اور منجھلی بھابی کو واپس بھیج آنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی گھر میں تھا ہی نہیں - اس لئے اسے مجبوراً جانا ہی پڑا - مگر بنارس میں اس کا دل نہ لگا اور وہ تین ہی دن کے بعد واپس آگیا - اپریل کی دس تاریخ کو قریب دو بجے وہ گھر واپس پہونچا .

چار بجے درزی کے یہاں جاکر اپنا بڑھیا سلک کا سوٹ لایا - پھر نہا دھوکر سوٹ پہنا - بالوں میں تیل لگاکر خوب اچھی طرح کنگھا کیا - منہ پر کریم لگاکر پوڈر ملا - کپڑوں میں سنٹ لگایا - اپنی پیٹی میں سے ایک بنڈل نکال کر گھر سے باہر آیا - قریب چھ بجے وہ عارف کے گھر پہونچا عارف اپنے بنگلے میں لان پر لیٹا ہوا رابرٹ برنس کی نظمیں پڑھ رہا تھا - کمار کو دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھا اور بولا .

"ابے - تو آگیا ؟ کب ؟ اور پھر کمار کو سر سے پیر تک غور سے دیکھ کر کہتا رہا - اوخ خوہ - گبرو جوان بنا ہوا ہے - یہ بال - یہ مُنہ پر پوڈر - ابے لپ اسٹک بھی لگا لیتا ہونٹوں پر منیر تو لگایا کرتے ہیں - اور یہ ٹائی اور سوٹ سلک کا - یار اب دنیا بالکل اوندھ گئی ہے - پرانے زمانے میں عاشق کپڑے پھاڑ ڈالا کرتے تھے اور اب عاشق معشوق سے زیادہ سنگھار کرنے لگ جاتے ہیں . . . . اور یہ پارسل کیسا ہمارے لئے لایا ہے کچھ بنارس سے "

"ماں سے میں نے یہی کہا کہ عارف نے کچھ چیزیں منگائی تھیں وہی اس کو دینے جارہا ہوں "

"تو لا ہم کو دے دے"

"ارے یہ تو ان سے بہانہ کیا۔ اس میں بنارسی بھرت کے گلدان ہیں اور ایک بنارسی ساڑی ہے"

"او ہو۔ محبت کا تحفہ ہے۔ اچھا اور خود بھی پورا پورا تحفہ بنے ہوئے ہو۔ مگر نہیں۔ ع

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

معلوم ہوتے ہو پورے ہو نگے ہی۔ بناؤ سنگھار سے قطع نہ بدلی۔ یہ عیاشی کا دورہ برا پڑ رہا ہے یار۔ یہ آٹھویں درجہ سے برابر اسکالرشپ جو ملتی رہی اور اس میں سے بچا بچا کے جو روپے رکھتے رہے اور وہ اسی لئے تھے۔ کوئی چار سو ساٹھ تھے جب تو نے مجھے کتاب دکھائی تھی۔ اب کتنے رہ گئے"

"ارے چھوڑو یہ باتیں۔ چلو ہمارے ساتھ اس کو یہ دے آئیں"

"واہ واہ۔ یہ ہم ساتھ چلیں۔ خوب۔ آخر کیوں۔ بر دکھوا جا رہا ہے۔ معشوق کو تحفہ دینے جا رہا ہے اور ہم بھی ساتھ چلیں کیا تک ہے ؟"

"کچھ مجھے جھجک۔ ڈر۔ نروسنیس معلوم ہوتی ہے"

"واہ استاد واہ تم بھی لکھنوی ہیرو نکل گئے۔ جو تو ہیں ہی پیدائشی ہیرو۔ قمر بھی پورا ہیرو ہو گیا۔ اس سے میرے ہلانے پر بھی، جھنجھوڑنے پر بھی ہلا نہیں جاتا۔ منیر کی ہو ٹر بول گئی اور شادی ہو گئی اور اب وہ بھی ہیرو ہو گئے۔ اور تو بھی ہیرو ہو گیا بغیر ہمارے معشوق کو تحفہ دینے میں جھجک، خوف، ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کیکپی چڑھی ہوئی ہے۔ اس گومتی کے پانی میں یہی اثر ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے بھی ہیرو نہ بن ہی جانا پڑے"

"تو تم نہیں چلو گے"

"ارے کوئی بات بھی۔ تو وہاں اتنی دفعہ آیا گیا۔ اور پھر جھجکتا ہے۔ کبھی اس کا بوسہ لینے کا موقع آجائے تو وہ ڈر کے آنا ہیں بلائے جانا کہیں اُدونوں کے منہ پکڑ کے ہمارے

ہونٹ سے ہونٹ ملادو۔ ارے کوئی بات بھی ہے۔ میری کیا ضرورت۔ جا اور دے آ اپنا تحفہ"

"اچھا تو ہم کو اکیلے ہی جانا چاہیئے"

"اور نہیں تو کیا ایک فوج لے کر جائیگا۔ مگر یار ایک بات بتاؤ تم کرنے والے کیا ہو۔ میری اب تک یہی نہیں سمجھ میں آیا کہ تمہارے پریم کا ایم کیا ہے"

"وہ مجھ سے فلرٹ کرنا چاہتی ہے کہ نہیں؟"

"ہاں۔ وہ سب ہی سے فلرٹ کرنا چاہتی ہے سوائے جتو کے۔ تجھ سے کوئی خاص طور پر نہیں"

"خیر۔ مگر میں اس سے خاص طور پر فلرٹ کرنا چاہتا ہوں اور کچھ دنوں میں دل بھر جائیگا اور معاملہ ختم۔ اور وہ پہاڑوں پر بھی تو چلی جائیگی ایک دو ہفتے میں"

"اب میں سمجھا۔ وہ چار سو ساٹھ روپے کھیلا رہے ہیں اور جب وہ ختم ہو جائیں گے تو عشق بھی تشریف لے جائیگا۔ یہ معاملہ ہے سارا۔ یہ سوٹ۔ یہ تحفہ۔ اور آگے جو بھی خرچہ ہو سب اسی میں سے ہوگا"

"اس وقت میٹر آف فیکٹ باتیں مت کرو"

"ہاں آپ رومانٹک موڈ میں ہیں۔ خیر تو پھر آپ دیر کیوں کریں۔ سیدھے دَرِ جاناں پر پہونچئے"

"اچھا۔ تم اپنا آدمی ساتھ کر دو۔ یہ بنڈل لے چلے"

"پھر وہی ٹیک کی ضرورت۔ گھر سے یہاں تک بنڈل لایا اور وہاں تک لے جانے کے لئے آدمی کی ضرورت ہے۔ ارے جا سیدھا دل کڑا کر کے اور دندناتا ہوا پہونچ جا وہاں"

کمار نرملا کے بنگلے پر پہونچا۔ باہر ایک موٹر کھڑی تھی۔ اسے یوں ہی سا خیال ہوا کہ موٹر پرمانک کی ہے۔ وہ بنگلے کے اندر چلا گیا۔ اس نے پورٹیکو میں قدم رکھا تو نرملا کا نوکر منگرو اس کے پاس آیا اور بولا۔

"مس بی بی سے ملنے آئے ہو۔ او تو...." اور وہ رُک گیا اور کھیسیں کاڑھ دیں۔"

"کیا ہوا؟" اور کمار نے کوٹ کے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "لو یہ تمہارا انعام" اور ایک اٹھنی اسے نکال کر دی۔

"کھوس رہو بھئیا۔ بھگوان تم کا بڑا عہدہ دیں۔ ہاں تو تم سنے کا کہی"

"کہو ہیں یا نہیں؟"

اس نے کمار کے بالکل پاس آکر بہت دھیرے سے کہا "ہیں جرور تدا۔ پرمانک بابو ہیں پاس بیٹھے"

"تم جا کر کہو کہ کمار آئے ہیں"

"بھئیا اب کا کہی۔ کا کا ہوت ہے۔ ہم ہواں جیّیا تو ڈانٹ دے ہیں۔ کہہیں بدتمیج کہیں کا۔ اور بھئیا لکار دے ہیں تو ہمرے بال بچے بھوکن مرجئی ہیں"

یہ سُن کر کمار کا پورا جسم کانپ گیا اور ماتھے پر پسینہ آگیا مگر اس نے کچھ زور کی آواز میں کہا "مگر تم ایک مرتبہ کہہ کے تو دیکھو"

"بھئیا ہمکا ڈر لاگت ہے کو تنوں اور بخت آیو تو ٹھیک ہے"

"ہمیں اسی وقت کام ہے"

"اچھا ہم ایک ترکیب کرت ہیں" اور یہ کہہ کر وہ بیسچ میں چلا گیا اور کمار برآمدے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے سُنا کہ کسی زنانی آواز نے منگرو کو نام لے کر پکارا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ گھڑیاں گن رہا تھا۔

کوئی پانچ منٹ کے بعد منگرو کھیسیں بائے ہوئے برآمدے میں واپس آیا اور کمار کی کرسی پر جھک کر بہت ہی آہستہ سے بولا "ہمری ترکیب چل گئی۔ ہم کمرے کے پاس بیر بیر گئیں تو او آپ پکار لہن"

"تو کہا گیا"

"یہی کہن کہ کہو اس بخت نہیں مل سکتے"

"تم نے ہمارا نام لیا تھا؟"

"ہم کہن کمار بابو جو آوا کرت ہیں۔ بس پرمانک بابو ان کا دکھین اور اداوی ان کا۔ پرمانک بابو بولے اس پونگے کے دماغ میں الو نے انڈے دئے ہیں اور ہمری مس بی بی کھلکھلائے کے ہنسیں اور بولیں کہدے نہیں مل سکتیں اس بخت"

کمار سناٹے میں آگیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ ایک منٹ وہ بیدم سا بیٹھا رہا پھر ایک دم سے اٹھ کر چلدیا۔

بنگلے سے باہر آیا تو پہلے وہ عارف کے گھر کی طرف چلا مگر کوئی بیس قدم جاکر واپس ہوا۔ چند قدم چل کر وہ پھر پلٹا اور بڑھتا چلا ہی گیا مگر آگے جاکر ایک سڑک پر ہولیا جو نہ عارف کے گھر کو جاتی تھی اور نہ اس کے خود کے۔ اس سڑک پر سناٹا تھا اور وہ تیزی کے ساتھ چلا جارہا تھا۔ آگے بڑھ کر ایک جگہ وہ لڑکھڑایا اور اس کا دھیان اپنے بائیں ہاتھ میں بنڈل کی طرف گیا۔ اس بنڈل کو اس نے زمین پر پٹخ دیا اور قریب سے ایک گملا اٹھا کر اس کو خوب کچلا کاغذ پھٹ گیا۔ پھولدان کچ کچ گئے اور ساری باہر نکل آئی۔ پھر اس نے ان سب چیزوں کو ٹھوکروں سے مار کر نالی میں کردیا۔

آگے بڑھ کر اس نے جیب میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ان کو بھی پھینکنے والا ہی تھا کہ پھر جیب میں واپس رکھ لیا۔ اس کی رفتار اور تیز ہوگئی اور تھوڑی دیر میں وہ ایک ٹیکسی اسٹینڈ پر پہونچ گیا۔ سب سے زیادہ خوبصورت اور نئی کار کے پاس جاکر اس نے پوچھا "کیوں یہ گاڑی کس حساب سے لے چلوگے"

"کہاں جاینے گا؟"

"یہیں شہر میں گھومیں گے۔ کئی جگہ رکیں گے"

ٹیکسی والے سے نرخ طے ہوگیا اور کمار ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی کا ڈرائیور کچھ لینے گیا

اور اتنی دیر میں کمار کو یہ احساس ہوا کہ کوئی شخص اُس کے ساتھ ہونا چاہیئے جو اسے دیکھے جائے اور اس سے کوئی سوال نہ کرے۔ فوراً اسے خیال آیا کہ جتو سے زیادہ موزوں کوئی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب ڈرائیور نے واپس آکر گاڑی اسٹارٹ کی اور پوچھا "کدھر چلوں صاحب" تو اس نے کہا۔ "اِدھر چلو۔ آگے ہم بتاتے رہیں گے"۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ نرملا کے عشاق میں جتو بھی ہیں اور جتو کی ہمراہی میں وہ اپنے تئیں ان سے زیادہ کامیاب تو ضرور محسوس کرے گا۔ اس نے کہا "ڈرائیور ذرا تیز چلو۔ جلدی کا کام ہے"۔

وہ جتو کے گھر پہونچا اور جتو اس کے ساتھ ہو لئے۔ وہ تیزی کے ساتھ گلی میں آرہا تھا اور اس سے دو قدم پیچھے جتو شیروانی کے بٹن کھلے دامن اڑتے ہوئے کٹے کنکوے کی طرح چلے آرہے تھے۔ دونوں موٹر میں آکر بیٹھے۔ جتو پوچھنے ہی والے تھے کہ "یہ موٹر" کہ کمار نے ان کے منہ کو ہاتھ سے بند کرتے ہوئے کہا "کچھ سوال نہ کرو بس دیکھے جاؤ"۔ جتو خاموش ایک پہلو میں بیٹھے رہے اور کمار دوسرے میں۔ کمار نے بازار میں پہونچ کر شاہی حلوائی کی دوکان پر موٹر رکوائی اور اُتر کر ایک بہت بڑے دونے میں متعدد قسم کی مٹھائیاں لیں اور موٹر میں آکر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور سے کہا "چلو شہر کے باہر ٹھنڈی سڑک پر۔ خوب تیز"۔

موٹر چلتی رہی اور وہ مٹھائیوں کو نہایت ندیدے پن سے بھکر بھکر کھاتا رہا اور جتو سے کہتا گیا "اما تم نہیں کھاتے"۔ جتو بھی کھاتے رہے۔ دونا ختم نہیں ہوا۔ کمار بولا "آج پیٹ بھر کے۔ جی بھر کے مٹھائی کھائی" اور موٹر کی آگے والی سیٹ کی طرف دونا بڑھاتے ہوئے بولا "لو ڈرائیور۔ تم کھاؤ۔ اپنے گھر لے جاؤ"۔ ڈرائیور نے دونا لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔

کمار بولا "اب حضرت گنج میں وہ صاحب والی بڑی کھانے پینے کی دوکان ہے نہیں وہاں لے چلو"۔

اس ریسٹوران میں پہونچ کر وہ جتو کے ساتھ دوسری منزل پر چڑھتا چلا گیا۔ وہاں ڈھنگ گرلز نہایت بناوٹی انداز میں رنگی ہوئی گڑیاں سی معلوم ہوتی ہوئی مکانیکی طریقہ پر ٹہل رہی

تھیں - وہ ایک کوپے میں جاکر بیٹھ گیا - ایک ویٹرس نے آکر پوچھا "آپ کیا لیں گے"۔

"سب میں پہلے تو آپ کو"

وہ مسکرائی - ٹیڑھی نظر بنا کر کمار کو دیکھا اور پھر آنکھیں اٹھا کر جتو کے شانے سے بالکل متوازی سر کو دیکھا - ایک قہقہہ لگایا اور کھٹ سے کمار کے پاس بیٹھ گئی اور خاص انداز میں پوچھا "تم کیا کھاؤ گے اور کیا پیو گے"۔

"جو تم کہو - اے حسن کی ملکہ"

"اچھا تو ہم آج کی بہترین چیزیں منگاتے ہیں" اور وہ اٹھ کر جانے لگی۔

"تم نہ جاؤ - پیاری" کمار نے کہا۔

اس نے کمار کو نگاہ مٹکا کر دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر اپنی دو انگلیاں رکھ کر چومتی ہوئی باہر چلی گئی -

وہ پھر آئی اور اس کے ساتھ ایک بیرا سامان لئے ہوئے آیا -

جتو یہ سب دیکھ کر نروس ہو گئے تھے - اکدم سے بولے "میں کچھ نہ کھاؤں گا"۔

"تم پینا نہ حرام ہے - مگر کھانے کی چیزوں میں کیا ہے" کمار نے کہا -

"کیا معلوم ذبح کیا ہوا گوشت ہو یا نہ ہو"

ویٹرس نے ان کی بات نہ سمجھ کر کمار کی طرف دیکھا اس نے کہا "یہ کچھ نہ کھائیں گے اور نہ پئیں گے"

"تو یہ یہاں کیا کریں گے" اور پھر اس نے کمار سے آنکھ ماری

"بھئی مجبوب تم چل کے موٹر میں بیٹھو میں ابھی آیا"۔

جتو اٹھ کر باہر آئے اور انہوں نے کوپے کی سٹکنی اندر سے بند ہوتی ہوئی سنی - وہ آکر کچھ دیر موٹر میں بیٹھے - مگر گرمی معلوم ہوئی تو باہر بازار میں ٹہلنے نکل گئے - اپنے خاص انداز میں جھومتے ہوئے کبھی اس دوکان کے اندر دیکھتے اور کبھی اُس دوکان کے اندر جھانکتے ایک سرے سے

دوسرے سرے تک گئے۔ پھر سڑک کے دوسرے طرف والی دوکانوں کو یوں ہی ملاحظہ فرماتے ہوئے واپس آرہے تھے کہ اکدم سے ایک موٹر آکر فوٹ پاتھ کے پاس رکی۔ دروازہ کھلا اور نرملا پھرتی سے نکل کر دوکان میں چلی گئی۔ ان کی نگاہوں میں ایک عجیب پر کیف بجلی کوند گئی۔ پرمانک موٹر کے دوسرے پہلو سے اتر کر فوٹ پاتھ پر آیا اور جتو کو دیکھ کر بولا "کیا حال ہے اما محبوب۔ ٹہل رہے ہو"

جتو مسکرائے اور وہ دوکان کے اندر چلا گیا۔ جتو عجیب عالم میں آگئے۔ اتنی دیر تک وہ کمار کے ساتھ اس کو عجیب حرکتیں کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے مگر انہیں سوال کرنے کی اجازت ہی نہ تھی اس لئے وہ اپنی طبیعت کو کچھ گھٹا گھٹا سا محسوس کرنے لگے تھے۔ بازار کے چکر لگانے سے کچھ فرحت محسوس ہوئی تھی اور اب نرملا کو بجلی کی طرح آنکھوں کے سامنے کوندھ کر گزرتا ہوا دیکھ کر تو انہیں یہ محسوس ہوا کہ ع

تم آئے سامنے یا سو بہاروں کی بہار آئی

چنانچہ اب ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی دوکان کے اندر چلے جائیں۔ مگر ان کا اپنے جسم پر قابو اتنا کم ہو گیا تھا جتنا کہ کمار کا بڑھا ہوا تھا۔ لہذا ان کے پیر آگے ہی نہ بڑھے، اتنی دیر میں نرملا اور پرمانک ہنستے ہوئے دوکان سے باہر ہی آگئے پرمانک نے ان کو وہیں کھڑا دیکھ کر جہاں وہ چھوڑ گیا تھا، کہا "اچھا تم ہماری موٹر بچا رہے تھے۔ تھینک یو"

اب جتو کے جسم میں اتنی سکت آگئی کہ انہوں نے بڑھ کر موٹر کا دروازہ کھولا۔ نرملا اُن کی طرف سے مُنہ پھیرے مُسکراتی ہوئی موٹر میں بیٹھ گئی۔ دوسری طرف پرمانک بھی جا کر بیٹھ گیا۔ موٹر چلا مگر انجن کی آواز سے زیادہ پرمانک اور نرملا دونوں کے ذرا زور سے ہنسنے کی آواز جتو کے کان میں آئی۔ موٹر چلی گئی۔ جتو نے اپنے دل میں کہا "کمار کے ساتھ آنے کا حاصل یہ رہا۔ بہت اچھا ہوا جو وہ مجھے لایا۔ امتحان کے بعد آج تو دیدار میسّر ہو گیا" اب وہ ٹہل نہیں سکتے تھے۔ تصورِ جاناں کئے ہوئے ٹہلنا ناممکن تھا اور ناموزوں تھا اور وہ موٹر میں

آکر بیٹھ گئے۔

موٹر کی پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھے رہے اور نرملا کو اپنے پاس اسی طرح بیٹھا تصور کرنے لگے جیسے کمار کے پاس اس وقت ویٹرس بیٹھی ہوگی۔ اس عالم تصور سے حسب معمول وہ عالم خواب میں پہونچ گئے۔

پھر انہیں جو احساس ہوا وہ یہ کہ کوئی ان کا شانہ ہلا رہا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو کمار کہہ رہا تھا "اٹھو تم ذرا ڈرائیور کے پاس بیٹھ جاؤ"

وہ گڑبڑا کر اترے تو دیکھا کہ بازار میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہ آکر ڈرائیور کے پاس بیٹھ گئے۔ پیچھے کی سیٹ پر کمار بیٹھ گیا اور اس کے پاس ویٹرس۔ موٹر چلی۔ پیچھے کی سیٹ پر اندھیارا تھا اور کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ہاں کچھ مخصوص قسم کی چھوٹی آوازیں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سنائی دیتی رہیں جن کا اندھیارے ہی میں رہنا بہتر ہے۔

موٹر صدر پہونچی۔ ویٹرس اتر کر بولی "یہ میرا کواٹر ہے۔ یہاں آؤ جب جی چاہے"

کمار نے اس کو جواب دینے کے بجائے ڈرائیور سے کہا "ڈرائیور ان صاحب کو چل کر وہیں اتار و جہاں سے لے آئے تھے"

ڈرائیور نے موٹر پھیر کر نہایت تیزی سے دوڑائی اور کچھ ہی دیر میں جتو کے گھر والی گلی پر لاکر روک دی۔

"اور آگئے" جتو نے کہا اور اگلی گلی پر وہ اترے۔ کمار پچھلی سیٹ پر بالکل ساکت پڑا تھا۔ اس کو جھنجھوڑ کر وہ بولے "ہم جاتے ہیں کمار"

اس نے چونک کر کہا "اچھا" اور کچھ رک کر بولا "ڈرائیور۔ چلو ہمارے گھر"

"آپ کے گھر"

"ہاں" اور اس نے جمائی لے کر کہا "اپنے اسٹینڈ چلو بھو بوجھ لینا ہم سے"

موٹر واپس ہوئی اور جتو گلی میں چلے گئے۔ گھر کے دروازے پر پہونچ کر۔ دستک دینے

کے لئے ہاتھ جو مارا تو دروازہ کھل گیا۔ یہ اندر داخل ہوئے تو انہیں محسوس ہوا کہ اندھیرے میں دو جسم اٹھ کر بیٹھے۔ ایک جسم سے تکو کے لہجے میں آواز آئی "اے نواب اتنی دیر کر دی۔ سب کو خفقان ہو رہا تھا۔ ببو نواب گئے اور خبر لائے کہ آپ کے ایک دوست کی برات ہے اس میں ناچ دیکھ رہے ہیں صبح کو آئیں گے۔ آپ ابھی سے آ گئے"

جتو سنتے ہوئے ڈیوڑھی میں سے گذر گئے۔ گھر کے اندر آئے۔ سب لوگ انگنائی میں اپنے اپنے پلنگوں پر سو رہے تھے۔ ان کا پلنگ سب سے الگ بچھا ہوا تھا اس پر دری بچھی ہوئی تھی اور سرہانے تکیہ لگا ہوا تھا۔ وہ آکر لیٹ رہے۔ اس وقت ان کے خیالات اور احساسات بہت الجھے ہوئے تھے اور نیند کا غلبہ تھا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں غافل سو گئے۔

صبح کو ان کے پلنگ پر دھوپ آ گئی تو وہ اپنے کمرے کے اندر تخت پر آکر لیٹ رہے کوئی گیارہ بجے کے قریب ان کے والد نے کمرے کے دروازے پر آکر کہا "بھئی۔ کب تک سوؤ گے رجسٹری کچہری چلنا ہے"۔

وہ اٹھے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہنے۔ دونوں باپ بیٹے ایک یکہ پر بیٹھ کر کچہری آئے وہاں دستاویز کی تحریر میں دیر لگی تو دونوں نے ایک پلاؤ بیچنے والے سے پلاؤ لے کر کھایا۔ چار بجے تک ان کے مکان کا رہن نامہ مکمل ہو گیا اور نواب صاحب نے نوٹ اپنی کمر سے باندھ لئے۔ کچہری کے باہر آکر جتو نے اپنے والد کو ایک یکہ میں بٹھایا اور بولے "آپ چلئے مجھے ذرا ان دوست کے یہاں جانا ہے جن کی کل برات تھی"

یکہ چلا گیا اور وہ لہراتے ہوئے عارف کے گھر پہونچے۔ عارف کے کمرے میں داخل ہو کر آرام کرسی پر بیٹھتے ہی انہوں نے پوچھا "کمار کی کوئی خبر ہے"

"کیوں؟ کوئی خاص بات؟"

جتو نے کل رات کا پورا حال بیان کیا۔

عارف ہنس ہنس کر سنتا رہا اور آخر میں بولا "تو یہ رنگ ہیں۔ وہ وظیفہ کا بچایا ہوا

روپیہ اس عیاشی میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ نرملا بھی بالائے طاق رکھ دی گئی۔ مگر یار پورے واقعہ میں سب سے زیادہ دلچسپ بات وہ ہے کہ سب میں پہلے مٹھائی کی دوکان پر گیا۔ واہ رے متھرا کے پنڈے۔ عیاشی کرنے بھی چلا تو پہلے نیت لڈوؤں پر گئی اور پھر ظاہر ہے انگریزی ادب میں ایم۔ اے۔ کر رہا ہے آ گیا انگریزی قسم کی عیاشی پر۔ مگر یار تم نے صبح ہی اسے آ کر کیوں نہ بتایا؟"

"چھٹی ہی کہاں تھی۔ بھائی آیا رجسٹری کرانے گئے تھے مکان کے رہن نامے کی۔ کچہری ہی سے آ رہا ہوں اِدھر"

"آئیں۔ تو مکان رہن کر ڈالا۔ کیوں"

"انور کی شادی کے لئے۔ آخر ایک بڑے زمیندار سے ٹکر لینا ہے"۔

"اچھا تو یہ مکان بھی گیا"

"کیوں انور کے پاس لاکھوں روپیہ ہوگا۔ وہ ادا کر دے گی"

"خوب واللہ۔ تم ہی نہیں تمہارا خاندان کا خاندان مکمل ہیرو ہے ہر ایک۔ خیر۔ اب یہ شادی ہو کے رہے گی" اور وہ خاموش ہو کر سوچتا رہا "قمر نے مجھے مجبور کر دیا۔ اف۔ وہ بھی پورا لکھنوی ہیرو نکل گیا۔ تم سب مجھے بھی ہیرو بنا ہی کے چھوڑو گے" اور پھر وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر بولا "میں ماحول سے کیسے باہر نکل سکتا ہوں۔ خیر سے

نہ قاضیم نہ مدرس نہ محتسب نہ فقیہ مرا چہ کار کہ منع اندشراب خوارہ کنم

چلو کمار کے گھر چلیں۔ آج وہ ضرور پٹ جائیگا میرے ہاتھ سے۔ شاید ہندو مسلم فساد ہو جائے"

دونوں کمار کے گھر پہونچے۔ باہر کا کمرہ کھلا تھا۔ عارف لپک کر کمرے کے اندر گیا کمار کا بڑا بھائی سوفے سے اٹھ کر آگے بڑھا اور عارف سے اس کے لپٹ گیا اور رونے لگا۔

"کیا معاملہ ہے بھیا کیا ہوا"

جتو منہ کھولے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

بھیا رو کر بولے "ماتا ابھی غفلت میں آئیں" اور پھر رونے لگے۔

عارف نے ان کو صوفے پر بٹھا کر پاس بیٹھتے ہوئے کہا "ارے ہوا کیا کچھ کہو تو۔ ماتا کو کچھ ہوا۔ کمار کہاں"

بھیا نے منہ بسور کر روتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا "کمار مر گیا۔ ابھی تو پھونک کر آ رہے ہیں"

"آئیں۔ کیسے۔ کب آئیں"

"صبح کو کمرے کے قلابے سے لٹکا ہوا ملا"

"آئیں۔ سوسائڈ کر ہی لی۔ اف۔ یہ کیوں"

"کل رات قریب ایک بجے کے یہاں آیا۔ مست لڑکھڑاتا ہوا۔ میں نے ایک جھاڑ دیا۔ کیا معلوم تھا یہ ہوگا۔ ہائے۔ چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔ رات میں کوئی چار بجے ہوں گے کہ اوپر میز گرنے کی آواز آئی۔ ماتا چونک کر بولیں "یہ کیا گرا"۔ میں بھی کچھ کچھ جاگ رہا تھا میں نے کہا "کوئی بلی ولی ہوگی۔ ہلکی میز ہے گر گئی۔ دن چڑھ آیا۔ وہ اوپر سے نہ اترا۔ میں نے جا کے دیکھا بیچ کے قلابے سے لٹک رہا تھا"

"آئیں۔ ہائے۔ یہ کیا۔ کیسے"

"معلوم ہوتا ہے کہ ریشمی مفلر کا پھندا گلے میں کس کے ڈالا۔ دھوتی کو قلابے میں ڈالا۔ پھر میز پر کھڑے ہو کر مفلر کو دھوتی سے کس کر باندھ دیا اور پھر پاؤں سے میز دھکیل دی۔ اسی کی آواز آئی تھی"

"تو یوں مر گیا۔ مجھے آپ نے خبر نہ کرائی صبح ہی!"

"تمہارے یہاں چپراسی کو بھیجا۔ وہ نیا آدمی ہے۔ تمہارے آدمی نے کہا باہر گئے ہیں"

"مگر اس گدھے نے میرے آدمی سے یہ واقعہ کیوں نہ کہہ دیا۔ میں واپسی پر فوراً یہاں آتا۔ اسے دیکھ لیتا آخری دفعہ" اور وہ رونے لگا۔ کچھ دیر کے بعد آنسو پونچھ کر وہ بولا "اور ماتا کا کیا حال ہے"

"وہ پاگل ہوگئیں۔ ڈاکٹر دوا دے گیا ہے تو غافل پڑی ہیں۔ اف۔ اس نے ایسا دھوکا دیا۔ وہ ہم سب سے ہونہار ہوتا"

"مگر بھیا یہ سب ہوا کیسے۔ میری عقل گم ہے"

جگنو بولے "میں نے......"

مگر عارف نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم رہنے دو۔ تم کیا جانو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ شروع کیسے ہوا۔ اس پورے قصہ کا وسط اور خاتمہ سامنے ہے مگر شروع کہاں ہے۔ میرے پاس سے جب وہ گیا تو ٹھیک تھا۔ کوئی چھ بجے ہوں گے اور جگنو تمہارے گھر سات کے قریب پہونچا۔ اس قریب ایک گھنٹہ میں کیا ہوا کہ وہ اس طرح بدل گیا کہ اپنے تئیں تباہ کرنے لگا"

"اب چھوڑو میاں یہ باتیں۔ وہ گیا اپنی جان سے" بھیا نے کہا

کمرے میں تینوں آدمی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کچھ باتیں بھی ہوتی رہیں۔

عارف کی نظر ایک کونے میں ایک چھوٹی سی میز پر پڑی جس پر ایک تصویر کا فریم رکھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر وہ فریم اٹھا لیا اور بولا "آئیں یہ تصویر آپ فریم سے نکال رہے تھے بھیا"

ہاں میں نے نکالی تھی اور اس پر اوپر بڑھو وہ شعر لکھ دیا ہے

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"

"اچھا۔ ابھی تو فریم لگایا نہیں ہے۔ میں بھی نیچے یہ شعر لکھے دیتا ہوں

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

عارف اور جگنو کافی دیر اور وہاں بیٹھے رہے۔

جب دونوں کمہار کے گھر والی پتلی سڑک پر جا رہے تھے تو جگنو نے پوچھا "نرملا کو بھی خبر ہوئی؟"

"ارے۔ یہ تو سب سے خاص بات ہے۔ واہ۔ ع ہم تو قائل ہیں تمنا تری دانائی کے۔ پورے ہیرو ہو تم۔ ہیرو وہی جو موقع سے پورا فائدہ اٹھائے۔ یہ موقع ہے۔ بڑی اچھی تقریب ہے، بہر ملاقات۔ اور اب شیر افگن تو مارا گیا بالکل رستہ بھی صاف ہے۔ اب تمہارے سوا نور جہاں کی بغل میں کس کے لئے جگہ ہے۔ اور شیر افگن کو تو جہانگیر نے مروا دیا تھا اس لئے نور جہاں نے نخرے کئے اور مدت چاہی۔ یہاں تمہاری نور جہاں نے تو سمجھو کہ اپنے ہاتھ سے شیر افگن کو مار ڈالا اور بس اب تم اس کے گھر کی طرف ع ہلالِ عید باوجِ فلک ہویدا شد پڑھتے ہوئے جاؤ اور وہ ضرور جواب میں دوسرا مصرع پڑھیگی اور تم اس کا منہ چوم لینا"

جتو کچھ نہ بولے۔ عارف کی موٹر گھر میں داخل ہوئی تو بلا کا نوکر پاس آکر بولا "ہم انتجار کرت رہن۔ بڑے صاحب کہن ٹھیرو آتے ہوگے۔ جائے او نا ہیں پئیں" اور اس نے عارف کو ایک خط دیتے ہوئے کہا "مس بی بی۔ یو پرچہ دہن ہیں اور بلائن ہیں فوراً"

عارف خط لیکر لان پر آیا۔ ڈک کرسیوں پر وہ اور جتو بیٹھ گئے۔ اس نے خط کھولا۔ اس میں انگریزی کے چند جملے لکھے ہوئے تھے "تم نے کمار کے بابت سنا ہوگا۔ پرمانک کو اسکی نعش رستہ میں ملی تھی۔ اس نے خودکشی کی ہے۔ تمہیں وجہ معلوم ہوگی۔ مجھے آکر سب معاملہ بتا جاؤ"

عارف نے خط کو زمین پر پھینک دیا۔ جتو نے جھک کر اٹھا لیا۔ عارف نے نوکر سے کہا "کہدینا ہمیں کچھ نہیں معلوم اور ہم نہ آئیں گے تمہارے یہاں"

نوکر جانے لگا تو اس نے پکارا "منگرو۔ منگرو۔ ایک بات بتاؤ۔"

وہ منہ کھولے کھڑا ہو گیا

"کل اتنے وقت کمار بابو تمہارے یہاں گئے تھے۔ تم تھے"

"ہاں صاحب۔ آئے رہن۔ کچھ ہاتھ ماں بنڈل ایسا لئے رہیں"

"تو پھر کیا ہوا ہمیں بتاؤ"

باہر برآمدے ماں بیٹھے مس بی بی کے پاس پرمانک بابو رہین۔ ہم مس بی بی سے توں

جائیگے کہاں تو مس بی بی کہن کہ کہدو نہیں مل سکتے۔ ہم کا کبھی کمار بابو کا چہرہ ایسا ہوگوا جیسے مردے کا اور کانپت باہر چلے گئے"

"جتو" عارف نے کہا "یہ ہے شروع اس قصّہ کا۔ اب سب حال کھل گیا۔ سمجھے جتو کی گردن تیس درجہ کے زاویہ پر حد درجہ مستعدی کے ساتھ جھی ہوئی تھی اور وہ بولے "تو رشک نے اسے پاگل کردیا"

عارف نے اُن کے ہاتھ سے نرملا کا خط لیا اور اس کے پیچھے لکھا ؎

وہ آئے ہیں پشیماں نعش پر اب　　　　تجھے اسے زندگی پاؤں کہاں سے

اور منگرو کو خط دیتے ہوئے کہا "لو جواب اسی پر لکھدیا ہے۔ اور کہنا مجھے بہت صدمہ ہے میں آنہیں سکتا"

عارف کرسی پر سے اٹھ کر لان پر چہل قدمی کرتا رہا اور جتو کرسی پر بیٹھے ہوئے گھگھو کی طرح اس کے چہرہ کو اس کی متوازن چال کو اور اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتے رہے۔ کافی دیر تک عارف یوں ہی ٹہلتا رہا۔ پھر وہ جتو کے پاس آیا اور بولا "ایک عورت نے کوئی بھی ہو کمار کو مار ڈالا اور ایک عورت تم کو مار دے گی"

جتو نے اپنی دونوں آنکھوں کا فوکس ملانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"سمجھے" اس نے آگے کہا "اسی لئے عورت بنائی گئی ہے کہ مرد کو پیدا بھی کرے اور مار بھی ڈالے"

اس وقت گھر سے ایک موٹر بنگلے میں داخل ہوئی۔ جتو چونک کر اکدم سے کھڑے ہوگئے عارف نے موٹر کی طرف نگاہ اٹھائی ہی تھی کہ نرملا اس میں سے کود کر اس کی طرف لپکی۔ وہ غصّہ میں بھری ہوئی تھی اور چند قدم عارف سے دور رک کر بولی "عارف۔ آخر یہ تمہارا مطلب کیا ہے"

"میں بھی تم سے یہی سوال پوچھنے والا تھا"

"میں نے کیا کیا"

"تم نے اس غریب کی کھیل ہی کھیل میں جان لے لی"

"میں نے۔ میں نے۔ یا تم نے۔ تم نے ہی اس کو مجھ سے ملایا"

"اچھا۔ تو اب۔ اس پیترے سے آ رہی ہو"

"پیترا؟ تم کو کیا ہو گیا۔ تم مجھ کو کیا سمجھ رہے ہو"

"وہی جو تم ہو"

"دیکھو تم بہت بڑھتے جا رہے ہو" اس نے بہت زور کی آواز میں کہا۔

"اور تم کم ہوتی جا رہی ہو" عارف نے اور بھی زیادہ زور سے کہا۔

عارف کے بھائی اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ گئے۔ نرملا نے ان کو دیکھ کر کہا

"آداب۔ بھائی جان"

"جیتی رہو" آصف میاں نے اس کو جواب دیا اور اپنے بھائی کی طرف رُخ کر کے بولے "عارف یہ تو تو میں میں کیا لگائی ہے۔ اور یہ لان پر تاکہ باہر آواز جائے"

"دیکھئے بھائی جان یہ عارف کی دھاندلی بازی"

"بس" عارف نے کہا۔

بھائی جان بولے "آ نیرا تو چل گھر میں۔ چھوڑ اس احمق کو۔ یہ پڑھتا بہت ہے تو بالکل بوکیش ہو گیا ہے۔ چاہتا ہے کہ سب دنیا بالکل کتابوں کے موافق ہو جائے۔

آصف صاحب نرملا کو اپنے ساتھ لئے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئے تو عارف سے بولے "عارف اندر جاؤ۔ تمہاری بھابی بلا رہی ہیں" "ارے بھئی محبوب تم ہمارے پاس آؤ۔ یہ سب کیا جھگڑا ہے ہمیں بتاؤ"

جو آصف کے ساتھ اُن کے کمرے میں چلے گئے اور عارف گھر کے اندر گیا۔ اندر پہونچ کر دیکھا کہ نرملا بھابی کے گلے سے لگی ہوئی رو رہی ہے۔ بھابی عارف کو دیکھتے ہی بولیں "واہ یہ اچھا پاگل پن ہے تمہارا۔ آئے کہیں سے۔ لڑکی کو پریشان کر دیا۔ اس سے کیا

مطلب۔ تمہارے کالج کے لڑکے روز اپنے تئیں مارتے رہتے ہیں۔ کوئی کنوئیں میں کود گیا۔ کوئی ندی میں ڈوب گیا۔ کسی نے زہر کھالیا کسی نے گولی مارلی۔ تو کیا سب کی ذمہ دار لڑکیاں ہیں؟"

"بالکل۔ اور نہیں تو کیا لڑکے ہیں"

نرملا بھابی سے ہٹ کر بیٹھ گئی اور بھابی کہے گئیں "خوب۔ تمہارے ہتھکنڈے اب حد سے بڑھتے جاتے ہیں۔ ٹھیر دمیں ٹھیک کردوں گی تم کو۔"

عارف نے اب کوئی جواب نہ دیا۔

"جاؤ تم باہر۔ اب میں ایسی باتیں نہ سنوں کبھی" اور نرملا سے بولیں "چل بیٹی۔ منہ دھو ڈال اور عابدہ کے ساتھ کچھ ناشتہ کرلے۔"

عارف باہر آیا اور کرسی پر لیٹ گیا۔ ہزاروں طرح کے خیالات اس کے دماغ میں آتے رہے کافی دیر کے بعد جتو آصف صاحب کے کمرے سے باہر آئے اور عارف کے پاس بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد آصف صاحب ٹہلنے کے لئے چلے گئے۔

جتو بولے "گھر پہونچتے پہونچتے رات ہوجائیگی"

"مگر تم ابھی جاؤ نہ۔ وہ آتی ہوگی باہر۔ تم کو اپنے پاس بٹھاکے لے جائے گی"

جتو کھل گئے اور بیٹھے رہے یہاں تک کہ نرملا باہر آہی گئی۔ اب وہ ہشاش بشاش تھی اور عارف کو دیکھکر جیت کی ہنسی ہنستی ہوئی اپنے موٹر میں جا بیٹھی۔ عارف اس کے پاس آیا اور بولا "خیر۔ تم جیتیں، میں ہارا۔ مگر میں نے ایک سبق سیکھا۔"

"دکیا"

"عورت کی یہ فطرت ہے ع۔ اسی کو تم مٹاتی ہو جو تم سے دل سے ملتا ہے"

نرملا نے موٹر اسٹارٹ کی اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

عارف پلٹا تو جتو ہمہ تن چشم بنے ہوئے کھڑے تھے بولے "اب ہم چلیں گے"

اچھا۔ جاؤ۔ وہ بے وفا نکل گئی۔ تم یہ فلسفہ یاد کرتے چلے جاؤ عورت ہی جلاتی ہے وہ

عورت جو تم کو سب سے زیادہ چاہتی ہے یعنی ماں اور وہ عورت ہی مارتی ہے، وہ عورت جس کو تم سب سے زیادہ چاہو یعنی معشوق۔ مگر یہ اصول عام آدمیوں کے لئے ہے۔ تم اس سے بالاتر ہو۔ تم ہیرو ہو۔ لافانی ہو۔ تمہارے لئے یہ سوال ہی نہیں اٹھتا"

(۵)

ایک صبح کو عارف کی آنکھ کھلی تو دھند لکا چھایا ہوا تھا۔ اس کی مسہری سامنے والے لان پر بچھی ہوئی تھی اور اس نے آنکھ کھولی تو داہنے طرف گرجا گھر کو دیکھا۔ اس نے کروٹ لی تو بائیں طرف کی چار دیواری کے پاس کی طرف روش سیاہ موٹی لکیر کی طرح دکھائی دی۔ اس کا اٹھنے کو جی نہ چاہا اور ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ عابدہ کا امتحان ختم ہو چکا تھا اور پھر اتوار کا دن بھی تھا۔

وہ بائیں کروٹ گڑمڑی مار کے لیٹا۔ اس خواب پر غور کرنے لگا جو اس نے ابھی دیکھا تھا۔ عجیب خواب تھا بڑا ابے تکا بڑا ہی گڑبڑ سڑبڑ۔ کمار کو دیکھا تھا نہایت عمدہ کپڑے پہنے ایک حوالات میں بند سلاخوں سے لگا کھڑا ہوا منہ پر ہوائیاں اڑتی اور جسم کانپتا ہوا پھر دیکھا کہ قمر سر پیٹتا خاک اڑاتا ہوا آرہا ہے اور چیخ رہا ہے کہ انور کی شادی ہو گئی ہائے مگر خواب کا سب سے خاص ٹکڑہ جس پر بار بار اس کا دھیان جا رہا تھا وہ سب سے زیادہ عجیب تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ کالج کے برآمدے میں کتب خانہ کے پاس زمین پر ستون سے لگا ہوا بیٹھا تھا کہ اس نے شکن کو ایک نہایت نورانی چادر میں لپٹا ہوا چھت سے زمین پر اترتے دیکھا اور وہ محویت سے تکنے لگا۔ ایک لمحہ کے بعد اس کے بائیں شانے پر ایک ہاتھ پڑا اور اس نے رُخ پھیر کر دیکھا کہ انور کا چہرہ محض چہرہ ہی نہایت شوخی سے مسکراتا ہوا زمین سے کوئی چار فٹ کی بلندی پر معلق ہے۔ اس چہرے کے نیچے عابدہ چہرے پر نقاب ڈالے اپنے مست جوانی والے انداز میں دوڑتی ہوئی آئی اور معاً ایسا معلوم ہوا کہ اس کی نقاب

ہٹ کر انور کا چہرہ اس کے جسم پر فٹ ہو گیا۔ وہ اس کرشمہ کو تعجب سے دیکھ ہی رہا تھا کہ شگن آ کر عابدہ سے چمٹ گئی اور غائب ہو گئی اب اس کے سامنے ایک مجسمہ تھا جس کا چہرہ انور کا تھا اور جسم عابدہ کا اور جس کے چاروں طرف شگن کا نور تھا۔ وہ بیتاب ہو کر اس مجسمے سے چمٹ گیا۔۔۔۔۔اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ اپنے خوابوں کو نفسیاتی رو سے تعبیر کرنے کا عادی تھا۔ یہ خواب اس کے لئے نہایت درجے معنی خیز تھا کیونکہ یہ اس کے عشق کے سلسلہ میں تمام تجربہ کا یا یوں کہئے کہ اس کے جنسیاتی محرک کے تمام عمل کا لب لباب تھا۔ اس تمام تجربہ یا تمام عمل میں جو بات اسے سب سے خاص معلوم ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ اس کا لاشعور عشق حقیقی سے عشق مجازی کی طرف گریز کرتا آیا تھا۔ اس کا عشق فارسی شاعری کے روائتی عشق کے بالکل متضاد تھا۔ یہاں مجازی سے حقیقی نہیں بلکہ حقیقی سے مجازی پر پہونچنے کا قصہ تھا۔ اور اس کا خواب میں مجسمہ سے لپٹ جانا وغیرہ یہاں تک کہ آنکھ کھل جانا تو نواب مرزا بہادر کے نظریۂ عشق کے بالکل موافق تھا۔

وہ دل ہی دل میں کہنے لگا "آئیں میری نظرت کدھر جا رہی ہے۔ مجھے اس پر بالکل قابو نہیں۔ مجھے کسی چیز پر قابو نہیں۔ تمہارے لئے میں کیا سوچتا تھا اور کیا ہوا اف۔ قمر کے لئے میں کیا کوشش کرنے والا تھا مگر کچھ نہ کر سکا۔ زندگی عجیب شے ہے اس پر قابو کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی دریا کے بہاؤ کو روکنے کی کوشش کرے۔ زندگی تو بہت بڑی چیز ہے میری اپنی طبیعت اپنی فطرت تو اس زندگی کا ایک بہت ہی حد سے زیادہ خفیف ذرہ ہے اور مجھے اس پر کوئی قابو نہیں۔ اس وقت تو میں بالکل بے بس ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا جو نصب العین بنایا تھا وہ اس وقت محض ایک پھیلتے ہوئے دھوئیں کی لکیر سے سامنے ہے۔ یہ صبح کی ٹھنڈی ہوا۔ اس میں اب بالکل روحانیت رہ ہی نہیں گئی ہے۔ یہ کس شدت سے مجھے اپنے جسم کا احساس دلا رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔"

اسی طرح وہ آنکھیں بند کئے دل سے باتیں کرتا رہا۔ پو پھٹی اور روشنی پھیلنے لگی۔ اس کا

جسم بالکل بے جان سا ہو گیا تھا اور اس کے لئے اٹھنا اور پھر نہانا اور پھر کپڑے بدلنا بڑا ہی جانکاہ عمل معلوم ہو رہا تھا۔

اتنے میں اس کے کان میں آواز آئی "عارف سو رہے ہو۔ بڑی دیر میں اٹھتے ہو"

اور وہ گڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بولا "آیئے ماسٹر صاحب آیئے۔ اتنے سویرے!"

"ہاں نماز کے بعد میں میل دو میل ٹہلتا ضرور ہوں۔ آج ادھر نکل آیا" اور وہ عارف کی مسہری پر بیٹھ گئے اور بولے "تم اس دن جو پرچہ دے آئے تھے وہ میں نے عابد کو دیدیا تھا کل تک تم لوگوں کی سب کاپیاں واپس ہوئیں تو دیکھو" اور انہوں نے جیب سے نکال کر عارف کو پرچہ دیا اور بولے "یہ حرامزدگی کی گئی ہے تمہارے ساتھ"

عارف پرچہ کو غور سے دیکھ رہا تھا راغب صاحب آگے گئے "دیکھا تم نے۔ اس کافر کے بچے رہا کی بے ایمانی اب تم پر روشن ہوئی۔ تعریف کیا کرتے تھے اس کے پڑھانے کی"

"جی ہاں باہر والے پرچوں میں سے ایک میں تو میرے چار زیادہ ہیں ان دونوں سے خیر اس میں میں ایک سوال چھوڑ آیا تھا اور دوسرے میں سترہ نمبر زیادہ ہیں"

"ان لوگوں کو تو معلوم نہ تھا کہ کون کون ہے۔ انہوں نے ٹھیک دئے نمبر۔ اور حسن نے بھی انصاف کیا ہے تم کو دس دئے ہیں زیادہ"

"اس نے بہت زیادہ دے دئے۔ اس کا پرچہ تو شاید میں نے سب پرچوں میں خراب کیا تھا"

"ہاں دیکھا تم نے اس حرامی نے کیا کیا۔ کل دفتر میں پہونچ کر سب نمبر دیکھے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد جا کر اس نے تم کو نمبر دئے ہیں۔ تم ان دونوں سے اکتیس ۳۱ نمبر آگے تھے۔ اس نے تمہارے تینتیس ۳۳ رکھے اور ان دونوں میں ایک کو سٹر سٹھ اور دوسری کو ستر دیدئے"

"مگر نرملا کے کمار سے تین نمبر کم ہی رہے۔ اس نے اس کو فرسٹ نہیں کیا"

"وہ یوں نہیں چاہتا تھا۔ خود بھی تو بنگالی برہمن بنتا ہے۔ بھلا نرملا کھتری کو کیوں

بڑھاتا حالانکہ وہ لڑکی ہے۔ اپنے پرچہ میں زیادہ نمبر دئے مگر دوسرے پرچوں کا اس بیچارے کو کیا حال معلوم" اور راغب صاحب کھل کھلا کر ہنسے۔

"خیر" عارف نے کہا" مجھے اپنے فرسٹ آنے کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ان کی حرکتوں کا حال معلوم ہوا"

"اور دیکھو یہ امتحان کے تمام معاملات راز میں جو رکھے جاتے ہیں ان سے یہ کتنا فائدہ اٹھا رہے ہیں منتظمین لوگ۔ اگر تم نمبر معلوم کرنے کے لئے عرضی دو گے تو تم کو گرانڈ ٹوٹل بتایا جائے گا الگ الگ پرچوں کے نمبر کسی طرح معلوم ہی نہیں ہو سکتے جو تم اس کے خلاف کسی سے کچھ کہو اور تم سے جب ملے گا تو یہی کہے گا کہ خوب نمبر دئے تم کو"

"اس زبردستی اور بے انصافی سے بچنے کا کوئی طریقہ نہیں"

"کیسے ممکن۔ جو ممتحن نے نمبر دے دئے اس پر کوئی حرف نہیں لا سکتا"

"جانے دیجئے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی ماسٹر صاحب۔ بہت شکریہ آپ کا"

"تم بھی تکلف برتتے ہو مجھ سے۔ میں تمہارے بھائی کا ساتھی ہوں...... آصف تو ابھی سو رہے ہوں گے اور آج اتوار ہے اور بھی دیر میں باہر آئیں گے"

"جی ہاں"

"ان سے میں کبھی اور آکر ملوں گا"

اور راغب صاحب چلے گئے۔ عارف نے ان کو پھاٹک کے باہر تک پہونچایا اور واپس ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

عارف نہا دھو کر اپنی مسہری پر لیٹا اور اسٹیونس کے مضامین پڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس کا دھیان کتاب سے اچٹ کر اسی خواب کی طرف گیا جو اس نے رات میں دیکھا تھا

"یہ خواب" اس نے سوچا "میری زندگی میں عجیب چیز ہے......"

مگر اس کے خیالات کچھ آگے نہ بڑھے تھے کہ نواب مرزا بہادر رپ رپ کرتے آتے۔

دکھائی دے۔" اُس نے کہا "تواب میں نے تو سوچا تھا کہ آج آپ شاید نہ آسکیں گے"

"کیوں۔ کیوں"

"شادی میں مصروف رہے۔ تھکے ماندے ہوں گے"

"شاڈی واللہ۔ ارے میاں۔ کیا شاڈی۔ اونہہ۔ لاحول ولا قوۃ۔ شب حماقٹ اش

شثرے کی ہمارے"

"یہ کیسے؟"

"دولہا آیا۔ واہ۔ واہ۔ کیا دولہا۔ معلوم ہوتا ہے کوئی جاٹ واٹ ہے اور وہی موٹر

آپ کو یاد ہوگا منیر میاں کے بیاہ میں دیکھی تھی۔ ٹی ماڈل فوٹ۔ واللہ۔ جب دولہن کو بٹھا کے

چلے تو اب موٹر اشاٹ ہی نہیں ہوتی۔" انہوں نے اپنے داہنے ہاتھ کو ایسے گھمایا جیسے کہ موٹر

کا ہینڈل گھمایا جاتا ہے اور بولے "اب رکھ رکھ کے ہینڈل لگایا جا رہا ہے اور انجن ٹس سے

مش نہیں ہوتا۔ اور شنئے۔ جٹو شالے کو ایشا اتو کا پٹھا ہے شالا۔ اشے آپ کالج سے نکلوا دیجئے

ایشے شالوں کے پڑھنے سے بدنامی ہے"

"خیر یہ بعد میں دیکھا جائیگا۔ جٹو نے کہا کیا۔ بتایئے"

"وہ شالا بولا مجھ سے "آپ دیکھ لیجئے موٹر کو۔ بھلا دیکھئے۔ کوئی بات بھی۔ کوئی آپ

کی موٹر تھی یا منیر میاں کی۔ میں جھاپڑ مار دیتا۔ اشے ان کا ڈریور نہیں تھا جو میں دیکھتا"

"خیر سب خوش تو ہیں شادی سے؟"

"شب خرافاٹے بھول گئیں وہ ہماری شاش وہ شو نے کا شہرا باندھ کے اور ہاتھی جھومتا

ہوا شب رہ گیا۔ دولہا چلے آرہے ہیں بھٹ پھٹیا موٹر پر اور اش پر طرہ یہ کہ کوئی رشم نہیں ہوگی

شب شرعی طریقے واللہ بش نور میاں کے کہیاں سے کوئی دش بجے رات کو آئے اور کوئی گھنٹہ

بھر میں نکاح ہو کر رخصت"

"یہ تو اچھا ہوا۔ یہی ہونا چاہیئے"

"واہ آپ کیا سمجھیں - یہ کوئی شادی میں شادی ہوئی - نہ باجے نہ طائفے نہ کچھ نہ کچھ ایک ہماری شادی ہوئی تھی ہمارے ابا جان مرحوم کا حکم تھا کہ باجے ایک گھڑی کے لئے نہ رکیں۔ نکاح کے وقت مولانا لوگ آئے تو انہوں نے کہا باجہ بند کرو مگر ہمارے ابا جان بولے ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ ہوا - اور صاحب پانچ زنانے طائفے اور دو مردانے طائفے......"

"اچھا قمر بھی شریک تھا"

"اس کی نہ پوچھئے - وہ بھوڑے کا کھانا پکوا رہا تھا - ہماری شاش بولیں تم دیکھتے رہنا جلا ہوا ہے کہیں کھانے میں کچھ ملا نہ دے جو دولہا دولہن دونوں کا شب کا عجب حال ہو جائے"

"تو آپ کی ساس ایسے شبہے کرتی ہیں اس بیچارے کی طرف سے یہی چاہتی ہیں اس کو"

"چاہتی آپ بھی واللہ چالڈ پنے کی باتیں کرتے ہیں - عورت کہیں چاہ سکتی ہے بھلا"

"عورت نہیں چاہ سکتی ؟ آپ جس سے عشق کرتے ہیں وہ بھی نہیں"

"اے میاں وہ تو رنڈی ہے اور رنڈی کسی کی ہوئی ہے - اور میں نے تو اس کو گگ کر دیا بالکل ختم عشق ہو چکا"

"اچھا قمر کا حال بتائیے"

"تو میں جو گیا جہاں کھانا پک رہا تھا تو دیکھا ایک طرف مونڈھے پر بیٹھا رو رہا تھا - میں ہنسی کے مارے لوٹ گیا - بھلا کوئی تک ہے رو رہے ہیں - ہونھ، ہونھ، ہونھ - رومال سے یوں آنسو پونچھ رہے ہیں" اور انہوں نے رونے کی نقل کی -

"تو آپ نے کچھ کہا نہیں"

"میں کیا کہتا ایسے گدھوں سے بات نہ کرنا چاہئے"

"اس نے دوکان نئی کھولی ہے اس کے گھر جانے کا ارادہ کر رہا ہوں - ہے کیسا ؟"

"کھولے دکان نہیں تو کمائے گا کیا - آپ نہ جائیے اس کے گھر ٹھیک ہو جائے گا آپ سے آپ - وہ بالکل عورتوں کی طرح ہے - بالکل"

"اچھا انور، تو واپس آئی ہوگی سسرال سے۔ وہ تو خوش معلوم ہوتی ہے"

"اس کا تو بُرا حال ہے۔ اور سُنئیے یہ موٹا بھیم شیم مرد اور وہ ابھی بچہ ڈاکٹرنی نے بھی کہا کہ بس اب کیا بتاؤں"

"وہ تو بڑی بھولی بھالی لڑکی ہے"

"بھولی بھالی ؟ آپ کیا جانیں بڑی تیز زبان دماغ۔ مگر اب سب شوخی غائب ہو گئی۔ منہ پھول کے کپّا ہو گیا۔ سب عورتوں کا یہی حال ہوتا ہے"

"تو اُسے کوئی صدمہ پہونچا"

"صدمہ ودمہ کیسا۔ بس ٹھیک ہے۔ یہی ہوتا ہے۔ آپ بھی دیکھیں گے جب شادی ہوگی آپ کی۔ اور وہ ان کے دولہا جو ہیں وہ آئے ہی نہیں اور نہ آئیں گے کبھی سُسرال کی طرف اور انور کو بھی دوسرے ہی دن بلوا لیا۔ اب کبھی کدھار یہاں آجائے تو آجائے"

"اس کو روپیہ پیسا تو دیا ہوگا اس کے دولہا نے"

"ٹھینگا دیا ٹھینگا جما دیا۔ ڈاکٹرنی کی فیس تو شاش نے دی"

"تو اس کی زندگی خراب ہو گئی بیچاری کی"

"جی ہاں۔ مگر زندگی کیوں خراب ہوگی۔ وہ اپنے دیہات میں رہے گی۔ مزے میں دودھ، دہی، گھی کھائے گی۔ موٹی ہو جائے گی"

"اچھا تو چلئے موٹر دُھل جائے مجھے آج جانا ہے بھابی کو لے کر ان کے میکے" اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"گاؤں پر۔ لانگ رن" کہتے ہوئے دولہا بھائی کمرے سے باہر آئے۔

"لانگ کیوں۔ آٹھ ہی میل تو ہے" کہکر وہ گھر میں گیا۔

موٹر دھونے کے بعد دولہا بھائی نے لاکر پورٹیکو میں لگا دی اور چلے گئے۔

کھانے کے بعد عارف اس کے بھائی اس کی بھابی اور اس کی بھابی کی بہن چاروں

موٹر میں بیٹھ کر گاؤں چلے - موٹر شہر سے باہر نکل کر تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی -

"عارف" آصف صاحب نے کہا "سنا تم نے اپنی بھابی سے کہا کہ میری شادی کر دو"

"بھابھی سے تو میں نہ معلوم کیا کیا کہا کرتا ہوں بھائی جان"

"تو تم سیریس نہیں تھے - ہاں - تم تو ایم - اے کے بعد ولایت جانے کا ارادہ رکھتے ہو - مگر....." اور وہ چپ ہو گئے -

"مگر کیا بھائی جان"

"میری رائے میں تو ولایت جانا کوئی فائدہ تو رکھتا نہیں - جو لوگ بارسٹری کر کے آئے ہیں وہ کسی طرح مجھ سے زیادہ تو کماتے نہیں میں دیکھتا ہوں"

"کمانے کا سوال نہیں ہے بھائی جان - یہ اپنے اطمینان قلب کا سوال ہے"

"ہونہہ" بھابی نے پیچھے کی سیٹ پر سے کہا "اطمینان کیسا - کوئی میم ویم سے اطمینان مل جائے گا"

"خیر مجھے پہلے ایم، اے - تو کر ہی لینا ہے - پھر دیکھا جائے گا"

"ہماری شادی جب ہوئی تو تم بی، اے میں تھے کیوں" بھابی نے اپنے میاں سے کہا -

"اگر والد مرحوم اور والدہ مرحومہ زندہ ہوتیں تو ان کی بھی ہو چکی ہوتی"

"تو میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ وہ نہیں ہیں" اور وہ ہنسا -

"مگر میں کہتی ہوں کہ شادی سے اور پڑھنے سے کیا مطلب ہے" کچھ دیر کے بعد بھابی نے کہا -

"اچھا بھابی تو کل آپ خالہ کے یہاں چلئے اور ان سے کہئے کہ منیر کی سالی کے ساتھ میری شادی طے کرا دیں" اور وہ ہنسا -

"وہاں کیوں - کیا دنیا میں لڑکیاں نہیں ہیں" بھابی نے کہا -

"کہاں ہیں لڑکیاں ہمیں تو کہیں بھی نہیں دکھائی دیتیں"

"کیوں اس دن تم کیا کہہ رہے تھے"

"اس کا تو آپ نے ٹکا سا جواب دے دیا قصّہ ختم ہو گیا۔ وہ بات بالکل ختم ہوئی اس کا کیا ذکر"

آصف صاحب نے پیچھے مڑ کر اپنی بیوی کو دیکھا اور ہنسے۔ سب خاموش رہے۔ عارف کے ذہن میں اس وقت دو باتیں صاف ہو گئی تھیں ایک یہ کہ آصف صاحب اس کے ولایت جانے سے خلاف تھے اور دوسری یہ کہ بھابی اپنی بہن سے اس کی شادی جلد سے جلد کر دینا چاہتی تھیں، اسے عابدہ کی طرف رجوع ضرور ہو گیا تھا مگر وہ اپنے زندگی کے خواب کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے موٹر اور تیز کر دی اور کوئی بیس منٹ میں اس گاؤں میں پہنچ گیا جو اس کی بھابی کا میکا تھا اور جو شاید اس کی سسرال ہونے والا تھا۔

موٹر سے اتر کر بھائی جان بھابی اور بھابی کی بہن گھر کے اندر چلے گئے عارف کو بھابی کے چھوٹے بھائی نے لا کر ایک بڑے کشادہ اور اونچی محرابوں والے برآمدے میں بٹھایا۔ یہاں وہ ڈک چیئر پر بیٹھا اسٹیونسن کا ناولیٹ "ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ" پڑھتا رہا۔ اسکی بھابی کے بھائی نے پان سگریٹ وغیرہ کے لئے پوچھا اور اس نے تکلف کیا۔ وہ صاحب اس کو متوجہ کرنا چاہتے تھے مگر اس کی توجہ ان کی طرف نہ گئی۔

سہ پہر کے وقت اس کو ناشتہ چائے وغیرہ دی گئی اور اس کے بعد وہ مکان سے نکل کھلی فضا میں آیا۔ اس کے سامنے لہلہاتے ہوئے کھیت تھے جگہ بہ جگہ پیڑوں کے جھنڈ دکھائی دیتے تھے اور افق پر درختوں کی قطار دائرہ بنائے ہوئے تھی۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں، دور کے درخت بالکل سنہرے معلوم ہو رہے تھے اور قریب والوں کی ہریالی میں عجیب چمک نظر آ رہی تھی۔ کھیتوں پر کہیں سایہ تھا اور کہیں نور۔ پوری فضا میں عجیب طرح پر زندہ دھڑکتی سانس لیتی ہوئی روشنی نظر آ رہی تھی۔ عارف نے جب سے دور ڈسوڑتھ کی

شاعری کا مطالعہ کیا۔ تب سے اسے ہر درخت پر ایک عجیب روحانی نور چھایا ہوا نظر آیا کرتا تھا مگر اس وقت اس روحانی نور کا حسین وجود اسے ایک عجیب محویت کے عالم میں لے گیا تھا اور اس کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ورڈسورتھ کے الفاظ میں "اس کا جسم سو گیا تھا اور وہ ایک روح مجسم بن گیا تھا" وہ کافی دیر تک اس عالم میں محو کھڑا رہا۔

اس عالم سے اسے زبردستی الگ کر لیا گیا تھا اور وہ موٹر دوڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا اس کے بھائی اس کے پاس بیٹھے تھے اور بھابی پیچھے والی سیٹ پر۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سڑک کے اِدھر اُدھر فضا پر نگاہ جمائے۔ مگر یہ ناممکن تھا کیونکہ موٹر چلانے والا سوائے سڑک کے اور کسی چیز کو غور سے نہیں دیکھ سکتا۔ اسے خیال آیا کہ اسٹیونس نے فضا کے مطالعہ کے لئے ریل کے ڈبہ کو نہایت ہی موزوں نقطہ نظر بتایا ہے اور اس نے اپنے دل میں کہا کہ اس کام کے لئے سب سے خراب نقطۂ نظر شاید موٹر کار کا اسٹیرنگ ہے۔ موٹر چلانا نیچر سے زبردستی توجہ ہٹائے ہی رہتا ہے۔

کافی دور نکل کر اس نے کہا "بھائی جان۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں کل اپنے گاؤں چلا جاؤں۔ آپ تو کہیں جون میں آئیں گے جب سب کچہریاں بند ہو جائیں گی"

"آخر جلدی کا ہے کی ہے" بھابی بولیں۔

"تو بھائی جان" عارف نے اس طرح کہا جیسے کہ بھابی کے وجود کا وہ قائل ہی نہ تھا "کل صبح ہی میں چلا جاؤں۔ مجھے اس وقت گاؤں نے بہت متاثر کیا اور میں ابکی چھٹی بالکل دیہاتی زندگی گزار کر بسر کرنا چاہتا ہوں"

"تم۔ وڈزنری۔ اکسٹریمیسٹ ڈریمر ہو عارف"

"یہ کیا مطلب" بھابی بولیں

"آپ یہ نہیں سمجھ سکتیں بھابی"

"تم کو نہیں جانے دیا جائیگا ابھی۔ وہاں پاگلوں کی طرح پھرنے کے لئے اور پھر وہاں

تمہارے کھانے پینے کا انتظام کیا ہو گا؟"

"ان کو بکنے دیجئے بھائی جان آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ٹھیک تو کہہ رہی ہیں یہ۔ میری حیثیت تمہارے لئے خالی بھائی کی ہی نہیں بلکہ میں تمہارے باپ کی جگہ بھی ہوں اور اس لئے تمہارے کریکٹر میں جو بیکار اور بے فائدہ رجحانات پیدا ہوتے دیکھوں ان کو روکنا بھی فرض ہے۔ تمہاری بھابی ٹھیک کہتی ہیں۔ تمہیں وہاں اکیلے بڑی زحمتیں ہوں گی۔ ہم لوگوں کے ساتھ ہی چلنا"

"ٹھیک" بھابی نے کہا اور کھلکھلا کر ہنسیں۔

عارف خاموشی سے موٹر چلاتا ہوا اپنے گھر واپس پہونچ گیا۔

V

داغِ تمنّائے نشاط

(۱)

"بھئی اللہ - اب ہمیں اس سے ملادو - تمہارے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔"

"واہ - کیا بات کہی ہے پھڑکا دیا - کیا قیامت کی بات - اس کی تعریف ہی نہیں ہوسکتی - ہر شخص اس کی گہرائیوں تک پہونچ ہی نہیں سکتا - کسی عاشق نے اپنی بیتابی دل کا اظہار ایسے عمدہ الفاظ میں نہیں کیا ہوگا - کیا جملہ بولے ہو کمال یہ ہے کہ لکھنو کی تمام ذہنیت - تمام کلچر تمام ادب اس جملے میں سمٹ آیا ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کس پہلو سے اس پر غور کروں - کیا مظلومی، کیا بے بسی ہے - مراثی کے تمام مبینہ اور بیانات مصائب کا لہجہ اس کے سامنے گرد ہے - محاورات اور زبان کا کمال ہے۔"

"اب بتاؤ نہ مجھے"

"میں تمہیں بتاتا ہوں - میں تمہاری پوجا کرتا ہوں - ارے ایسا کمال کا جملہ کوئی نہیں بول سکتا سوائے تمہارے - میرے اوپر عجیب کیفیت طاری ہے - دیکھتے نہیں ہو - موٹر رکی جارہی ہے - اس جملے نے مجھے ایسا متعجب کردیا ہے کہ ہاتھ پاؤں شل ہوگئے ہیں۔"

"تم کچھ کروگے بھی۔"

"میں نے راہِ عشق میں تمہاری کون خدمت انجام نہیں دی"

"کچھ نہیں۔ کسی دن تعرف بھی نہ کرایا جو بول چال کا سلسلہ شروع ہوجاتا"

"کب کراتا؟ قسمت نے کبھی کوئی موقع ہی نہیں دیا۔ اب کیا کردوں۔ وہ یونین کی صدارت کے لئے کھڑی ہوئی تو میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ اب تم اس کے لیے کام کرنا اور التفات بڑھ جائے گا مگر وائے قسمت اس کے جو خلاف کھڑے ہوئے تھے انہوں نے اپنا نام واپس لے لیا اور پھر ضرورت ہی نہ پڑی الیکشن کی"۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کسی دن مجھے اس کے گھر لے چلو اور تعرف کرادو"

"اف۔ اف۔ کتنا زبردست مرحلہ ہے یہ۔ تم کو اپنی ہیرو ازم میں دکھائی نہیں دیتا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ نپولین کی طرح تم نے حکم دے دیا بس یہ نہیں دیکھتے کہ تمہارے جنرل کے لئے کہاں تک بس کی بات ہے"۔

"تمہارے بس میں نہیں۔ یوں ہی ٹالتے ہو"

"ہم تمہاری بات ٹالیں گے۔ ہاں سانگو پانزا کی طرح یہ ہمارا فرض ہے کہ تمہیں بتادیں کہ یہ ہوائی چکیاں ہیں دیوزاد نہیں ہیں۔ اچھا تم کہتے ہو تو ابھی چلو۔ میں اس کے گھر ہی کی طرف موٹر موڑے لیتا ہوں۔ مگر ہوگا کیا۔ تم کو برآمدے میں بیٹھا چھوڑ کر مجھے اندر بلائے لئے چلی جائے گی۔ اسے حضور دی ڈن کوئیزٹ صاحب وہ ڈلسینا ڈل ٹبوزو ہے معشوق ہے ظالم ہے۔ بے رحم ہے"۔

"یہ اُس زمانے کی لڑکی نہیں"

"واہ۔ پھر تم نے ہیرو والی بات کہی۔ زمانہ بدل گیا مگر فطرت کے اصول دائمی ہیں معشوق کا ناز۔ بے وفائی۔ بے رحمی۔ ظلم۔ جفائیں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ توبہ کرو"۔

"اور دوسرے لوگ جو وہاں جاتے ہیں"

"وہ اغیار ہیں۔ اغیار۔ عاشق نہیں۔ وہ محترم رہیں گے۔ رات کو خوب مے پئے گی

ان کو ساتھ لئے ہوئے۔ ان پر تو اس کی خود کی نگاہ لطف ہے اور تمہارے سلسلہ میں معاملہ یہ ہے کہ تم ہو مشتاق اور وہ بیزار۔"

"تو پھر کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ تم نے ہمیں امید وصل کیوں دلائی تھی۔"

"پہلے تمہیں محبت برائے محبت تھی۔ تم اسی درجہ پر رہتے۔ مگر تمہارے اندر ہیرواک اسپرٹ (فاتحانہ جذبہ) نے ایک غیر لکھنوی پہلو بدلا بہت عمدہ۔ ہم اس پر بھی راضی۔ خدمت کے لئے پورے پورے تیار۔ جہانگیر اور نور جہاں کے واقعے کی مثال لے کر بڑھے۔ مگر ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ مارچ سے یہ ستمبر ہے ابھی چھ مہینے ہوئے ہیں کل۔ جہانگیر نے تو پانچ برس صبر کیا۔ بادشاہ ہو کے۔ ذرا صبر سے کام لو۔ تم تو سید ہو۔ صابروں کا خون ہے تمہاری رگوں میں۔ صبر بھی تمہارا اتنا ہی ہیرواک ہونا چاہیے جتنی تمہاری بے قراری ہے۔ تھے تم صابر ایسے مگر اس تعلیم نے بی۔ اے کی ڈگری نے اسے ختم کر دیا یہ تعلیم بالکل ذلیل چیز ہے۔"

"پھر تم لگے مجھے بنانے۔"

"میں بناؤں گا تمہیں۔ بناتا تھا میں کمارہ کو مر گیا بیچارہ اور تم کو میں بناؤں گا۔ وہ مجھ سے کچھ چھوٹا تھا اور تم مجھ سے کتنے بڑے ہو۔ اور پھر میں اگر تم کو احمق سمجھوں تو مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں۔ آخر میں بھی تو اسی طرح کا عاشق ہوں جیسے تم۔ ایک وہ چیز جس سے ملنا ناممکن ہے اس پر جان دے رہا ہوں اسی کا تصور کئے ہوئے بیٹھے رہنے کی فرصت ڈھونڈھ رہا ہوں۔ مجھے تمہاری محبت سے پوری ہمدردی ہو گئی تھی کیونکہ میری محبت اور تمہاری محبت میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں کی معشوق سگی بہنیں۔ سگی بہنیں اس معنے میں بھی کہ ان کی ہماری طرف توجہ ہونا ممکن ہی نہیں۔ نہ شکنتلا پھر سے زندہ ہو سکتی ہے جو ہماری محبت کا خیال کرے، اور نہ نرملا پھر سے پیدا ہو سکتی ہے جو تم پر رحم کرے۔ ہم دونوں کے لئے محبت ایک روحانی افیم تھی جس کے نشے میں دونوں کو غیں رہنے کی عادت ہو چکی تھی۔"

"یہ سب تو کنووکیشن کے دن تک تھا۔"

"ہاں تمہاری محبت نے ارتقار کیا اور میری محبت نے بھی اور تمہاری محبت کا ارتقار بہتر ہوا میرا بدتر اور یہ مانتے ہوئے ہیں تم کو کیسے بتا سکتا ہوں"

"یہ بدتر اور بہتر میں نہیں سمجھا"

"تمہاری محبت نے تمہارے اندر ایک عزم پیدا کر دیا۔ یہ عزم بی۔ اے کی ڈگری ملنے سے ہوا یعنی تعلیم کی روشنی نے یہ عزم پیدا کیا اس لئے یہ بہتر چیز ہوئی۔ میرا عشق زوال کی طرف گیا۔ میرا عزم رفتہ رفتہ ٹوٹ رہا تھا اور تمام تر جہالت کے اثر سے جاہل لوگوں کے اثر سے۔ میری بھابی بالکل جاہل کی لٹھیا۔ میں لاشعوری طور پر اس کا عاشق رہا۔ تم تمکو وغیرہ سے بڑھ کر نرملا تک پہونچے۔ میں شکنتلا سے گر کر بھابھی تک آیا اور حماقت یہ کہ مجھے خیال بھی نہ گزرا کہ میں کتنا گر رہا ہوں اب میں سوچتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ مجھے بھابھی سے اس قسم کی محبت تھی جسے سائیکالوجی میں مدر فکزیشن کہتے ہیں اور اس کے بعد بھی گرتا گیا۔ تمہارے دولہا بھائی بقول تمہارے جہالت کا مجسمہ ان کے نظریہ عشق سے متاثر ہوا اور اب بھی ہوں، اب سمجھو کہ میں تمہیں کیا بتاؤں گا۔ اپنے گریبان میں تو منہ ڈال کر دیکھوں پہلے"

"اما۔ ان فضول کی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی ترکیب کرو"

"کروں گا۔ ضرور کروں گا۔ سات مہینے ہیں اور اس ایم۔ اے پارٹ ٹو کے۔ بس اتنے دنوں تم صبر کے ساتھ کاٹ دو۔ ممکن ہے اس سے پہلے ہی لیلئ مقصود سے وصل کا کوئی موقع نکل آئے .... اچھا لو اب تمہارے گھر کی گلی آگئی"

"اچھا تم منیر کے یہاں جا رہے ہو ان سے کہہ دینا کہ وہ کتابیں کل لائبریری سے نکل آئیں گی"

"کتابیں۔ منیر کو کتابوں سے کیا کام"

"وہ آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس میں۔ بیٹھنے کی ٹھان کے آئے ہیں نینی تال سے"

"اچھا" اور وہ ہنسا

جتو اتر کر چلے گئے اور عارف اپنی خالہ کے گھر پہونچا۔

پھاٹک کے بعد والے کچے صحن میں کیا دیکھا کہ منیر کی موٹر کو چار آدمی دھکیلنا شروع کر رہے ہیں اور مرزا بسم اللہ جان بیگ اس کے پاس کھڑے ہیں۔ عارف کی موٹر کی طرف دیکھ کر مرزا بولے "ادھر بڑھا لایئے۔ رستے سے ہٹا کے کھڑی کیجئے"۔

عارف اتر کر ان کے پاس گیا تو بولے "آپ بڑے موقع سے آئے" اور ہاتھ مار کر بولے "کھی کھی کھی، آخری دیدار لکھا تھا آپ کو بھی اس مرحوم موٹر کا"

"تو اچھا یہ چار آدمی اس کا جنازہ لئے جا رہے ہیں اور آپ اس کے ساتھ جا رہے ہیں پیش خواں کی طرح پڑھتے ہوئے"

"واہ بھی خوب آپ نے۔ کھی کھی" اور پھر بولے "اس میں اب رہ کیا گیا۔ ساری گرمی۔ ساری برسات اس پر گزر گئی"

جو آدمی گاڑی کو دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے ان میں سے ایک نے عارف کی طرف رخ کر کے کہا "صاحب اس میں رہ کیا گیا ہے۔ ٹائر، ٹیوب، ہڈ، گدی، پوشش سب گل گئی"

"تو آپ اب اس کا کیا کیجئے گا" عارف نے پوچھا۔

"ہم کیا جانیں نوکر آدمی۔ ہمارے صاحب کا حکم ہوا کہ دھکیلوا لاؤ تو لئے جاتے ہیں کھول کھال ڈالیں گے لے جا کے پارٹ میں کام آ جائے گی"

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ منیر میاں باہر آ گئے۔ عارف بڑھ کر ان سے گلے ملا اور بولا "اما تم نے خبر بھی نہ کرائی ہمیں وہ تو کل جتو سے معلوم ہوا اور آج کلاسز نہیں ہوئے تو میں ادھر ہی چلا آیا"

منیر نے موٹر لے جانے والے آدمی کی طرف ایک رقعہ بڑھاتے ہوئے کہا "لو یہ رسید تبرجی صاحب کو دیدینا۔ اور موٹر تو تم اب لے ہی جاؤ گے"

"جی ہاں - مگر یہ تو دھنس کے رہ گئی ہے - میں سوچ رہا ہوں مکینکوں کو بلا لاؤں اور الگ الگ کر کے حصے ایک ٹھیلے پر لدوا لے جاؤں"

"جیسے بھی لے جاؤ" اور منیر نے عارف سے کہا "آؤ عارف گھر میں چلو"

مرزا اپنے کوٹھے کی طرف واپس گئے اور عارف و منیر گھر کے اندر گئے -

عارف اپنی خالہ کے پاس آکر بیٹھا تو وہ بولیں "ڈپٹی کلکٹری میں داخلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں"

"داخلے کی ؟"

"ہاں - امتحان ہوگا - اس میں پاس کر کے ہو جائیں گے"

عارف مسکرایا اور منیر کے کمرے کی طرف رخ کر کے ذرا زور سے بولا "ارے بھئی منیر کہاں گھس گئے - اور وہ بھابھی بھی وہیں ہے - واہ - یہ کیا ہم سے پردہ کرایا جائے گا"

"ابھی شرماتی ہے ذرا" خالہ بولیں -

"خوب - یہ ہمیں سے شرم ہے واہ" اور وہ اٹھا اور لپک کر منیر کے کمرے میں ہو لیا - یہاں مسہری پر منیر میاں کی بیوی نے عارف کو آتے دیکھکر ایک لمبا سا گھونگھٹ کاڑھ کر اپنا رخ دیوار کی طرف کر لیا - عارف نے منیر کی طرف دیکھا جو پاس تخت پر گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے تھے اور ایک کتاب ہاتھ میں لئے تھے اور کہا "بھئی منیر یہ طریقے ہم کو نہیں بھاتے - اگر یہ ہمارے سامنے یوں گھونگھٹ کاڑھا جائے گا تو ہم دوپٹہ ہی نوچ کر پھینک دینگے"

منیر کتاب کو تخت پر رکھتے ہوئے مسکرائے اور بیوی کی طرف رخ کر کے بولے -

"ان سے کیا شرم یہ تو ہمارے ہمجولی ہیں"

عارف نے شہ پائی اور پاس آکر منیر کی بیوی کا گھونگھٹ الٹ دیا - انہوں نے اپنا منہ بالکل دیوار کی طرف کر لیا اور منہ پر ہاتھ رکھ لئے - اس اثنا میں عارف کو ان کے لمبے سیاہ اور بدنما چہرے کی جھلک دکھائی دے گئی تھی - اس کے دل میں کچھ نفرت سی پیدا ہوئی

اور اس نے کہا "جائیے ہم خود آپ سے پردہ کیا کریں گے۔ ہمیں نخرے نہیں پسند آتے چاہے
کوئی بھی عورت ہو"

اور یہ کہکر وہ برآمدے میں آیا اور اپنی خالہ کے پاس بیٹھ گیا۔ باجی جواب رسالہ رکھ کر
اپنے پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں بولیں "دیکھ آئے دولہن"

"ہماری قسمت میں انہیں دیکھنا ہی نہیں لکھا ہے پورے طور سے۔ شادی سے
اب تک ہنوز روز اوّل ہی ہے"

اور اس نے غور سے باجی کے چہرہ کو دیکھا جس پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ وہ ہنسا
تو اس کی خالہ نے آنکھیں پھیر کر اس کو دیکھا اور کہا "تمہاری بھابی سے اچھی ہی ہے صورت میں"

"اتنا اندازہ تو مجھے ہو گیا خالہ جان کہ میری بھابھی سے بڑی اچھی ہے۔ بڑی ہی"

"اور بڑی سیدھی ہے۔ کامیدہ ہے۔ تمہاری بھابھی کی سی پھوہڑ نہیں۔ بچوں تک کا
ہوش نہیں جنہیں ہر سال جنتی ہیں اور نوکرنیوں اور اناؤں پر ڈال دیتی ہیں۔ دیکھتی تک
بھی نہیں۔ اور تم کو اتو بنا رکھا ہے۔ سب تمہاری آمدنی سے بھی اپنے میکے والوں کا بھرنا بھرتی ہیں"

"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں خالہ جان بڑی بدذات بڑی خراب عورت ہے ہماری
بھابھی مگر میں کیا کروں"

"تم اس کے پاس رہو ہی نہ۔ تمہارا روپیہ آمدنی سب الگ ہے۔ میرے یہاں
آکے رہو۔ ابھی ادھر کے کمرے میں رہو خالی پڑا ہے۔ پھر ہم تمہاری شادی کر دیں گے تمہارے
امتحان کے بعد تو اوپر مرزا والا حصہ خالی ہو جائے گا اس میں رہنا۔ ہیں ماسٹر ہو جاؤ گے
اسکول میں اپنے کام پر چلے جایا کرنا"

"واہ واہ۔ خالہ جان آج مجھے معلوم ہوا کہ پوری ماں کی محبت ہے آپ کے دل
میں میرے لئے۔ میری پوری زندگی کا پلاٹ بنا دیا یعنی نقشہ کھینچ دیا۔ واللہ میں ابھی سے اس پر
عمل کرنے کی کوشش شروع کرتا ہوں جا کر۔ ابھی جاتا ہوں"

اور وہ باہر چلا آیا - موٹر پر بیٹھ کر اسے یاد آیا کہ جبّو نے جو بات کتابوں کے بابت کہلوائی تھی وہ تو منیر سے کہنا بھول ہی گیا - مگر اس نے کہا کہ ہو گا جبّو کی ہیر دا زم ہی کیا جو شام تک خود ہی آ کر نہ کہہ جائیں - جب وہ موٹر معمولی سے زیادہ اسپیڈ پر دوڑتا ہوا آ رہا تھا تو اسے کبھی تو اپنی خالہ کی باتوں پر ہنسی آ رہی تھی اور کبھی غصّہ کہ وہ کس مادرانہ محبّت کی آڑ میں اپنی جلن نکالنے پر تلی ہوئی تھیں -

گھر پہونچ کر اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور گھر کے اندر گیا - بھابھی پلنگ پر بیٹھی تھیں اور ان کا تین مہینہ کا بچہ پاس لیٹا تھا - عارف نے پاس آ کر کہا "بھابھی - تمہارے نخرے میں گرم مسالہ"

"پھر تو لیڑ چنگی باتیں کرنے لگا - میں نے کہا تھا کہ آدمی بن"

"میں اب اسقدر تو آدمی بنتا رہتا ہوں - اب مجھ سے آدمی نہیں بنا جاتا - بالکل نہیں - آج تمہاری تمام بد ذاتی کھل گئی - اب تمہارے نخرے میں گرم مسالہ اب ہم تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتے معلوم ہو گئیں تمہاری حرکتیں سب"

"میری حرکتیں"

"ہاں مجھے الّو بنائے ہوئے ہو - میری سب آمدنی غصب کرتی ہو - اور نہ معلوم کیا کیا کرنے والی ہو - بس تم بالکل بد ذات ہو، مکّار ہو - ہم بھائی جان سے بھی باز آئے تمہارے مارے - اور بس ہم ٹھیلے لے آئے ہیں - ان پر ہمارا اسباب لد رہا ہے اور تم ہماری اس مہینہ کی آمدنی کے جتنے روپیہ بچے ہیں سب ڈھیلے کرو - اور ہم حساب نہیں کرتے، تمہارے ایمان پر چھوڑے"

"یہ تجھے ہو کیا گیا ہے آج"

"مجھے کچھ بھی ہوا ہو تم سے کچھ مطلب نہیں - تم اپنے نخرے سکے جاؤ ہم نے ان میں گرم مسالہ کر دیا - اب ہماری پوری زندگی کا نقشہ بن گیا ہے"

"زندگی کا نقشہ - کیا باتیں کر رہا ہے"

"ہم تم سے کچھ نہ بتائیں گے - خیر اچھا سنو - ہماری ماں کی جگہ موسی جو ہیں انہوں نے ہمیں اپنے گھر رہنے کو بلایا ہے - اپنے گھر میں ایک کمرہ دے دیا ہے - ہماری شادی کر دینگی منیر کی سالی کے ساتھ جو تم سے لاکھ درجے خوبصورت ہے تمہارا خاندان بھر جس کے تلوے کے برابر نہیں اور پھر ہم ماسٹر تو ہوئیں گے ہی - منیر میاں ڈپٹی صاحب ہو جائیں گے ہی - غرض ہم اسی گھر سے اسکول پڑھانے جایا کریں گے اور یوں ہی ہماری پوری زندگی تیر ہو جائے گی تم نے کبھی ہماری زندگی کے بابت ایسا نہ سوچا"

"اچھا - میں اب سمجھی" اور بھابی ہنسیں "اچھا یہ پڑھا رہی تھی تمہیں وہ - تم کالج نہیں گئے تھے وہاں چلے گئے تھے"

"آج کالج میں چھٹی ہو گئی - ایک صاحب مر گئے ہیں - میں وہاں چلا گیا - اور بہت اچھا ہوا - کالج میں کبھی ایسی اچھی پڑھائی نہیں ہوتی جیسی وہاں آج ہوئی - بڑی عمدہ پڑھائی ہوئی"

"تو اب اس پڑھائی پر عمل کی ٹھان کے آئے ہو"

"بالکل - اور آج وہ صورت دیکھی کہ کیا کسی کالج کی لڑکی کی ہو گی - منیر کی بیوی کی - واہ واہ - تم سے کیا کہوں - تم اس کے تلوے کے برابر نہیں"

"یا وہ میرے تلوے کے برابر نہیں"

اب جو کچھ سمجھ لو - بات یہی ہے کہ وہ تم سے بڑی - بڑی .....

"مجھ سے بڑی ہے سن میں"

"سن سے دوڑیں - خوبصورتی میں بڑی ہے - بس ہم تمہارے پاس نہیں ٹھہر سکتے"

"اچھا تو جاؤ بسم اللہ"

اس وقت نوکر کا لونڈا برآمدے کے پاس آ کر بولا "بیگم صاحب اپنا منہ پھیر لیو میرے ابا آوت ہیں"

اس کی یہ بات سنتے ہی عارف کو بڑی زور سے ہنسی آئی اور وہ متواتر ہنستا ہی رہا بھابی بھی ہنسنے لگیں۔ لونڈا منہ کھولے آنکھیں نکالے ایک سے دوسرے کو گم سم کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آخر کو عارف نے ہنسی روکتے ہوئے کہا "کمال کر دیا اس لونڈے نے" اور پھر ہنسنے لگا۔

"ارے اُلّو کے پٹھے" بھابی نے کہا "میرے منہ پھیر لینے سے میرا پردہ کیسے ہو جائیگا۔

"اُف بھابی" عارف نے ہنسی روکتے ہوئے کہا "آپ اسے ناحق سمجھاتی ہیں وہ نہیں سمجھ سکتا" اور وہ پھر ہنسنے لگا۔

"میں نے اسے ادھر کمروں کے جالے لوانے کے لئے بلایا تھا"

"تو آپ اپنا منہ پھیر لیجئے تاکہ آپ اسے نہ دیکھیں۔ اسے آپ کو دیکھنے کا سوال ہی نہیں"

بھابی نے لونڈے سے کہا "چل بھاگ۔ اُلّو کا پٹھا کہیں کا" اور پلنگ پر سے کھڑی ہو کر بولیں "چلو عارف میں باہر تمہارے کمرے میں ہو رہوں گی وہ یہاں سب جالے لے گا"

"تم میرا سب اسباب بندھوانے میں مدد کرنا۔ میں جا رہا ہوں نا۔ اور تم نے بھی ہاں کر دی ہے"

"کیا پھوہڑپن ہے" عارف کے کمرے میں داخل ہو کر بھابی نے کہا "کوئی چیز ٹھکانے سے رکھی ہی نہیں"

"ہاں تمہارا پھوہڑپن ہے یہ۔ خالہ جان سچ کہتی ہیں۔ ان کے یہاں جا کر رہوں گا تو وہ سب کچھ دیکھ لیا کریں گی"

"تو چلے جاؤ نا کسی نے روکا ؟" اور بھابی نے نہایت ناز سے آنکھیں پھیر کر عارف کو دیکھا۔

"ہائے۔ ہائے۔ منہ سے تو کہہ رہی ہو جاؤ۔ مگر ان آنکھوں سے کلیجے تک کو روک رہی ہو۔ کیا کہیں غالب کی بھی کوئی بھابی ضرور ہو گی جس کے در پر سر پھوڑنا ہی پھوڑنا تھا مگر پھر بھی ان کو اس بھابی کے سنگ آستاں سے ہٹتے نہ بن پڑتی تھی تب ہی تو کہہ گئے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

اور سنگ دل بھابی جانتی ہے کہ ہم نہیں جا سکتے کہیں تب ہی نازسے کہتی ہے چلے جاؤ نا۔ ہم نہیں جائیں گے ہرگز نہیں جائیں گے۔"

بھابی آرام کرسی میں لیٹ گئیں اور قہقہہ مار کر ہنسیں۔ عارف نے پاس آکر اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے کلّے پکڑ لئے۔ انہوں نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا عارف الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

بھابی مسکرا کر بولیں "اب تمہاری دسہرے کی چھٹی ہوگی اور ان کی بھی ہوگی ہم کو میرے میکے لے چلنا"

"ضرور۔ نہ لے چلیں گے تو کریں گے کیا۔ ہماری نکیل تو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم جدھر چاہو گی ادھر ہم موٹر بڑھا دیں گے"

(۲)

راغب حسین زیدی نے ہر سال کی طرح ابکی بھی دسترخوان کیا تھا اور اس میں اپنے دوستوں اور مخصوص شاگردوں کو بلایا تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور پانچ بجے کا وقت تھا عارف ان کے گھر پر پہونچا۔ ابھی تک کوئی اور نہیں آیا تھا۔

راغب صاحب نے اس کو باہر کے کمرے میں دری کے فرش پر بٹھاتے ہوئے پوچھا "اور آصف نہیں آئے"

"وہ خالو کے یہاں گئے ہیں۔ کہا کہ تم چلو میں آجاؤں گا،...... ابھی تک کوئی آیا نہیں پانچ تو بج چکے"

"ہاں۔ انڈین اسٹنڈرڈ ٹائم چلتا ہے۔ سات بجے آجائیں گے لوگ" اور راغب صاحب کھل کھلا کر ہنسے اور پھر بولے "تم سب لڑکوں کے لئے یہاں انتظام ہے اور ہم سب بڑے بوڑھے اندر بیٹھیں گے...... اچھا میں ابھی آیا"

وہ اندر چلے گئے۔ عارف کو انتظار ہمیشہ کھلتا تھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اسے خیال ہوا کہ کہیں اور ہو آئے تو پھر آدھ گھنٹے کے بعد یہاں واپس آئے۔ یہ ارادہ کر کے وہ اُٹھنے ہی والا تھا کہ تصدق حسین نقوی صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔

"ارے عارف تم اتنے جلدی آگئے"

"ہاں۔ ہم اپنے ٹائم سے آئے انڈین اسٹنڈرڈ ٹائم کا خیال نہیں رکھا ابھی معلوم ہوا ماسٹر صاحب سے یہ ٹائم کم از کم دو گھنٹے پیچھے ہوتا ہے۔ خیر یار تم نے تو چھوڑ دیا کالج"

"راغب بھائی نے اپنے اسکول میں ایک جگہ لگوا دیا ہے۔ ایم۔ اے پار سال کر لوں گا"

"اب تم ایم۔ ایس۔ سی کرنا فزکس میں وہ تمہارا خاص سبجکٹ ہے نا" اسی میں تم سنئے ایجادات کرنے والے ہو"

"ہاں یار اسکول کی نوکری سے ایک فائدہ ہوا کہ ایک لبوریٹری کام کرنے کو مل گئی۔ اور ایم۔ ایس۔ سی کرنے کو کہو تو نیوٹن کیا پڑھا تھا اور فیراڈے تو جلد ساز تھا اور......"

ان کی بات وہیں کٹ گئی کیونکہ عباس علی صاحب آگئے اور ان کو دیکھ کر عارف بولا

"اماں گئے نہیں واپس اپنے اصطبل؟"

"اصطبل؟" نقوی نے پوچھا۔

"میں الہ آباد گیا تھا تو مجھے ان کے ٹیچرس ٹریننگ کالج کا ہوسٹل دکھایا ایک صاحب نے بالکل اصطبل کی طرح کا بنا ہوا ہے"

"ہے تو اصطبل ہی۔ خدا اس سے پار لگوائے" عباس علی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اماں۔ تمہارا تو نصب العین مطمح نظر و حاصل زندگی وہی تھا" عارف نے کہا۔

عباس علی نے کھیسیں نکال دیں اور آنکھیں بند کر لیں۔

"مگر ہے یار یہ بڑا عقلمند" نقوی بولے "چلتا ہوا آدمی ہے۔ صاف چرکا دے گیا ان نواب کو"

"آئیں کیسے" عارف نے کہا۔

"اچھا آپ ہی بتائیے" عباس علی عارف سے متوجہ ہو کر بولے "کہ کسی کی زندگی اتنے سستے داموں خرید لینا کہاں تک بجا ہے"

"اچھا آپ کی زندگی اخ خوہ۔ ان نواب نے جو کچھ کھلایا پلایا آپ کو دو سال اور فیس دی آپ کی وہ دام۔ اور خریدنا یہ ہوا کہ وہ اپنی لڑکی کی آپ کے ساتھ شادی کر دیتے۔ یہ تمام فلسفۂ تجارت ہے۔ اف۔ فوہ" اور عارف نے ان کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"آپ بتائیے کہاں تک انصاف ہے؟"

عارف نے عباس علی کے چہرہ کو غور سے دیکھا اور اسے اُس پر ایک عجیب قسم کا کمینہ پن چھایا ہوا نظر آیا۔ اسے غصہ آ گیا اور سخت لہجہ میں اس نے کہا "اونھ۔ بڑے آئے تم۔ تمہاری زندگی بڑی قیمتی ہے۔ کمینے کہیں کے۔ ناشکرے کہیں کے۔ اس بچارے نے کس امید کے ساتھ تمہارے آڑے وقت مدد کی اور مدد کرتا رہا اور اب جب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لائق ہوئے اس کو چرکا دے دیا"

"میری شادی ایک تحصیلدار کی لڑکی سے ٹھہر گئی ہے"

"ہاں۔ تم چپراسی کے لونڈے کے لئے تحصیلدار اللہ میاں کے برابر کوئی چیز ہوئی۔ ہو نہ چھوٹی قوم۔ کم اصل سے کبھی وفا نہیں ہوتی"

"ارے بھائی جانے دو تمہیں کیا" نقوی نے روکا۔

"مجھے ایسی حرکتوں پر بڑا غصہ آتا ہے۔ جب سے اس نے وہ اختر شیرانی والی نظم اپنی کہہ کر سنائی اور میں نے اس کا بھانڈا پھوڑا تھا اس وقت سے میں اسے چوٹا تو جان گیا تھا۔ مگر میں اسے اس حد کا کمینہ نہیں جانتا تھا۔ جی میں آتا ہے......"

مرزا صاحب داخل ہوئے "رہنے دیجئے عارف صاحب۔ آپ کا غصہ بہت برا ہے۔ غصہ تھوک ڈالئے۔ جانے دیجئے" کہتے ہوئے وہ عارف اور عباس علی کے درمیان بیٹھ گئے

اور بولے "آخر بات کیا ہوئی دو کھی۔ کھی"

عارف کو بھی ہنسی آگئی اور وہ بولا "جانے بھی دو ہمیں کیا مطلب"

نقوی نے باتوں کا رخ موڑنے کے لئے کہا "بھائی مرزا جب سے مصباح کو امپیریل سکریٹریٹ میں جگہ ملی تم اکیلے اکیلے سے ہو کر رہ گئے"

"خیر۔ وہ تو اپنے مزے میں نکل گئے۔ ٹھاٹھ ہی ٹھاٹھ لکھتا ہے راوی دلّی میں نہایت ڈیسنٹ کواٹر میں رہتے ہیں اور صاحب بنے پھرتے ہیں، سوٹ ڈانٹے پونے دو سو تنخواہ۔ اور سنا آپ نے بس ہفتہ ہی عشرہ میں ان کی شادی ہونے والی ہے۔ آپ سب کو بلائیں گے"

"اچھا تو وہ بھی کواڈرو پڈ یعنی چوپائے ہو جائیں گے"

"چوپائے؟" نقوی نے کہا۔

"اور کیا۔ جب تک آدمی کی شادی نہ ہو وہ بائی پڈ یعنی دوپایا ہے اور شادی ہوتے ہی چوپایا ہو جاتا ہے"

"کیا ہو جاتا ہے۔ کیا ہو جاتا ہے" کہتے ہوئے راغب صاحب کمرے کے اندر آئے،

"کچھ نہیں ماسٹر صاحب" عارف نے کہا۔

"میں نے سب سن لیا۔ اور تم بھی تو چوپائے ہونے والے ہو جلد از جلد۔ آصف مجھ سے کہہ رہے تھے۔ اپنی بھابی سے التجا کر چکے ہو"

اس پر سب ہنس دئے۔ عباس علی جن پر اداس پڑ گئی تھی وہ بھی ہشاش بشاش ہو گئے۔

"تو ماسٹر صاحب میرا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ چوپایا کچھ بری چیز ہے۔ سب ہی کو ہونا پڑتا ہے"

"تمہارا تو خیال زندگی بھر شادی کرنے ہی کا نہیں ہے اور تم اپنے ہر دوست سے کہتے ہو کہ مرنے کے بعد میری قبر پر غالب کا یہ شعر لکھوانا۔ کیا شعر ہے وہ۔ کیا"

"لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا"

مرزا بولے "یہی ہے نہ کیوں عارف صاحب"

"ہاں ہاں مگر آپ لوگ میری بات غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں جو خود شادی نہیں کرنا چاہتا تو آپ سمجھتے ہیں کہ شادی شدہ لوگوں کی میں ان کو چوپایا کہہ کر ہتک کرتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے ......"

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ آصف صاحب اور منیر میاں آگئے۔ راغب صاحب دروازے کی طرف پلٹے اور آصف کو دیکھکر بولے "آؤ بھئی آصف۔ ہم سب بزرگوں کا ٹھکانہ اندر ہے۔ منیر میاں تم یہیں بیٹھو۔"

"کیا بحث تھی،" منیر میاں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

مرزا کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ان کو روک کر عارف نے کہا "دیکھو میری رائے میں تم ضرور ڈپٹی کلکٹر ہو جاؤ گے اور ان لوگوں کو شک ہے اسی کی بحث ہو رہی تھی۔"

منیر میاں کے گورے چہرہ پر مسکراہٹ کھیلی اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ سوائے ان کے اور کسی کی بابت بات چیت ہونا ممکن ہی نہ تھا انہوں نے پوچھا "یہ لوگ کیا کہتے ہیں"

"یہ لوگ سب لامذہب مادہ پرست ہیں یہ کیا سمجھیں کہ شاہ مینا صاحب میں ہر جمعرات دعا مانگنے اور حاجی صاحب کو روز ایک روپیہ دے کر چلّہ کھنچوانے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ اپنی اپنی الگ لئے پھرتے ہیں کہ یہ قابلیت ہو اور یہ محنت ہو اور یہ ہو اور وہ ہو۔"

"اس سائنس کے زمانہ میں تو آسمان سے گر کے ملتی ہوئی کسی کو نہیں دکھائی دی۔" نقوی بولے

"میں بار بار کہہ چکا صاحب کہ مقابلے کے امتحان کے لئے دیباج جو کمرہ بند کرکے ڈٹا تھا تو پڑھتے پڑھتے بالکل بیلا ہو گیا تھا اور فرسٹ کلاس تھا،" مرزا نے کہا۔

"تو پیلے تو یہ بھی ہوتے جا رہے ہیں۔ دیکھئے ان کی صورت کتنی بدل گئی۔"

"اب میں کچھ کہہ دوں گا تو یہ بگڑ جائیں گے خواہ مخواہ کے لئے۔ کھی۔ کھی۔"

"نہیں آپ کہئے ضرور،" منیر بولے۔

مرزا نے عارف کی طرف رخ کرکے کہا "کھی۔ یہ پیلے تو دوسری کتاب کو پڑھ پڑھ کر

ہوئے جا رہے ہیں۔"

"یہ کون سی کتاب میں نہیں سمجھا"، نقوی بولے۔

"میں سمجھ گیا" عارف ہنسا "ہاں اس کتاب کا درس سنتے ہیں جسم کو بہت زیادہ گھلا دیتا ہے"

"اچھا۔ اب میں سمجھا"، نقوی بولے اور ہنسے "مگر اس کا امتحان سے تو"

"منفی ہی تعلق ہے۔ ریاضیات کی اصطلاح میں۔ یہی میرا مطلب ہے کھی کھی۔ کھی"، مرزا بولے۔

اتنے میں سب لوگوں کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں اور جبو نواب گردن کوئی پندرہ درجہ کے زاویہ پر جھکی ایک ٹانگ تنی اور ایک جھکی جوتے اتارتے ہوئے دکھائی دئے۔

"آیئے محبوب صاحب آپ ہی کی کسر تھی" مرزا بولے۔

"اس وقت تو یہ تمہارا فقرہ جو تم بے سمجھے بوجھے بول دیا کرتے ہو بالکل موزوں بیٹھ گیا واللہ سچ مچ ان ہی کی کسر تھی۔ اب تو شام بھی ہو رہی ہے۔ پونے چھ ہو گئے۔ بھئی جبو ہیرو آدمی ہو تم ہم سب میں بیٹھ کر کیوں تضیع اوقات کرو۔ ذرا ماسٹر صاحب سے پوچھو۔ تمہارے تو دو ہم جماعت رہ چکے ہیں کہ اب کیا دیر ہے"

جبو نواب جوتے اتار کر فرش پر آ گئے تھے مگر عارف کی بات پر انہوں نے پلٹ کر پھر جوتے پہنے اور اندر چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد راغب صاحب ایک سینی میں بہت سی پوریاں لئے ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے جبو ایک قاب میں کباب لئے ہوئے آئے۔ سینی اور قاب سب لوگوں کے درمیان رکھ دی گئیں اور راغب صاحب "بھئی شروع کرو تم لوگ" کہہ کر گھر کے اندر واپس گئے۔ سب لوگ سینی میں سے پوریاں اٹھا اٹھا کر کباب سے کھانے لگے۔ راغب صاحب ایک صراحی اور کٹورا لئے ہوئے آئے اور بولے "لو یہ پانی ہے۔ اپنے پی پی لینا۔"

کھانے کے دوران میں باتیں بھی ہوتی جا رہی تھیں۔ عارف بولا "مصباح تو اپنی منزل مقصود پر پہونچ گیا کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا۔"

مرزا بولے "میرا بھی اب ٹھکانا دگا جاتا ہے۔"

"گیا تم بھی چلے۔ ایم۔ اے کرنے سے پہلے۔"

"ہاں۔ ایم۔ اے کر کے بھی کیا کرلیں گے۔ والد نے کمشنر سے کہہ رکھا تھا۔ اب اس نے عارضی چانس (موقع) جنوری میں دینے کا وعدہ کیا ہے والد کی رائے ہے کہ میں چلا آؤں۔"

"لو بھئی عباس علی" عارف نے عباس علی کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا "یہ بھی اللہ میاں کے نائب ہوئے۔"

عباس علی کے منہ میں پوری کباب ٹھونس کر بھرے ہوئے تھے اور وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ اپنی جگہ سے ہٹ کر صراحی کے پاس گئے۔ پانی پی کر واپس آئے تو عارف نے کہا، یار عباس علی تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو گئے۔ میں نے کچھ سخت بات کہہ دی۔"

"نہیں تمہاری بات کا میں برا نہیں مانتا۔ تم اکسٹریمسٹ (شدت پسند) ہو" اور وہ پھر اپنے منہ کو ٹھونس ٹھونس کر بھرنے لگے۔

"بس۔ بس۔ اب ہم خوش ...... اور مرزا تمہاری اس شادی کا کیا ہوا؟"

مرزا کھی کھی کر کے شرما گئے

منیر نے کہا "وہ سب معاملہ ٹھیک ہو گیا وہیں ہو گی جہاں یہ چاہتے ہیں۔"

"اما واہ۔ تم سب کے معاملے درست ہو گئے۔ اکبر نے کہا ہے ؎

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی۔ اے۔ ہوئے۔ نوکر ہوئے۔ پنشن ہوئی اور مر گئے

یہ نئی زندگی پر طنز ہے۔ ہم نے اس میں ترمیم کی پرانی قسم کی زندگی پر طنز ہو گیا۔ سنو ؎

کیا کہیں اجداد کیا کارِ نمایاں کر گئے
ختنے ہوئے، شادی ہوئی، بچے ہوئے اور مر گئے

ہم لوگ اس زمانے کے لوگ دونوں مدارج طے کرتے ہیں اکبر والے بھی اور میرے والے بھی،
چنانچہ تم لوگ سب دونوں حساب سے اول منزل طے کر چکے ہو۔ ختنے۔ بی، اے۔ نوکر۔ شادی
تم سب ان مدارج سے گذر گئے"

"میری شادی کا تو کوئی ٹھیک نہیں" نقوی بولے۔

"کیوں تم ان نواب کی لڑکی سے کرلو جہاں عباس علی رہتے تھے۔ تم کو رشک آتا تھا
ان کے کھانے پینے پر"

"بات تو تم نے ٹھیک بتائی۔ میں آج ہی سے کوشش شروع کر دوں گا"

"لو تمہارا ابھی سب ٹھیک ہو گیا۔ بس جگو اب رہے ہم اور تم۔ ہم دونوں ہی ایم۔ اے
کریں گے۔ یہ سب پیٹھ دکھا گئے اور رہی شادی تو تمہاری روز الست ۔ ہو گئی تھی اور ہماری
روز قیامت ہوگی"

جگو نے اپنی بائیں آنکھ سے عارف کو دیکھا اور مسکرائے۔

"مگر" مرزا بولے "محبوب صاحب کا قصہ تو بڑا اہم ہے۔ ان کا عشق اس نرملا سے"

"یہ قصہ تو دائمی ہے۔ یہ کبھی نہیں ختم ہو گا ؎

یارب دعائے وصل نہ ہرگز قبول ہو پھر دل میں کیا رہے گا جو حسرت نکل گئی"

"ایم، اے کرنے کے بعد" نقوی بولے "تو وہ ان کے ساتھ بھاگ جائیگی"

"بھاگ۔ اڑ جائیگی۔ میں ایک اڑن کھٹولا بنا رہا ہوں۔ اس پر ان دونوں کو بٹھا کر
پرستان کو اڑا دوں گا"

سب لوگ قہقہہ مار کر ہنسے۔

"بھئی ہم کھا چکے" کہہ کر عارف اٹھ کھڑا ہوا۔ گھر کے اندر آکر بمبے پر ہاتھ دھوئے۔ آصف
صاحب نے اسے دیکھا اور بولے "عارف چلو گے اب ؟"

"جی ہاں۔ آپ چل رہے ہیں"

"ہاں"

راغب صاحب آصف صاحب کو پہونچانے گلی کے ختم تک آئے۔ عارف ان دونوں کے پیچھے پیچھے تھا۔ راغب صاحب کہہ رہے تھے "بھئی عارف کی شادی کا بھی اب ٹھیک کردو"

"ہاں مگر یہ تو۔ کرنے کو نہیں کہتا۔ ولایت جانے کو کہتا ہے"

"ولایت بھیجنا ہے تو ضرور پہلے شادی کر دو نہیں وہاں سے کوئی موم کی پتلی لنک آئیگی ساتھ"

"خیر دیکھا جائے گا"

دونوں بھائی موٹر میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں آصف صاحب نے کہا "عارف تمہاری شادی کے لئے سب ہی کہہ رہے ہیں"

"آپ کے نظریہ کے مطابق بھائی جان شادی تو ایک کنوینینس (آرام) ہے۔ مجھے ابھی اس کی ضرورت ہے"

"یہ تم ہی سمجھ سکتے ہو۔ والد اور والدہ حیات ہوتے تو تمہاری شادی کر چکے ہوتے۔ سب یہی کہتے ہیں۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ مجھے یہی کرنا چاہیئے"

"جی نہیں۔ والد والدہ کی بات گئی ان کے ساتھ۔ وہ قانون ختم ہو گیا۔ آپ ہمارے بھائی ہیں وہ بات الگ رہنے دیجئے۔ قانونی پوزیشن ہم دونوں کی یہ ہے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک جوائنٹ اسٹاک کمپنی کھول رکھی ہے جس کی مینجر بھابی ہیں۔ کام سب ٹھیک چل رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری مینجر کو کسی اسٹنٹ کی ضرورت ہے کہ نہیں۔ یعنی بھابی سے دریافت کیا جائے کہ ان کے لئے کوئی معاون ہونا چاہیئے۔ اور وہی چھانٹیں بھی، کیونکہ کام انہیں لینا ہے۔ یہ سب معاملہ بھابی پر چھوڑ دیجئے"

"ان پر چھوڑ دیا۔ تم تو کوئی دخل نہ دو گے"

"بالکل نہیں"

(۳)

عارف اپنی مسہری پر لیٹا ناشتے کے لئے بلائے جانے کا انتظار کر رہا تھا کہ نواب مرزا بہادر اس قطع سے اس کے کمرے میں داخل ہوئے کہ گردن سے لے کر کرمچ کے جوتے تک سارا ڈیل ایک بہت ہی ڈھیلے پرانے فوجی کوٹ میں ڈھکا ہوا تھا اور کچرہا اونی کنٹوپ کانوں اور ٹھڈی پر کھنچا ہوا تھا۔

"آداب عرض نواب آیئے خیر تو ہے؟"

"جیتے رہیے۔ ایک بڑا ضروری کام ہے"

"ضروری کام۔ خیر بیٹھیے تو۔ اطمینان سے کہیے"

وہ آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں گھر کے اندر سے لاڈو آئی اور بولی "چلئے عارف میاں ناشتے پر"

عارف نے دیکھا کہ نواب مرزا منہ کھولے ہوئے اور گول گول دیدے پھاڑے ہوئے لاڈو کو دیکھنے لگے۔ لاڈو سے اس نے کہا "یہیں ناشتہ لے آؤ۔ کہو ایک صاحب آ گئے ہیں"

لاڈو چلی گئی تو عارف نے نواب مرزا کو دیکھتے ہوئے کہا "کیا نواب اس سے عشق ہونے والا ہے"

"نہیں میاں۔ اب عشق وشق مجھے نہیں ہوتا"

"اور وہ عشق آپ کا ختم ہو گیا"

"ہاں وہ مہینہ دو مہینہ کے لئے ہوا تھا۔ اور یہی چاہیے۔ اور اس سے زیادہ دن چلے تو آدمی پاگل نہ ہو جائے عشق چیز ہی ایسی ہے"

"اب تو اس کا خیال نہیں آتا"

"اے صاحب۔ آپ تو بالکل چالڑ ہیں یعنی بچہ ہیں۔ آپ کیا جانیں عشق میں آدمی

اندھا ہو جاتا ہے گا مگر جب آنکھیں کھلتی ہیں تب شب شاف شاف معلوم ہوتا ہے عیش میں کچھ نہ دکھائی دیا۔ اس شالی کے چھ چھ بچے ہیں اور پنڈے سے بو آتی ہے بعد میں معلوم ہوا۔ واللہ گھن آگئی اس سے اب میں اس شالے چادوالے کے یہاں بھی نہیں جاتا۔ اس کے کچھ پیسے باقی ہیں۔ ادھر کا رستہ بھی نہیں نکلتا۔"

لاڈو ناشتہ لے کر آئی اور چھوٹی میز پر رکھکر چلی گئی۔ نواب مرزا ناشتہ کرنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ جو ضروری بات کرنے آئے تھے اسے بالکل بھول گئے۔

"کیا ضروری بات تھی؟" عارف نے یاد دلایا۔

"جی ہاں لیجئے میں تو بھولا ہی جاتا تھا" اور چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے ہوئے وہ کھڑے ہوئے اور عارف کے پاس آکر اس کے کان میں کہنے لگے "وہ جو شالہ پھر آج آکر کہیگا کہ اپنی موٹر دے دیجئے وہیں آنور کے یہاں جائیں گی اس کی بیوی اور قیشر"

"تو اس میں کیا ہوا۔ آپ لے جائے گا موٹر مگر پانچ بجے سے پہلے لے آیئے گا ہمیں آج پارٹی میں جانا ہے۔"

"اوہ ہوں" کہہ کر نواب مرزا ہٹے اور کرسی پر آکر بیٹھ گئے اور پیالی کو کشتی میں رکھ کر بولے "آپ بھی بات نہیں سمجھتے۔ روز روز آپ کی موٹر جائے گی۔ ڈو ڈو میل تو کچی ہے خراب ہو جائے گی اور پھر مجھے وہاں جاتے الجھن ہوتی ہے میں نہیں لے جاؤں گا۔"

"اچھا آپ نہیں لے جانا چاہتے"

"مگر پالیسی تو سمجھئے۔ ان لوگوں سے میں نے کہہ دیا کہ آپ روز روز موٹر نہیں دینگے خراب ہو جائے گی۔"

"روز روز کیسے شاید دو دفعہ اور مانگی تھی۔"

"یہ تیسرا پھیرا ہے۔ ہونہہ۔ آپ کہئے مجھے جانا ہے۔ ایکہ کریں نا۔ آٹھ اور ڈو دش میل کا تو واسطہ ہے گا۔"

"خیر میں ایسی ترکیب کروں گا کہ آپ کو نہ جانا پڑے"

"پھر کون جائے گا"

"اب کوئی جائے"

"اور موٹر جو خراب ہوگی۔ واللہ دھوتے وقت اتنی اتنی مٹی نکلتی ہے گی"

"اچھا تو میں ٹال دوں گا"

"بش۔ بش بھی۔ میں جاتا ہوں ورشاپ اور ٹائم ہو رہا ہے آجکل۔ بش آپ۔ نہیں شے ٹال دیجئے مجھ تک نہ آدیں"

نواب مرزا چلے گئے اور عارف مسہری پر لیٹ گیا۔ انور کی تصویر اس کے سامنے آگئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ انور کے یہاں جانے کے لئے وہ اپنی موٹر نہ دے، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ انور اپنی سسرال میں بڑی تکلیف کی زندگی گزار رہی تھی، کیونکہ اس کا میاں اسے بالکل نہ چاہتا تھا۔ وہ دیہاتی رنڈیوں میں وقت گزارنے کا عادی تھا اسے انور ایسی چیز کی کیا قدر تھی۔ گدھے کے منہ کو خشکہ۔ لالچ میں ماں باپ نے اسے کہاں جھونک دیا۔ قمر تو اس کے پیر دھو دھو کر پیتا۔ مگر وہ محبت کی کوئی قدر نہیں۔ قمر بھی عجیب ڈھیلا ڈھالا آدمی ہے۔ کاش قمر بیچ میں نہ ہوتا تو وہ خود اس کے ساتھ شادی کر لیتا۔ وہی ایک لڑکی تھی جس نے دوسری دفعہ اس کے دل کو لبھایا۔ عابدہ کو تو وہ دیکھ ہی نہ پایا۔ اس کے جسم کا احساس ضرور ہوا تھا۔ مگر وہ احساس تو جاتا بھی رہا۔ وہ ایسے احساسات سے بالاتر تھا۔

اس انداز میں وہ سوچتا رہا اور بڑھتا رہا، قریب ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ جبو نواب آئے۔

"ہاں ہاں مجھے معلوم ہے" عارف نے کچھ باتوں کے بعد کہا "تمہیں میری موٹر کی ضرورت ہے۔ انور کے یہاں جانے کو"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"شہید مردوں سے کچھ چھپا رہتا ہے۔ خیر چلو آج ہم خود موٹر لے چلیں گے"

"تم خود؟ تمہیں تکلیف ہو گی۔ دولہا بھائی تو ہیں"

"نہیں۔ دولہا بھائی کو میں موٹر نہ دوں گا۔ میں خود لے چلوں گا۔ تمہارا کوئی حرج ہو تو نہ جاؤں"

"مجھے تمہاری تکلیف کا خیال ہے۔ وہاں تم پریشان ہو گے"

"اگر یہی خیال ہے تو کچھ نہیں"

"تم کالج نہیں چلو گے۔ ہاں تمہارا تو آج دن خالی ہے۔ میرا ابھی ایک گھنٹہ ہے۔ بس حاضری دے کے آجاؤں گا۔ مگر ہاں تم نے تو کھانا نہ کھایا ہو گا"

"تم آؤ ہو کے کالج میں کھانا وانا کھا کے تیار رہوا جاتا ہوں"

جبو نواب چلے گئے اور عارف گھر کے اندر آیا اور اپنی بھابی سے بولا "بھابی کوئی ترکیب ہو سکتی ہے کہ ہمیں ابھی ابھی کھانا مل جائے"

"ابھی؟ کیوں؟"

"ہمیں ذرا جانا ہے"

"کہاں؟"

"ہیرا پھیری میں۔ چوری چوری سے گیا تو گیا ہیرا پھیری سے بھی گیا"

"یہ ہیرا پھیری کیسی؟"

"تمہاری موٹی عقل نہیں سمجھتیں تو لو صاف صاف سنو۔ ہمیں ایک لڑکی سے عشق ہے وہ ایک گاؤں میں یہاں سے قریب نو یا دس میل پر رہتی ہے۔ اس کی چوکھٹ پر سجدہ کر کے لوٹ آئیں گے"

"یہ سب کیا حماقت کی باتیں ہیں۔ تم کب آدمی بنو گے"

"ہم اس دن الکدم سے آدمی بن جائیں گے جب تم عورت نہیں رہ جاؤ گی۔ مگر آدمیت وادمیت الگ چھوڑو۔ اس کا اس وقت کوئی کام نہیں۔ سوال کھانے کا ہے۔ روٹی کا۔ بس

ایک گھنٹہ کے بعد ہم روانہ ہو جائیں گے اب چاہے روٹی ملے یا نہ ملے۔ تم کہو تو بھوکے ہی چلے جائیں"

"تو آخر جانے ہی کی کیا ضرورت ہے کہیں"

"تم کیا جانو بھابی تم عورت ہو۔ عورت عشق نہیں کر سکتی۔ بالکل نہیں۔ ہاں عشق دے سکتی ہے۔ اور ہر چیز کی طرح وہ عشق بھی بڑی ہی مشکل سے دیتی ہے۔ سنو ہمارے ایک دوست ہیں۔ بھائی جان کے ساتھ پڑھتے تھے ایک زمانے میں۔ اب ہمارے ساتھ ہیں۔ وہ سمجھو کہ بس عشق ہی کرنے اور عشق کرتے رہنے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ وہ اس وقت بھی ایک لڑکی سے عشق کرتے ہیں"

"اتنے بڑے ہو گئے تمہارے بھائی کے برابر"

"بڑے کی ایک ہی کہی آپ نے واللہ۔ وہ کبھی بڑے ہی نہیں ہو سکتے کوئی تم ہو یا تمہارے میاں کہ پیدا ہوتے ہی بڑے ہو گئے۔ خیر تو بات کاٹ دیتی ہو ہماری یہ تمہاری بری عادت ہے۔ تو ہمارے وہ دوست جب لڑکی سے عشق کرتے ہیں وہ ان کی طرف رخ بھی نہیں کرتی اور ان کا فرض ہے کہ اس کے گھر کا دن میں دو چار دفعہ طواف ضرور کر لیتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے سمجھیں عشق"

"کیا حماقت!"

"عشق اور حماقت ایک ہی چیز ہیں۔ اور ہم بھی ویسی ہی حماقت کرنے جا رہے ہیں آج۔ ان کی حماقت کوئی ایک میل ہی لمبی ہوتی ہے۔ ہماری دس میل لمبی ہے"

"نہیں جانے کو واہی تباہی۔ کھانا اتنا جلدی نہیں مل سکتا"

اتنے میں لاڈو کسی کام سے برآمدے میں آئی تو عارف نے اس سے کہا "لاڈو۔ ابھی کھانا مل سکتا ہے"

"کیوں۔ آپ کو جلدی ہو تو میں ٹکیاں ڈال دوں"

"ارے واہ - دیکھئے بھابھی آپ سے زیادہ تو ہیں یہ چاہتی ہے - کاش یہی ہماری بھابھی ہوتی - اچھا لاڈو تم جلدی سے آؤ اور ٹکیاں پکا دو۔"

"کوئی ضرورت نہیں" بھابی نے کہا۔

"تم ان کی ایک نہ سنو لاڈو - یہ کچھ نہیں ہیں - ہم آج ہی سے وظیفہ پڑھنا شروع کرینگے کہ بھائی جان تم پر عاشق ہو جائیں پھر یہ بھابھی دھری رہ جائیں گی اور تم ہماری بھابھی ہو جاؤ گی پھر مزے ہیں"

"یہ کیا بک رہا ہے؟"

"کچھ نہیں - بس یہی ہو جائے جلدی جلدی"

چنانچہ جب جتّو نواب واپس آئے تو عارف کھانا وانا کھا کر کوٹ پینٹ پر اوورکوٹ پہن کر تیار بیٹھا تھا - دونوں جتّو کے گھر والی گلی کے نکڑ پر پہونچے - جتّو کی بیوی اور قیصر کو آتے آتے قریب آدھ گھنٹہ لگا - عارف موٹر میں بیٹھا ایک کتاب پڑھتا رہا - آخر کو جتّو کے پیچھے پیچھے دو برقعہ والیاں آتی دکھائی دیں، ایک کچھ ضرورت سے زیادہ لمبی اور دوسری اتنی ہی زیادہ ٹھنگنی اور گول - عارف کو معلوم تھا کہ ان دونوں میں دوسری جتّو کی بیوی ہیں - اور جب وہ دونوں آکر موٹر میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئیں تو عارف نے کہا "تسلیم بھابھی"

"جیتے رہیے" جواب ملا۔

جتّو اپنی لڑکی کو کندھے سے لگائے ہوئے عارف کے پاس بیٹھے اور موٹر چلی - موٹر جب شہر کے باہر پہونچ گئی تو عارف کے کان میں جتّو کی بیوی کی آواز آئی "اے آپ کی شادی نہیں ہوتی ہے گی - آپ کے ان بھائی کی تو ہو بھی گئی"

"خوب بھابھی صاحب - یہ آپ نے خوب کہی - اگر منیر کی شادی ہو گئی تو کیا اب دنیا میں کسی کو کنوارہ رہنے کا حق ہی نہ رہا"

"یہ اپنی شادی ہی نہیں کرنے کو کہتے" جتّو نے کہا۔

"ہوں۔ سب ایسے ہی کہا کرتے ہیں گے" اور ان پر ہنسی کا دورا پڑتے پڑتے رہ گیا۔
"اچھا آپ ہماری شادی ٹھہرا دیجئے آپ کی بات ہم رد نہیں کر سکتے آپ ہیرودن ہیں۔"
"یہ کیا بلا ہوتی ہے گی"
"یہ سمجھئے کہ یہ آپ کے میاں ہمارے بادشاہ ہیں تو آپ ان کی بیوی ہماری ملکہ ہوئیں
بس آپ جہاں حکم دیں وہاں ہم شادی کر لیں"۔
"یہ تو کہیے کہ آپ کے بھائی اپنی سالی کے ساتھ کرنے کو کہتے ہیں گے"
"ہمارے بھائی کو کہنے دیجئے۔ ان کا کیا۔ آپ اپنی طرف سے کچھ کہئے"
"ہماری بھی رائے ہے کہ وہیں ہو جاتے"
"تو وہیں ہو گی بس"
پھر سب خاموش رہے۔ عارف نے موٹر چالیس میل کی رفتار پر چلانا شروع کی۔ آگے
چل کر ایک چھکڑا آ رہا تھا۔ کافی ہارن دینے پر بھی چھکڑے والا نہ ہٹا تو عارف نے سڑک
سے بچا کر موٹر نکالی۔ ایک جھٹکا لگا۔ قیصر نے کہا "یا جناب امیر آئیے"۔ جتو کی بیوی نے کہا
"یا مولا بچائیے" اور جتو کی گود میں لڑکی جاگ اٹھی اور رونے لگی۔ جتو نے لڑکی کو پیچھے پھر کر
بیوی کو دیدیا۔
کچھ ہی دیر کے بعد موٹر کچی سڑک پر آئی اور دھول اڑنے لگی۔ قیصر اور جتو کی بیوی
دونوں "اے ہے، اے ہے" کرنے لگیں۔ آخر کو سب انور کے گھر پہونچ گئے۔
یہ گھر پختہ، ایک منزلہ، نہایت کشادہ کچے مکانوں کی بستی کے درمیان بنا ہوا تھا۔
اس میں سامنے کے رُخ ایک چھ زینوں کی چوکی پر اونچا اور بڑا سا پھاٹک لگا ہوا تھا۔ عارف
نے موٹر اس پھاٹک کے پاس روکی۔ ایک بڈھا دیہاتی لمبی سی سفید داڑھی والا مرزئی پہنے
دھوتی باندھے پھاٹک کے اندر سے نکلا اور جتو کو جھک کر سلام کیا۔ جتو کی بیوی اور قیصر
اتر کر پھاٹک کے اندر گئیں اور پھر بائیں رُخ مڑ کر مکان کے اندر چلی گئیں۔

بڈھا جتو سے بولا "آپ بھی جائیے اندر کوئی اور نہیں ہے۔"
جتو نے اپنی گردن کچھ ترچھی کر کے عارف کو دیکھا ہی تھا کہ عارف نے کہا "ہاں ہاں تم جاؤ میں اپنی کتاب پڑھوں گا۔"
جتو بھی لڑکھڑاتے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔ بڈھا عارف کے پاس آیا اور بولا "کیوں آپ نہ جائیں گے اندر"

"بھائی ہماری ایسی قسمت کہاں ہے۔" عارف نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔
"اس ماں کسمت کی کیا بات ہے" بڈھے نے کہا اور اپنا منہ کھول کر عارف کو دیکھتا رہا اور پھر بولا "اچھا آپ ہمری بہورانی کے عجیز نہیں ہو۔ اچھا تو ہم بیٹھک کھولے دیت ہیں آپ آؤ۔"

عارف بڈھے کے ساتھ ساتھ عمارت کے داہنے رخ پر گیا۔ یہاں بڈھے نے دروازے کھولے اور عارف کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ یہ کمرہ بہت لمبا چوڑا تھا۔ اس میں ایک طرف بڑا تختوں کا چوکا لگا تھا جس کے اوپر دیوار سے لگی ایک مسہری بچھی تھی۔ باقی کمرے میں گدّے دار سوفے۔ کرسیاں اور بید کی بنی ہوئی کرسیاں دیوار کے پاس پاس قطار سے چاروں طرف لگی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر تین تین قطاریں تصویروں کی تھیں۔ یہ تصویریں تمام تر رنگیلی قسم کی عورتوں کی تھیں۔ عارف ایک گدّے دار کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کمرہ دیہاتی مذاق کی اچھی مثال ہے کہ بڈھے نے پوچھا "میاں حقہ بھر لاؤں۔"

"میں حقہ نہیں پیتا۔ مگر یہ تو بتاؤ بڑے میاں کہ تمہارے مالک کہاں ہیں۔"
"مالک؟ اچھا ہمارے بھیا کو پوچھت ہو آپ۔ وہ کیا کریں ہیاں، کوئی دلچسپی ہیاں ہے بھلا۔ جوان آدمی ہیں بھلا"
"تو وہ کہاں رہتے ہیں"

"یہاں سے کوئی چار کوس جمین ایک گاؤں ہے جس میں تین بہنیں رنڈیاں ہیں۔ ایک جراب کچھ ڈھل چلی ہے۔ ایک پوری عروج پر ہے۔ اور ایک ابھی چھمیا ہے۔ ان ہی تینوں سے ان کا دل بہلتا ہے۔ جوان رئیس کا اور سیوہ کیا ہوت ہے"

"اور ان کی بیوی جو ہیں یہاں"

بڈھا ہنسا اور اس کی لمبی سفید داڑھی عجب طرح سے ہلی اور اس نے کہا "گھر کی مرگی دال برابر۔ اور کون آوت ہے۔ ان کے باپ رہین وہ ہو یہی کرتے رہین"

"اچھا تو یہ خاندانی قاعدہ ہے۔ تو شادی پھر کیوں کی"

"شادی۔ شادی تو ہوتی ہی۔ اس سے اس سے کیا مطلب نسل کیسے چلے گی اور پھر کھاندان میں آنا جانا بیاہ برات رسم اس کے لئے بیوی ہی جائے گی"

عارف نے بڈھے کو غور سے دیکھا اور اپنے دل میں کہا "اچھا تو یہ فنکشن ہے بیوی کا اس سوسائٹی میں"

بڈھا چلا گیا اور عارف اپنی کتاب پڑھتا رہا۔

گھر کے اندر ایک کشادہ سات محراب والے برآمدے کے بیچوں بیچ میں تختوں کا چوکا لگا ہوا تھا اور اس کے پاس ایک مسہری لگی ہوئی تھی۔ اس مسہری پر انور بیٹھی تھی۔ اس کے چہرہ پر نام کو بھی شگفتگی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے رنگ پر سیاہی دوڑ گئی تھی اور اس کی آنکھوں کے چاروں طرف گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ اسی مسہری پر سرہانے کی طرف جتو کی بیوی اور قیصر بیٹھی تھیں اور جتو تخت پر اپنی گردن بالکل ڈالے ہوئے بیٹھے تھے۔ سب خاموش تھے جیسے کہ کوئی افسوس ناک خبر سن کر سکوت میں آگئے ہوں۔

جتو نے اپنی گردن کو کوئی ساٹھ درجہ تک اٹھاتے ہوئے کہا "اچھا۔ میں باہر عارف کے پاس جاتا ہوں۔ کہے گا کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر غائب ہو گئے" اور وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔

"اب جناب امیر ہی مدد کریں۔ ہمارا تو کوئی بس نہیں"

انور نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "اے یہاں پان بھی تو نہیں ملتے جوان صاحب کو پان ہی بھیج دیتی۔

"تو بہن میں تو کہتی ہوں کہ کوئی دعا تعویز کی جائے جو اس کا دل تمہاری طرف پھرے اور وہ موئی ڈائن مر چکے تمہاری ساس"

"ہاں بھائی آپ ادھر جا کے ان لوگوں سے تو مل آئیے نہیں تو اور بھی وہ طعنے پڑیں گے ہم پر کہ شاید ناطقہ بھی بند ہو جائے"

"اے ہٹو" قیصر نے کہا "ان حرامزادیوں کے منہ میں جھلسانہ لگا آؤں۔ایسی بے تکیاں ہیں۔چھوٹتے ہی تک بے تک نکھلو والوں پر طعنے مارنے لگ جاتی ہیں۔ نفرت ہے مجھے ان کی صورت سے...... اچھا بھائی چلئے ہو آئیں۔ان کے چنگل میں ہماری بہن ہے۔اب خدا ہی سمجھے گا ان کو"

قیصر اور جبو کی بیوی اٹھیں۔انور نے آواز دی "او گھستو۔جا ان لوگوں کے ساتھ بی بی کے یہاں"

ایک لہنگا پھریا پہنے، میلی کچیلی عورت کندھے سے بچہ لگائے آئی اور اس کے ساتھ دونوں پاس والی حویلی میں چلی گئیں۔انور اپنی مسہری پر لیٹ گئی۔اس کا پیٹ کافی ابھرا ہوا تھا اور اس کا چہرہ نہایت فکر مند۔اس وقت جبو نواب واپس آتے دکھائی دئے۔انور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور سر پر دوپٹہ سنبھالتے ہوئے بولی "واپس کیوں آگئے اپنے دوست کے پاس سے بھائی صاحب"

"ارے وہ بے قرار روح تو ہے۔تمہارے یہاں کے بڑے میاں جو ہیں ان کے ساتھ گاؤں دیکھنے چلا گیا"

"آئیے بیٹھئے۔یہ آدمی بڑے نیک معلوم ہوتے ہیں۔جب آپ لوگوں نے مانگا موڑ دیدیا اور ابکی پہنچو نہ آسکا تو خود دے کے آئے۔ہائے یہاں ان کی کیا خاطر کی جائے" اور اس نے ایک

ٹھنڈی سانس بھری۔

"کیا کیا جائے تم منع کر دیتی ہو کہ بھائی ابا سے تمہاری تکلیفوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ ان سے ہم سب یہی کہہ دیتے ہیں کہ تم بہت خوش ہو۔ اور بیچاری اماں کو جو تم اناج وناج بھجوا دیتی ہو، اس سے وہ پھولے نہیں سماتیں۔ تمہیں بلایا جائے تو یہ لوگ جانے نہیں دیتے اور میرے پاس کبھی کوئی پیسہ نہیں ہوتا جو کسی سے جا کے کچھ عمل وَمل کراؤں۔"

"جانے دیجئے بھائی صاحب۔ کسی کو میری پروا ہو یا نہ ہو۔ کھانے کو تو مجھے ملتا ہی ہے اور اناج پانی کی افراط ہے۔ یہی میری قسمت میں لکھا تھا۔ اگر دن پھریں گے تو پھریں گے، نہیں جو مرضی خدا کی۔"

اتنے میں جتّو کی بیوی اور قیصر بھی واپس آگئیں۔

جتّو کی بیوی بولیں "یہ گنوار ہوئے گوں کے یار ہوتے ہیں۔ کہیں کیا ہیں سُنا۔ کہ یہ نکھلوؤں کا قاعدہ ہوئیے ہے کہ جب دیکھو لڑکی کی سسرال ماں دھرے ہیں"

"میں نے تو کہہ دیا" قیصر بولی "خوب نہ ہماری بہن کو میکے آنے دیا جائے گا اور نہ ہم ہی دیکھنے آئیں"

"یہ تو لڑنے لگیں۔ میں نے روکا کہ ہم تو چلے جائیں گے مصیبت ہو گی نگوڑی انوری پر"

"جانے دیجئے باجی۔ ان لوگوں کی عقلیں ہی اوندھی ہیں میری قسمت کی طرح"

"نہیں اب تک میں طرح دے رہی تھی اکی میں جاؤں گی اپنی سسرال والوں کے یہاں اور ان سے کہہ کے کسی رمّال سے وہ چراغ بلٹواؤں گی کہ سب تختہ ہی اُلٹ جائے"

"چپ رہیئے باجی یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں"

پھر سب سکوت میں رہے۔ پھر مختلف قسم کے باتیں ہوتی رہیں۔ آخر کو چلنے کا وقت آگیا۔

واپسی میں جب موٹر پکی سڑک پر چلی آرہی تھی تو عارف کے کان میں جتّو کی بیوی کی بات سنا دی "ہا۔ بڑا افسوس ہوتا ہے۔ ایسی اچھی لڑکی۔ ہا"

کس پر افسوس ہو رہا ہے۔ بھابی صاحب۔ ہم بھی سن سکتے ہیں"

"اے اور کس پر اسی بچاری انور پر ایسی بُری پھنسی ہے کہ خدا ہی ہے"

"میری تو رائے تھی کہ قمر نواب سے ہوتی شادی۔ وہ تو بے دھودھو کے پیتا"

"اے رہنے بھی دیجئے وہ کیا اچھا تھا۔ وہاں اور بھی مصیبت ہوتی"

"دل کو تو چین ہوتا"

"کیا چین ہوتا۔ اسے نہیں اچھا لگتا تھا قمر"

"آئیں۔ یہ کیا۔ کیا اس کی بھی رائے تھی اس معاملے میں۔ کیا عورتوں کی بھی رائے ہوتی ہے"

"کیوں نہیں۔ کیا ہم لوگوں کے دل نہیں ہوتا ہے گا"

"تو انور کی بھی پسند تھی۔ وہ کیا پسند کرتی تھی"

"قمر کو برے بھانت بھی نہیں پسند کرتی تھی"

"پھر کیا اُسے پسند تھا"

"اے ایسا ہی کوئی آپ کا ایسا ہوتا"

"میرا ایسا؟ اور میں ہی اگر ہوتا"

"آپ میں تو مذہب کا بل ہے"

"اگر میں آپ کے مذہب پر آ جاتا"

"تو کیا عذر ہوتا!"

"ارے یہ سب مجھے اب معلوم ہوا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا"

"جب چڑیاں چگ گئیں کھیت تو اب کیا ہوتا ہے"

"کچھ نہیں" کہہ کر اس نے موٹر کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ اس کے دل کی اس وقت عجیب حالت تھی۔ ممکن ہے کہ جیسے ایک دفعہ دیکھ کر اس کو انور پسند آگئی تھی ویسے انور کو بھی وہ پسند

آگیا ہو۔ مگر قمر کے لئے وہ اپنی محبت کا خون کرنے کے لئے تیار تھا اس نے سوچا کہ انور کو اب بھی اس جال سے نکالا جا سکتا۔ اس معاملے پر قمر سے بات چیت کرنا ضروری ٹھہرا۔

چنانچہ جبّو کے گھر والی گلی پر پہونچ کر وہ بھی موٹر سے اتر پڑا اور جبّو سے بولا "موٹر یہیں چھوڑے دیتا ہوں۔ تم نگاہ رکھنا۔ میں ذرا قمر سے ملنے جاتا ہوں"

قمر کے دروازے پر پہونچ کر اس نے آواز دی۔ اندر سے بڑھیا کی آواز آئی "کون ہے وہ سو رہے ہیں"

"جگا دو۔ کہو عارف آئے ہیں۔ بڑا ضروری کام ہے"

تھوڑی دیر انتظار کے بعد آواز آئی "آئیے۔ چلے آئیے"۔

عارف گھر کے اندر داخل ہوا۔ نہایت چھوٹی سی انگنائی کو پار کر کے ایک برآمدے میں گیا جہاں پلنگ پر لحاف اوڑھے ہوئے قمر نواب لیٹے تھے۔ عارف ان کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا اور گھڑی دیکھ کر بولا "اس وقت ساڑھے تین بجے ہیں۔ چار بجے بھائی جان کے ساتھ جانا ہے۔ تم سے ایک بہت ہی اہم معاملہ پر بات کرنا ہے۔ تکلف برطرف"

"آخر آ کہاں سے رہے ہو اور بات کیا ہے۔ مجھے کسی بات سے دنیا کی کیا غرض"

"ہاں تمہارا حال سب معلوم ہے۔ مگر بات تم ہی سے کرنے کی ہے۔ سنو۔ میں ابھی انور کے یہاں سے آ رہا ہوں"

"کیسے ؟"

"بولو نہیں بات سن لو۔ جبّو وغیرہ کو میں اپنے موٹر پر لے کر وہاں گیا۔ انور بڑی تکلیف میں ہے۔ میں نے اُسے اس تکلیف سے نکالنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تم تیار ہو کہ نہیں صاف بتاؤ"

"تیار۔ کاہے کے لئے۔ کیا مطلب تمہارا ؟"

"میں اسے اس جانور دیہاتی سے چھڑا لوں گا۔ تم تیار ہو اسے اپنے ساتھ لینے کے لئے"

"تم کیا باتیں کرتے ہو۔ وہ پیٹ سے ہے۔ ایک ہی آدھ مہینہ میں بچہ ہونے والا ہے

اور پھپھولیوں بھرا کباب ہو جائیگی۔ اب وہ ہو چکی دوسرے کی مجھ سے کیا مطلب"

عارف نے دیکھا کہ قمر کے چہرہ پر زردی چھائی۔ وہ کہنی ٹیک کر اٹھا اور اپنے تکیہ کے نیچے سے ایک پڑیا نکال کر افیم کی ایک گولی منہ میں رکھ لی۔ عارف نے کہا "اچھا تو اب اس نوبت کو پہونچے ہو۔ اس افیم سے غم غلط کرتے ہو۔ خیر تمہیں اس سے اب کوئی سروکار نہیں ہے؟"

"اور ہو بھی تو کیا۔ مانا۔ اس سے چھڑا کے میں اسے کر لوں تو بھی کیا۔ وہ مجھے نہیں چاہتی تھی۔ وہ تمہیں چاہتی تھی"

"مجھے؟"

"ہاں تمہیں۔ قیصر نے اور جگو کی بیوی نے مجھے بتایا"

"اور تم نے مجھ سے نہیں کہا"

"ہاں جان بوجھ کے نہیں کہا۔ صاف صاف سنو مجھے تم پر بہت رشک ہوا۔ رقابت کی آگ"

"اچھا اب تو وہ تمہارے لئے کوئی معنے نہیں رکھتی"

"بالکل نہیں۔ بالکل نہیں" اور قمر نے ایک اور گولی نکال کر منہ میں رکھی اور کہا "بھئی تم کیوں مجھے ستاتے ہو۔ جاؤ چلے جاؤ"

عارف نے قمر کے سوکھے ہوئے چہرے اور نکلی ہوئی آنکھوں کو نہایت ترس کے ساتھ دیکھا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور گھر سے باہر چلا آیا اپنے موٹر کے پاس پہونچا۔ جگو اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا شکریہ ادا کر کے اس نے موٹر اسٹارٹ کی۔ وہ موٹر کو کچھ ضرورت سے زیادہ تیزی کے ساتھ لئے جا رہا تھا ہزاروں قسم کے جذبات کا اس کے دل میں غلبہ تھا۔ اس غلبہ میں دو باتیں اسے کچھ صاف نظر آرہی تھیں ایک یہ کہ اس کے دل میں شکن کی جگہ انور آگئی تھی دوسرے یہ کہ اسے انور کو اس کی موجودہ زندگی سے نکال کر اپنی

بیوی بناتا تھا۔

(۴)

عارف کی زندگی میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ فکر میں ڈوبا ہوا کھویا کھویا سا
رہنے لگا تھا۔ پڑھنے میں اس کی دلچسپی کسی طرح کم نہیں ہوئی تھی مگر گھر کے اندر وہ بلائے
جانے پر ہی جاتا اور اپنی بھابی سے جو چھیڑ چھاڑ کیا کرتا تھا وہ بالکل ختم ہو گئی تھیں۔ ایک دن
اس کی بھابی نے پوچھا بھی کہ "یہ تجھے کیا ہو گیا ہے" تو اس نے جواب دیا کہ "تم مجھے آدمی بننے
کے لئے کہا کرتی تھیں تو میں اب بالکل آدمی بن گیا" اور نہایت درجے سنجیدہ چہرہ بنائے ہوئے
باہر چلا آیا۔ کالج میں بھی ملنا جلنا بات چیت بالکل ترک کر دی تھی اور تیسرے پہر کو روز پیدل
گومتی کے کنارے جاتا اور ایک جگہ پر بیٹھ کر سوچتا رہتا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں
دریا کے پھاٹ کی جگمگاتی ہوئی سطح کو دیکھتا رہتا۔ سورج غروب ہوتے وقت سطح پر ایک
ہلکا گلابی رنگ چھا جاتا اور ساکت لہروں پر اُسے انور کا شگفتہ چہرہ دکھائی دیتا۔

وہ سوچتا کہ افسوس وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ایک نئے قسم کی محبت ہو گئی تھی
ایسی محبت جسے اس نے پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ انور کی طرف اس کے دل کا لگاؤ تو
اسی دن سے تھا جب اس نے اس کو دیکھا تھا مگر اب اس لگاؤ میں ترس کا شدید جذبہ
شامل ہو گیا تھا جس نے شدید محبت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ مگر لیلی مقصود سے وصل کی
اسے کوئی صورت نہ نظر آتی تھی۔ ایک دفعہ جذبات کی رو میں اس نے سوچا کہ وہ انور کو
ایک خط لکھے اور اس خط کو لے کر انور کے گھر جائے مگر اسے معلوم تھا کہ انور کو لکھنا نہیں
سکھایا گیا تھا اور اس لئے وہ خط کا جواب کیسے دے گی۔ ایک دفعہ اس نے یہ سوچا کہ کسی طرح
انور کو اس دیہاتی کے گھر سے نکال لائے مگر اسے معلوم تھا کہ وہ پیٹ سے ہے اور جب
تک بچہ نہ ہو جائے اس کو کہیں لے جانا مشکل ہے۔ روز وہ قسم قسم کے منصوبے باندھتا مگر

کوئی راہ ایسی نہ نکلی جس سے اس کے دل کو تسکین ہوتی۔ انور کے یہاں بچہ ہونے میں ایک ہی آدھ مہینہ کی کسر تھی اور وہ خیال کرتا تھا کہ بچہ ہو جانے کے بعد ہی وہ شاید کچھ کر سکے۔

اس کے دل میں جذبات کا زور کسی طرح کم نہیں ہوتا تھا۔ انور کا تصور ہر وقت اس کی آنکھوں میں پھرتا رہتا اور وہ ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہتا۔ جب دل میں ہوکیں اٹھتیں تو اس کا جی چاہتا کہ وہ تمام دنیا کو برباد کر ڈالے اور انور کو اٹھا کر اپنے گھر لے آئے مگر کچھ ہی دیر کے بعد اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوتا اور وہ چاہتا کہ اپنے تئیں فنا کر دے۔ دل ہی دل میں وہ غالب کا شعر پڑھتا ؎

خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے مرے دامِ تمنا میں ہے اِک صیدِ زبوں وہ بھی

پھر حافظ کا شعر یاد آتا ؎

در دلم بود کہ بے دوست نہ باشم ہرگز چہ تواں کرد کہ سعی من و دل باطل بود

اسے اس عالم میں کوئی ایک مہینہ گذرا تھا کہ ایک رات اس کی بھابی نے اپنے میاں سے کہا "تم دیکھ رہے ہو کہ عارف کو کیا ہوتا جا رہا ہے بالکل بدل گیا۔ ہر وقت سوچتا رہتا ہے اور کوئی بات نہیں کرتا"

"ہاں مجھ سے کئی دفعہ قانونی رائیں لے چکا ہے۔ ہمیشہ کہتا ہے کہ فرض کیجئے ایک عورت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی عورت کے فراق میں پڑ گیا ہے"

"اب تو کہیں آنا جانا بھی نہیں۔ بس کمرے ہی میں پڑا رہتا ہے۔ شام کو ہاں پیدل نکل جاتا ہے۔ مگر رات ہونے سے پہلے آجاتا ہے۔ پڑھا کرتا ہے کہیں دیوان حافظ تو اس نے پورا نہیں پڑھ ڈالا جو دیوانہ ہو گیا"

"نہیں تم احمق ہو۔ کوئی عورت ہے شادی شدہ۔ اس کا میاں اسے اچھی طرح نہیں رکھتا اور اس کے پیٹ میں بچہ بھی ہے"

"تو تمہیں یقین ہے اس بات کا"

"بالکل"

بھابی تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولیں "تمہاری کیا رائے ہے۔ میں عابدہ کو یہاں بلوالوں۔ اس کا امتحان بھی قریب ہے۔ پارسال تو وہ فیل ہو گئی تھی"

"ہاں عارف کے ساتھ ہی تم اپنے میکے جاؤ اور عابدہ کو لئے ہوئے چلی آؤ"

بھابی پھر کچھ دیر تک خاموش رہیں اور پھر بولیں "اچھا ہوتا جو پارسال ہی جب اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میری شادی کر دو تو میں فوراً کر دیتی۔ میں نے بات ٹالی۔ اس کے بعد سے وہ بھی اکڑ گیا"

"تم سب عورتوں میں یہی تو خرابی ہے کہ چاہے اپنا خود کتنا ہی جی چاہتا ہو مگر مرد کی التجا کو ٹھکرا ضرور دو گی"

بھابی نے خاص انداز سے دیکھتے ہوئے کہا "ہٹو۔ تم مرد لوگ بہت اچھے ہو ہم عورتوں میں سب ہی برائیاں ہیں"

اور اس کے بعد کمرے کی بجلی بجھ گئی۔

صبح کو جب بھابی نے اس سے کہا "چلو آج مجھے میرے میکے لے چلو" تو اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "بہتر ہے"۔ چنانچہ اس دن عابدہ بھی اس کے گھر میں آگئی اور دوسرے دن صبح سے اس نے اس کو پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ ابکی مرتبہ نہایت ہی سنجیدگی سے ساتھ وہ درس دیتا اور کوئی اِدھر اُدھر کی بات نہ کرتا۔

قریب ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز شام کو وہ حسب معمول دریا کے کنارے بیٹھا تھا کہ اسے اپنے پیچھے کسی کے آنے کی چاپ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا کہ جبو نواب گردن ٹیڑھی کمر جھکی لڑکھڑاتے چلے آ رہے ہیں۔ اس نے جبو کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھا۔ جبو آ کر اس کے پاس بیٹھ گئے۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟"

"پتہ چل ہی جاتا ہے"

"کیسے آخر؟"

"میں کئی دفعہ تمہارے کہیاں گیا اس وقت۔ سنا تم ٹہلنے جاتے ہو۔ ایک دن تمہارے بھائی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کہنے لگے تم بہت غمزدہ رہتے ہو اور وہ خود بھی پریشان ہیں اور تمہاری بھابی بھی کہ تم کو ہو کیا گیا ہے اور وہ کہہ رہے تھے کہ تمہاری شادی بس اب کر ہی دیں گے امتحان کے بعد ہی"

"ہاں مجھ پر بھی ہر ہر طریقے سے زور دیا جا رہا ہے کہ میں شادی کرنے پر تیار ہو جاؤں۔ مگر مجھے کچھ اور ہی فکر ہے"

"کیا فکر ہے"

"ہاں۔ تم یہ تو بتاؤ کہ تمہیں میرے یہاں آنے کا حال کیسے معلوم ہوا۔ بتاتے بتاتے بھٹک گئے"

"تمہارے بھائی نے کہا تھا کہ دریا کے کنارے کہیں جاتا ہے میں ادھر نکل آیا۔ دیکھا تم بیٹھے ہو یہاں"

"مگر تم اور وقت بھی مجھ سے مل سکتے تھے۔ یہی وقت رہ گیا تھا جو تم نے ڈھونڈھنے کی زحمت کی"

"اور کوئی وقت میں خالی نہیں ہوں۔ دو بجے سے منیر کو فارسی پڑھانے چلا جاتا ہوں کوئی چار پانچ تک اٹھ کر ٹہلنے چلا آتا ہوں"

"اچھا نرملا کی طرف ٹہلنے جاتے ہو۔ ہمارے گھر بھی جھانک لیتے ہو"

"نہیں اب میں اُدھر نہیں جاتا۔ مجھے اس سے نفرت ہو گئی"

"نفرت۔ آئیں۔ یہ کیا۔ کب سے۔ اچھا اسی لئے تم کئی دن سے ہمارے ڈپارٹمنٹ کی طرف نہیں دکھائی دئے۔ مگر محبت نفرت میں کیسے بدل گئی اتنی جلدی؟"

"تم سے تو کوئی مہینہ بھر سے ملاقات ہی نہیں ہوئی ایسی کہ اطمینان سے بات چیت ہوتی۔ بڑے بڑے واقعے ہو گئے"

عارف سوچنے میں گم ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد چونک کر بولا "اما جانے بھی دو تمہیں محبت تھی تو ہمیں تمہاری محبت سے مطلب تھا اب نفرت ہے تو نفرت سے غرض ہے۔ ہمیں تو تم سے غرض ہے۔ نہ اس سے غرض کہ کیسے محبت ہوئی اور نہ اس سے کہ کیسے نفرت ہوئی"

"مگر سنو تو"

"اگر تم سنانا چاہتے ہو تو سناؤ"

"اس دن جب بوٹنگ کلب کا ریگاٹا تھا تو دریا کے کنارے وہ اور کئی اور لڑکیاں اور کئی لڑکے کھڑے تھے۔ میں ادھر پہونچا ٹہلتا ہوا تو سب اس طرح سے ہنسے کہ مجھے بہت برا لگا اور وہ ساری کا دامن سنبھال کر میری طرف دیکھ دیکھ کر اس طرح ہنستی رہی کہ میرا جی ہی تو جل کر رہ گیا۔ پھر پرائز ڈسٹربیوشن ہوا اور وہ بھی آکر میگیرے کے نیچے بیٹھی۔ پریسیڈنٹ تقریر کر رہا تھا میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اتنا بدرونق لگا اس کے داہنے گال پر ایک گہرا داغ ہے وہ ایسا برا لگا کیا بتاؤں۔ اس کے ہونٹ عجب طرح کے معلوم ہوئے"

"غرض" عارف نے بات کاٹتے ہوئے کہا "تم کو اس سے نفرت ہو گئی۔ چلو اچھا ہوا ہم بھی تمہیں اس سے ملانے کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو گئے"

"سنو تو تم تو پوری بات نہیں سنتے۔ اس رات مجھے بڑا تعجب رہا کہ مجھے اس سے کیوں محبت ہو گئی تھی"

"تو اب دل خالی ہو گیا۔ ہلکا ہو گیا۔ بہت اچھا ہوا۔ اچھا ہے اس محبت کے روگ سے دور ہی رہو"

"مگر یار اب کیا کریں ایک اور معاملہ کھڑا ہو گیا"

"اچھا گلِ دیگر شگفت"

جو نواب مسکرائے اور ان کی مسکراہٹ ان کے رونے سے بس اسی قدر مختلف تھی کہ ان کی آنکھیں خشک تھیں۔

"منیر کے یہاں دیہات سے ایک لڑکی آئی ہے۔ بس کیا بتاؤں لاکھ نرملائیں اس پر سے قربان اور بڑی شوخ ہے اور مجھے چاہتی ہے۔"

"اچھا۔ یہ تو تمہاری محبت کی نجات ہوئی۔"

"ہاں۔ پہلے ہی دن مجھے چٹکی لے کر چلی گئی اور اندر سے منہ چڑھانے لگی۔ اب روز میں جاتا ہوں تو آ کر باہر کے کمرے کا دروازہ کھولتی ہے اور بالکل سامنے بالکل قریب کھڑی رہتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اکدم سے اسے چمٹا لوں مگر کچھ ہمت نہیں پڑتی۔"

"اگر ہمت پڑ جائے تو تم تم نہیں، لکھنوی نہیں، نواب نہیں۔ اگر وہ خود چمٹ جائے تمہارے تو دوسری بات ہے۔"

"ایک دن تو وہ اپنا جسم چھواتی ہوئی نکل گئی۔"

"مگر پھر بھی تمہارے جسم میں دم نہ آیا۔ خیر دیکھا جائے گا کسی دن وہ چمٹ بھی جائیگی اور تم کو گنہگار بھی کر دے گی تمہیں ایسا موزوں شغل مل گیا۔"

"میں تم سے یہ سب کہنے کے لئے بیتاب تھا۔"

"اور میں بھی تم سے ایک بات کہنے کے لئے بیتاب ہوں۔ بہت دفعہ سوچا کہ تمہارے گھر جا کر تم سے کہوں مگر ہمت نہ پڑی۔ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ شاید تم پسند نہ کرو۔ اچھا پہلے ایک بات بتاؤ؟"

"کیا؟"

"تمہاری بہن انور کی جو موجودہ حالت ہے اس کی بابت تمہاری کیا رائے ہے؟"

"وہ کچھ بجھ کر رہ گئی ہے۔ میاں جھانکتے نہیں آ کر۔ ساس ہیں وہ نندیں اپنے شوہروں کو چھوڑے بیٹھی ہیں وہ سب پریشان کیا کرتی ہیں۔ مگر سب ٹھیک ہو جائیگا۔ ہماری بھابھو کہتی ہیں

کہ جوانی میں سب ہی مرد وے ایسے ہوتے ہیں مگر بال بچے ہونے پہ سب ٹھیک ہو جاتے ہیں اب اس کے یہاں ایک ہی آدھ دن میں بچّہ ہونے والا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائیگا"

"تو تم کو کوئی پریشانی نہیں اس کے بابت"

"پریشانی کیا؟! اسے دیکھ کے کچھ ترس آتا ہے۔ مگر پھر خیال ہوتا ہے ایسا تو ہوتا ہی ہے اور سب دن ایک سے نہیں رہتے۔ وہ بڑی صابر ہے"

عارف سکوت میں آگیا اور اس کی نگاہیں دریا کی سطح پر اس طرح جم گئیں جیسے کہ وہ کسی چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"اما یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔ دماغ تو ٹھیک ہے" جتو نے کہا۔

"دماغ ٹھیک نہیں ہے بالکل۔ میں اس گومتی جی۔ گوما میّا کو دیکھ رہا ہوں۔ ہندو لوگ دریاؤں کو پوجتے ہیں۔ ٹھیک پوجتے ہیں۔ ہر دریا اس تہذیب کا پورا سمبل SYMBOL ہوتا ہے جو اس کے کنارے آباد لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ گومتی لکھنؤ کی تہذیب کا پورا اشارہ ہے۔ عجیب و غریب دریا ہے۔ مختصر سا پاٹ۔ نہایت اتھلا اور سب میں عجیب و غریب بات یہ کہ یہ دریا بہتا ہی نہیں"

"بہتا ہی نہیں؟ یہ کیا؟ کیسے"

"دیکھ لو معلوم ہوتا ہے کہ پڑا ہوا ہے یہاں سے وہاں تک سو رہا ہے۔ افیم کی پینک میں، اور یہی حالت لکھنؤ والوں کی ہے۔ کوئی روانی ہی نہیں کوئی تبدیلی برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ ہر بات پر قانع پڑے ہیں۔ صابر۔ مظلوم۔ یہی عیبی صفات ہیں ان کے لئے اور اپنے مذہبی پیشواؤں میں بھی یہی صفات دکھاتے ہیں۔ اور رحم مثالی چیز ہو۔ مکمل ہیرو اس تہذیب کے۔ کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اب ماشے اللہ سے ایم۔ اے کر لو گے مگر کتے کی دم بارہ برس چونگی میں رکھی پھر بھی نکلی تو ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ کوئی نظر پیدا نہ ہوئی"

"یہ تم کیا باتیں کرنے لگے۔ میں یہ سب سننے کو تیار نہیں"

"یہ بھی اسی گومتی کی اسی لکھنؤ کی ایک صفت ہے۔ گہرائی کی طرف ذہن جا ہی نہیں سکتا۔ نفرت ہے گہرے خیالات سے۔ یہاں کی شاعری بھی دیکھو تو بالکل سطحی"

"بھئی میں اب جاتا ہوں"

"جاؤ۔ مجھے تمہاری ہیرو ازم میں بس اسی حد تک عقیدہ رہ گیا ہے جہاں تک کہ ہر ہیرو اپنی قوم یا اپنے وطن کا مکمل نمائندہ ہوتا ہے مگر تمہاری عظمت کا میں قائل نہیں رہا۔ تمہاری قوم کی عورتیں تم مردوں سے بہتر ہیں۔ بڑھی ہو کر تمہاری ذہنیت میں رچ جاتی ہیں مگر جوانی میں ان میں فطرت زیادہ زوردار ہوتی ہے۔ اسی لئے دیہاتیوں میں لکھنؤ کی عورتیں بڑی تیز اور چالاک مشہور ہیں۔ مگر وہ پھر عورتیں بے بس ہیں اور دبی ہوئی ہیں۔ وہ کیا کر سکتی ہیں!"

"میری بالکل سمجھ میں نہیں آتی تمہاری بکواس" کہہ کر جتو نواب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ میں جانتا ہوں کہ تم نہیں سمجھ سکتے ایسی باتیں۔ تم سے کہنا ہی فضول ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں میں ذرا بلند آواز کے ساتھ سوچ رہا ہوں"

جتو نواب چلے گئے اور عارف اب خاموشی کے ساتھ سوچتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے انور کو آزاد کرانے کے لئے ایک قوم اور ایک پوری تہذیب سے جنگ کرنا ہے۔ یہ ناقص تہذیب یہ زوال پذیر تہذیب ہی ہماری غلامی کی بنیاد ہے۔ اس سے لڑنا چاہئے اس کو ختم کر دینا چاہئے۔ اس کو ضرور ختم کرنے کا ارادہ باندھ کر وہ اٹھا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر پہونچ کر اُسے دو خط ملے ایک انگلینڈ سے آیا ہوا تھا اور دوسرا بریلی سے۔ انگلینڈ کا خط اس نے پہلے پڑھا اس میں اس کے دوست نے جنہیں وہ راجہ کہا کرتا تھا اور جو بی۔ اے کرنے کے بعد انگلینڈ چلے گئے یہ لکھا تھا کہ وہ اور ان کی میم بیوی ہندوستان آنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ بریلی والا خط پرمانک کا تھا۔ اس نے اور باتوں کے علاوہ یہ لکھا تھا: "میری شادی کا کارڈ تمہیں ملا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ضرور آؤ۔ میں نے سنا کہ تم بھی مجھے دھوکے باز

سکتے ہو۔ میں تم سے اپنی صفائی کر لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم کو نرملا سے ویسی ہی ہمدردی ہے جیسے کسی بھائی کو اپنی بہن سے ہو اور اسی ہمدردی کے ماتحت تمہارا اس نتیجہ پر پہونچنا کہ میں نے اسے دھوکا دیا بالکل بجا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری بات بھی سن لو پھر چاہے میرے بابت کوئی رائے قائم کرو مجھے پرواہ نہ ہو گی۔ مجھے نرملا سے محبت تھی اور اب بھی ہے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ کمار کی خودکشی پر مجھے بہت ہی اس کے خلاف ورغلایا گیا مگر میں نے ایک نہ سنی اور میری محبت کسی طرح کم نہ ہوئی۔ میرے والد تم جانتے ہو کہ جاہل اور پرانے خیال کے آدمی ہیں۔ ان کا مقصد حیات یہ ہے کہ میں ان کی تجارت کو اور اُن کی نسل کو اُن کے طریقہ پر بڑھاؤں۔ وہ اپنے ایسے آدمی ہی کی لڑکی سے میری شادی کرنا چاہتے تھے اور ٹھہرا بھی چکے تھے۔ جب اُنہوں نے میری شادی کی ساعت دکھوائی اور ٹیکے کی تاریخ مقرر کرائی تو میں نے اُن سے صاف صاف کہا کہ میں نرملا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت خفہ ہوئے اور مجھے نکال دینے اور عاق کر دینے کی دھمکی دی۔ میں جانتا ہوں کہ اُنہوں نے ہر طرح کی سختیاں جھیلی ہیں اور اس لئے وہ نہایت سخت آدمی ہیں۔ خیر میں نے یہ طے کر لیا کہ ان سے اور اس تمام آسائش سے جو اُنہوں نے میرے لئے مہیا کی ہے الگ ہو جاؤں گا اور نرملا کو نہ چھوڑوں گا۔ چنانچہ اسی دن میں نے نرملا سے یوں پوچھا فرض کرو کہ اگر میں کہیں چالیس پچاس روپیہ پر نوکر ہو جاؤں تو تم کیا کرو گی" وہ بولی "ایسی بدشگونی کی بات نہ کہو۔ ساٹھ روپیہ تو ہم اپنے ڈرائیور کو دیتے ہیں اور اگر تم پچاس کماؤ تو پھر مجھے گھر کا سب کام کرنا پڑے گا یا پھر میں بھی نوکری کروں یہ سب میں نہ برداشت کر سکوں گی، میں خودکشی کر لوں گی،، اس کے بعد سے مجھے احساس ہوا کہ نرملا مجھ سے نہیں بلکہ میرے پیسے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں بہت سوچا کیا۔ بہت فرخ اس سے اور اُس کی والدہ سے بھی باتیں کیں مگر ہر بار یہی خیال لے کر گھر واپس آیا کہ اُن لوگوں کی نگاہ میں میری ذات کی بغیر میرے پیسے کے کوئی وقعت نہیں ہے۔ میں۔ اس نتیجہ پر پہونچا کہ میں کیوں اور کس کے لئے اپنے پر تکلیفیں عائد کروں اور میں نے اپنے والد سے کہہ دیا کہ میری

شادی کر دیجئے۔ اسی رات میں بریلی چلا آیا خود سے والد نے کوئی زور نہیں دیا اور میں نے ہی رائے دی کہ میری شادی بریلی سے ہو لکھنؤ سے نہیں۔ یہ پورا معاملہ ہے اب تم مجھے جو چاہو کہو تمہیں اختیار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری شادی میں آؤ ضرور تم سے بہت بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے "

عارف اس خط کو پڑھتے ہی اس کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے لکھا "میں تم کو کوئی الزام نہیں دیتا اور نہ نرملا ہی کو کسی طرح قصور وار ٹھہرانے کو تیار ہوں۔ کچھ عرصہ سے میں اس زندگی کی سخت حقیقتوں HARD REALITIES کا مشاہدہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ تو قرون وسطیٰ ہی کے دور میں مست پڑے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں میں بھی زیادہ تر لوگ قرون وسطیٰ کی کوٹھری سے نکل کر تعلیم گاہوں میں آسئے تاکہ ان کو نوکری کا پاس پورٹ مل جائے اور وہ پھر اپنی کوٹھری میں واپس ہو گئے۔ یہ لوگ مزے میں ہیں اور ان کو کوئی برا نہیں کہتا۔ اب رہے تم ایسے یا نرملا ایسے لوگ جو زندگی کی قدروں کو بدل ہی دینا چاہتے ہیں یا بدل چکے ہیں۔ ایسے لوگ چاہتے تو بہت کچھ ہیں مگر کر کچھ نہیں سکتے کیونکہ ان کے ماحول میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ان کی مدد کرے۔ وہ سوائے اپنے تئیں تباہ کر دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتے یا پھر اپنے اوپر جبر کر کے اسی قرون وسطیٰ کی تاریک کوٹھری میں واپس جائیں۔ اب تم اپنے اور نرملا کے معاملے کو لو۔ نرملا کے گھر کا ماحول اس کی تعلیم وغیرہ سب نے اسے بالکل اس زمانے کی عورت بنا دیا ہے۔ وہ آرام سے رہی اور آرام طلب ہے اسے محبت کے لئے آرام کھو دینے کے معنے ہی نہیں معلوم۔ شاید وہ محبت تو کر ہی نہیں سکتی۔ اس کے لئے محبت کے معنے شادی کا آغاز ہیں اور شادی کے معنے یہ ہیں کہ اس کے رہن سہن کے طریقوں میں ترقی ہو۔ اگر یہ ممکن نہیں تو محبت بیکار ہے۔ تم بغیر اپنی دولت کے اس کے لئے کوئی معنے ہی نہیں رکھتے اور میں اسے کوئی الزام ہی نہیں دیتا کیونکہ اس کو ایسا بنا دیا گیا ہے۔ اب رہا تمہارا معاملہ تو جو کچھ تم نے کیا وہ بھی بالکل ٹھیک ہے۔ تم اور کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ تمہارے

خط کا ہر لفظ خلوص میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں تمہیں ہرگز الزام نہیں دیتا۔ میں تمہاری شادی میں ضرور آؤں گا۔"

اس خط کو ڈاک میں بھجوانے کے بعد عارف نے کھانا کھایا اور لان میں اپنی مسہری پر لیٹ کر ستاروں کو دیکھتا رہا۔

(۵)

عارف کی فطرت کو قدرت نے اعلیٰ خیالات گہرے جذبات اور لطیف تخیل سے معمور کیا تھا مگر اس کے اندر عملی قوت کی خاص کمی رکھی تھی۔ اس نے سوسائٹی کو بدل دینے کا مصمم ارادہ کیا تھا مگر اس تبدیلی کو پیدا کرنے کی کوئی ترکیب اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سوسائٹی ایک نہایت بے ڈھنگی اور بھیانک بھوتنی کی طرح تھی جس پر وہ دار کرنا چاہتا تھا مگر جو اس کی کمزوری پر عجیب طرح کی طنزیہ ہنسی ہنس رہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ سوچتا جا رہا تھا اس کے جذبات زیادہ سے زیادہ گہرے ہوتے جا رہے تھے اس کی قوت ارادہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتی جا رہی تھی مگر اس کے ذہن میں کوئی تدبیر نہ آتی تھی۔ وہ اپنے دل کو اکثر یہ شعر پڑھ کر تسکین دے لیا کرتا تھا ؎

کچھ دنوں اور ابھی بادیہ پیمائی کر مل ہی جائیگا تجھے ناقۂ لیلےٰ اے قیس

اسی عالم میں اس کا امتحان بھی گزر گیا۔

عابدہ کا امتحان ہو رہا تھا اور بھابی نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس کے بعد ہی شادی ہو جائیگی عارف کو امید تھی کہ جب تک وہ انور کو حاصل کرنے کی کوئی صورت نکال سکے گا اور اس وقت شادی آپ سے آپ دھری رہ جائیگی۔ اسے معلوم تھا کہ انور کے یہاں بچہ ہونے میں جو دن باقی رہا تھا وہ جا رہا تھا۔ جب بچہ ہو گا تو وہ خود جتو کے یہاں کی عورتوں کو لے کر جائے گا۔ ایک دو دن وہاں قیام کرے گا۔ تدبیریں سوچے گا۔ انور اسے چاہتی تو ہے ہی۔ کوئی نہ کوئی ترکیب

ایسی نکل ہی آئیگی کہ انور کو وہ اس کے شوہر سے چھٹا کر اپنے ساتھ شادی کر لے

چنانچہ پہلی اپریل کو بھی وہ ناشتہ کرنے کے بعد پڑھتا رہا اور ایسے ہی منصوبے باندھتا رہا یہاں تک کہ کوئی ساڑھے دس کا وقت ہو گیا اس وقت اس کا نوکر اس کے کمرے کے دروازے پر آیا۔ اس نے منہ اٹھا کر پوچھا "کیا ہے"؟

"او۔ آپ کے اوددست نائی ہین جاب"

"کون ؟"

"ان ہئین جو ٹین کھاتے دیکھت ہین ادہر حکم بیت ہیں"۔

"تو کیا ہوا ان کا ؟"

"ہمکا بیگم صاحب چوک بھیجی رہین تو ہم پاٹے نالے سے جات رہین تو دیکھین ایک سیٹھ کا مردہ ہوان گسل خانہ ہے ناہین تو وہاں سے نکلت ہے۔ ہم ٹھہر گئین۔ پھر دیکھا تو ان ہی پیچھے بناب ساتھ۔ ہم سلام کیا۔ جاب دہن۔ ہم پوچھا کہ آئین یو۔ تو بولے ہمری بہن......

"کیا کہا انہوں نے" اور عارف تڑسے اٹھ کر بیٹھ گیا "کیا جنازہ اپنی بہن کا بتایا"

"ہاں صاحب۔ ہم پوچھا کا بھوا ہے۔ کہن بچہ بھوا دہی ماں مرگئی"

"ارے یہ تو کیا کہہ رہا ہے ؟" وہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کچھ سکوت کے بعد بولا "کدھر گیا جنازہ ؟"

"دبجرا ماڈ کے امام باڑے مین ؟"

"یہ بجرا ماڈ کیا ؟ اچھا ؟ غفران مآب کی خرابی ہے" اور وہ فوراً جلدی جلدی برآمدے میں بڑھا اور موٹر خانے کی طرف روانہ ہوا۔ موٹر خانے کے پاس پہونچ کر اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس کنجی نہیں تھی۔ اس نے پکار کر کہا "ارے بیرو میری شیروانی اتار لا۔ جلدی کر"۔

ایک منٹ کے بعد بیرو شیروانی ہاتھ پر ڈالے لپکتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس نے کہا "ارے تو نے ٹھیک ٹھیک پوچھا تھا ان نواب سے کہ کون مرگئی ہیں ؟"

"بہن کہن ہم ہے تو"

"ارے ان کی سگی بہن یا کوئی رشتے کی؟"

"یہ ہم ناہیں پوچھا؟"

"خیر ہٹ" کہکر اس نے شیروانی کندھوں پر ڈالی - دروازہ کھولا اور موٹر کو باہر نکالا نوکر سے کہا "موٹر خانہ بند کر کے کنجی اپنے پاس رکھ لینا" اور تیزی کے ساتھ غفران مآب کے امام باڑے کی طرف موٹر دوڑاتا چلا - راستے میں اسے کسی چیز کا احساس نہ تھا - اسے شبہ تھا کہ کہیں انور ہی نہ مر گئی ہو مگر پھر خیال ہوتا تھا کہ جبتو کی شاید کوئی اور رشتے کی بہن ہو جس کا جنازہ بدھو نے دیکھا ہو - اس کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا - اس کے ہونٹ خشک تھے اور اس کی توجہ کی طاقت بالکل غائب ہو چکی تھی - کہا نہیں جا سکتا کہ موٹر کس طرح چلتی چلی جا رہی تھی - سڑک کافی صاف تھی اور یہی وجہ ہوئی کہ راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا اور وہ امام باڑے کے پاس پہونچ گیا -

موٹر سے اتر کر بے تحاشہ امام باڑے کے ڈھال پر اترنے لگا - پیر لڑکھڑایا اور قریب تھا کہ گرتا اور لڑھکتا ہوا ڈھال کے نیچے پہونچتا مگر سنبھل گیا - امام باڑے کے اندر داخل ہوا تو دیکھا صحن کے ایک کونے میں ایک جگہ قنات گھری ہوئی ہے اور اس طرح پردہ کر کے نعش قبر میں اُتاری جا رہی ہے - امام باڑے کے دالان کی طرف دیکھا تو کافی تعداد میں آدمی بیٹھے نظر آئے مگر ان میں سے نہ کوئی اس کو پہچانتا تھا نہ وہ کسی کو - دو منٹ وہ سکوت کے عالم میں کھڑا رہا - اتنے میں دوسری طرف کے پھاٹک میں سے نواب مرزا بہادر ٹک ٹک رکھتے ہوئے آتے دکھائی دئے -

عارف کے پاس آکر بولے "ارے - آپ - آئیں - آپ کے چہرے کی کیا حالت ہے - آپ کیوں آ گئے آپ کو کس نے خبر کی؟"

"پہلے یہ بتائیے کہ ہوا کیا"

"کچھ نہیں - دیہاتی لوگ اُجڈ ٹھہرے مار ڈالا لڑکی کو جب یہاں لائے ڈاکٹروں کو دکھانے"

"کس کو۔ کون مرگئی؟"

"وہی انور۔ ہائے کیسی پیاری لڑکی تھی۔"

اب کوئی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ عارف نے اکدم سے اپنے سر پر ہاتھ رکھا اور ماتھے کو دباکر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"ارے آپ کی کیا حالت ہوئی جاتی ہے" اور اپنا داہنا ہاتھ عارف کی طرف یوں اٹھایا جیسے کہ کسی چیز کا وزن کر رہے ہوں۔

"آپ بتایئے کہ یہ سب کیسے ہوا۔ کیونکر ہوا۔"

"تین دن سے اس کے درد لگے ہوئے تھے۔ یہاں خبر بھی نہ کی۔ جب سب دائیاں بوکھلا گئیں تو یہاں لائے اسی گھر گھریا موٹر میں ڈال کے دس بجے رات کو یہاں بڑی کوشش ہوئی۔ مگر سب ڈاکٹرنیوں نے کہا دیر ہوگئی۔ بچہ مرا ہوا اور وہ بھی پیلی ہوگئی۔ زہر پھیل گیا۔ زہر کا پوئزن ہوگیا"

عارف بالکل خاموش تھا۔ ماتھے پر سے ہاتھ تو اس نے اٹھالیا تھا۔ مگر نگاہ زمین پر گڑے ہوئے تھا اور انور کا بہت بیں لپٹا ہوا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ نواب مرزا تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے۔

صحن میں قبر پر سے قنات ہٹا دی گئی۔ جو نواب اور ان کے والد قبر کے پاس کھڑے دکھائی دئے۔ دالان میں سے سب لوگ اٹھ کر قبر کے پاس پہونچے۔ عارف اور نواب مرزا بھی ادھر چلے۔

قبر بند کردی گئی اور اس پر ایک چادر ڈال دی گئی۔ سب لوگ اپنے پنجے اس چادر پر گڑا کر فاتحہ پڑھنے لگے۔ عارف قبر سے چار قدم دور ہی کھڑا رہا۔ اسے کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کان میں جو کی آواز آئی "ہائے انور تو کہاں چلی گئی" اور وہ چونکا۔ منہ اٹھا کر دیکھا کہ جو کی گردن بالکل شانے سے ملی ہوئی ہے۔ منہ ٹیڑھا بنا ہوا ہے اور آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں۔ اس کی نگاہ ان کے والد پر پڑی۔ ان کی کمر بہت ہی زیادہ جھکی ہوئی تھی جسم پورا ہل رہا تھا اور وہ رومال سے آنسو پونچھ رہے تھے۔ بالکل لاشعوری طور پر عارف کے منہ سے زور کے ساتھ ایک "ہائے" نکلی اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

نواب مرزا فوراً دوڑ کر اس کے پاس آئے اور بولے "آیئے آپ چلئے۔ یہ مرنے جینے کے معاملے آپ نہیں برداشت کر سکتے۔"

وہ نہ اپنی جگہ سے ہلا اور نہ کچھ بولا۔ سب قبر کے پاس سے ہٹنے لگے یہاں تک کہ محض ایک تلقین پڑھنے والے وہاں رہ گئے۔ جبو عارف کے پاس آئے اور بولے "تمہارا آدمی مجھے ملا تھا۔"

سب لوگ دوسرے پھاٹک سے باہر نکلنے لگے۔ نواب مرزا نے کہا "آپ کی موٹر تو اس پھاٹک پر ہوگی؟"

عارف نے کچھ نہ کہا نواب مرزا کے ساتھ ساتھ پھاٹک کی طرف بڑھا۔ جبو بھی اس کے ساتھ ہو لئے۔

موٹر کے پاس آکر عارف نے کہا "نواب آپ چلائیے"

"مجھے ابھی کرڈی روٹی کا انتظام کرنا ہے۔ ان کے جبو کے گھر پر"

"وہیں چلئے ان کو وہیں اُتار دیجئے گا۔"

غرض نواب مرزا موٹر چلاتے ہوئے۔ عارف ان کے پاس بیٹھا اور جبو نواب پیچھے بیٹھے جبو نواب کے گھر کی گلی پر پہونچے۔ عارف نے اُتر کر کہا "آپ موٹر لے جایئے اپنا انتظام کیجئے۔ میں ذرا قمر کے یہاں جاتا ہوں"۔ یہ کہکر وہ گلی کے اندر بڑھا دل میں یہ شعر پڑھ رہا تھا ؎

از پریشانیِ دل سوختم و بہرِ علاج　　　　ہم بدریوزہ، دل ہائے پریشاں رفتم

وہ قمر کے گھر کے پاس پہونچا تو دیکھا کہ دروازے پر جبو کا بھائی ببو کھڑا ہے اور اندر سے صاف کسی کے بین کی آواز آرہی ہے "ارے میرے لال میں کیا جانتی تھی کہ تیری جان پر بن جائیگی"۔

عارف نے پوچھا "کیا معاملہ ہے ببو"

"قمر بھائی مرگئے"

"مرگئے کیسے؟"

"انور باجی کے مرنے کی خبر پاکر کوئی چھٹانک بھر افیم کھا گئے۔ مارتے اور دست ہونے لگے اور تھوڑی دیر میں ختم۔ ان کی بڑھیا ردتی ہوئی دوڑی۔ ہماری بھابھو اماں یوں ہی نکلتی ہوئی بھاگ آئیں۔ میں گھر پہ تھا۔ میں بھی پیچھے پیچھے آیا"

عارف سن رہا تھا اور اس کا جسم عجیب طرح سے کانپ رہا تھا۔

"بھائی ابا اور بھائی صاحب نہیں آئے؟"

عارف گم تھا اور کانپ رہا تھا۔ اسے یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے کہ اس کی سوچنے اور محسوس کرنے کی طاقتیں بالکل سلب ہو گئیں۔

کچھ دیر کے بعد نواب مرزا آتے دکھائی دیے۔ پاس آکر عارف سے بولے "ارے آپ کیوں ہلکان ہوں۔ وہ تو مرجاتا ہی۔ حرکتیں ہی اس کی ایسی تھیں چلئے آپ اپنے گھر چلئے"۔

یہ نواب مرزا نے کچھ اس انداز سے کہا کہ عارف کچھ چونکا اور اسے اپنی سوچنے کی قوت واپس آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے نواب مرزا کے چہرہ کو غور سے دیکھا۔ وہ کہتے رہے "اماواہ ایک نہ شد دو شد۔ اسے بھی آج ہی مرنے کو رہ گیا تھا۔ اما۔ ایک آدھ دن بعد مرتا"

"اچھا آپ میری موٹر لے کر جائیے اور دفن کفن کا انتظام کیجئے۔ میں گھر نہ جاؤں گا"۔

نواب مرزا جو کے ساتھ گھر کے اندر چلے گئے۔ عارف گلی میں چہل قدمی کرتا ہوا جو کے مکان کی طرف بڑھا۔ کچھ دور ہی گیا تھا کہ جو کو اپنے دروازے سے نکل کر آتے دیکھا۔

اس کے پاس آکر جو بولے "تم اب گھر جا رہے ہو"

"نہیں۔ میں قمر کو دفن کرانے کے بعد جاؤں گا"۔

"کیوں؟ اچھا تو آؤ ہمارے یہاں بیٹھو"

دونوں ساتھ ساتھ گئے اور جو کے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک دیوار سے ملا ہوا ایک بڑا تخت بچھا تھا جس پر ایک میلا گاؤ تکیہ پڑا ہوا تھا۔ دوسری دیوار سے ملا ہوا ایک جھنگولا پلنگ پڑا تھا جس کی ادوان ندارد تھی۔ عارف اسی پلنگ پر لیٹنے لگا۔

"ارے ارے - اس پر" جبو نے کہا -

مگر وہ لیٹ ہی گیا اور بولا "وہ گاؤ تکیہ ادھر اٹھا دو" جبو نے گاؤ تکیہ اس کے سرہانے رکھ دیا اور اس نے کہا "یہ دیکھو کسی آرام کرسی سے بہتر ہو گیا یہ پلنگ - جی چاہتا ہے کہ اس پر یوں ہی لیٹے رہیں زندگی بھر تصور جاناں کئے ہوئے" اور پھر وہ خاموش ہو گیا اور داہنے ہاتھ سے اپنا ماتھا پکڑ کر کنپٹیوں کو دبانے لگا -

"میں ابھی آیا" کہہ کر جبو گھر میں کھسک گئے - عارف اب یہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی زبردست دھکا کھا کر چوندھیا گیا تھا - مگر اب اس کی آنکھیں کھل رہی تھیں اور وہ اپنے نئیں ایک عالم خواب سے نکلتا ہوا محسوس کر رہا تھا - اس نے سوچا کہ اسے کبھی یہ خیال بھی نہ ہوا تھا کہ قسمت یا کائنات کا پُراسرار اصول اسے یوں پسپا کر دے گا - وہ سوسائٹی سے لڑنے کی تیاری کرتا رہا مگر اسے یہ خیال نہ تھا کہ ایک اور دشمن بھی اس کے سامنے آئیگا جس سے اس کا کوئی بس نہ چل سکے گا - اسے ملٹن کے مرثیہ "لسیڈاس" کے وہ اشعار یاد آرہے تھے جس میں اس معجز بیان نے موت کی تصویر کھینچی ہے - خاص طور پر ان مصرعوں کے کمال ہم آہنگی پر وہ سر دھننے لگا -

COMES THE BLIND FURY WITH THE ABHORRED SHEARS

AND SLITS THE THIN SPUN LIFE."

ہر ایک ترکیب اپنے معنے اور اپنے ترنم میں کمال نظر آئی اور اس نے زندگی میں پہلی دفعہ محسوس کیا کہ شاعری کہاں تک زندگی کی گہرائی میں لے جا سکتی ہے اور مردہ دل میں غم کے جذبات کی صفائی کر کے انسان کو کشمکش زندگی کے لئے مستعد بنا سکتی ہے - اسے وہ پورا قطعہ یاد تھا جس کے مصرع اوپر درج کئے گئے ہیں اور وہ اس کو دوہراتا گیا اور اپنے اندر ایک نئی زندگی پیدا ہوتی محسوس کرتا گیا -

جبو نواب کے والد باہر سے ڈیوڑھی میں داخل ہوئے - عارف انہیں دیکھکر کھڑا ہو گیا اور سلام کیا - انہوں نے دعا دی اور اندر کے دروازے کی طرف بڑھے پھر پلٹ کے عارف کو دیکھا

اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "آپ کو معلوم ہو! پرسوں ہوگی مجلس سیوم کی" اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

جو اندر سے داخل ہوئے۔ ان کے والد نے کہا "ارے بھئی ان کو اس جھنگولے پر لٹا دیا!"

"یہ مانتے ہی نہیں۔ میں نے تو کہا تھا کہ یہ اپنے گھر جا کر آرام کریں۔ مگر یہ قمر بھائی کی میت میں شریک ہی ہو کر جائیں گے!"

"اچھا۔ مگر میں تو بھئی اب نہیں چل سکتا۔ ہائے دل ٹوٹ گیا الگ، اور پنڈہ درد کر رہا ہے جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا ہے مجھ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا۔۔۔۔۔" اور یہی کہتے ہوئے وہ گھر کے اندر چلے گئے۔

جو بھی گھر کے اندر گئے اور ایک لمحہ کے بعد حقہ ہاتھ میں لئے ہوئے واپس آئے۔ تخت پر بیٹھ کر حقہ پینے لگے اور بولے "میں حقہ لئے آرہا تھا۔ دیکھا یہاں بھائی ابا۔ حقہ میں نے کونے میں چھپا دیا تھا!"

عارف نے جو کو دیکھا اور یہ شعر پڑھا ؎

"خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی"

جو منہ جھکائے حقہ کا دھواں اڑاتے رہے۔

گھر کے اندر سے افسر ایک تھالی پر پان رکھے ہوئے آئی۔ جو نے آنکھ سے اشارہ کیا اور اس نے تھالی عارف کے سامنے بڑھا دی۔ عارف نے اس کے معصوم چہرے کو نہایت ہی لطیف جذبات کے ساتھ دیکھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور گول گول منہ کسی طرح انور کی یاد نہیں دلاتا تھا۔ مگر وہ انور کی بہن تھی، وہی ماحول، وہی قسمت، وہی اصول زندگی اس کے سامنے بھی آنے والے تھے۔ وہ عارف کو لکھنؤ کے تمام ماحول کا اشارہ معلوم ہوئی بالکل اسی طرح جیسے کہ کسی نے تو کا نقشہ کھینچتے کھینچتے وہ تشبیہ دی ہے جس میں ایک دیہات کا منظر ہے اور ایک دیہاتی لڑکی ہے۔ جس کو پورے منظر کی روح بتایا ہے۔ عارف کا خیال فوراً "پیراڈائز لاسٹ" کے اس حصے کی طرف گیا اور افسر اسے ایک آفاقی چیز معلوم ہوئی۔ افسر اسے کچھ تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پان

اُٹھا کر اپنے منہ میں رکھے اور افسر عجب پھرتی کے ساتھ گھر میں بھاگ گئی۔

عارف نے جتو کی طرف رخ کر کے کہا "اس بچی کو معلوم ہی نہیں کہ کیا ہوا۔ یہ جانتی ہی نہیں کہ موت کیا چیز ہے۔ یہ مکمل زندگی ہے جسے موت کے شائبے تک کا احساس نہیں۔ یہ لافانی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے جو فلیکر نے کہی ہے۔

جتو نے اپنی بائیں آنکھ سے اسے دیکھا اور کچھ نہ کہا۔

نواب مرزا آئے منہ میں پان بھرے ہوئے داہنے ہاتھ سے خلال کرتے ہوئے اور بولے "چلئے میت جا رہی ہے"

AND SWEAR THAT BEAUTY LIVES
THOUGH LILIES DIE

عارف ان کے ساتھ گیا۔ میت کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ وہ قمر کی زندگی پر سوچ رہا تھا۔ قمر کی موت بھی خودکشی ہوئی۔ ویسی ہی جیسے کمار کی۔ کمار نے اکدم سے وہی کچھ کیا جو قمر سال بھر سے کر رہا تھا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوا۔

میت غسل خانہ پہونچی۔ وہاں کافی تعداد میں لوگ آ گئے تھے اور آپس میں ایسی گپیں لڑاتے رہے جیسے کہ کسی میت میں شریک ہی نہ تھے۔ عارف کو پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ عام لوگوں کو احساس غم کتنا ہلکا ہوا کرتا ہے۔ موت کا منظر سامنے بھی ہو تو بھی زندگی کے متفرقات ہی میں محو رہتے ہیں۔ ع۔ دیکھتا ہوں جس کو میں اس انجمن میں مست ہے

غرض جھٹ پٹے کے وقت تک تمام رسوم پوری ہو گئیں اور قمر کو انور کے پاس دفن کر کے سب لوگ امام باڑے کے باہر آئے۔

عارف کی موٹر کے پاس پہونچ کر نواب مرزا نے کہا "لیجئے آپ جائیے۔ ہلکان ہو گئے دن بھر خواہ مخواہ کے لئے"

"آپ ہی مجھے پہونچا دیجئے۔ اُدھر سے تانگے پر واپس آ جائیے گا"

نواب مرزا موٹر چلاتے ہوئے اور عارف ان کے پاس بیٹھ کر چلے۔

"اُئیں نہیں تو آپ کو کس نے خبر کردی تھی۔ میں نے منیر میاں کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی آپ لوگ جاہل لوگ ہیں مرنے ورنے کے معاملے کیا جانیں۔ آئینہ میں جاکر دیکھئے گا صورت کتنی وحشت زدہ ہوگئی ہے گی۔"

عارف سوچ میں گم تھا اور کچھ نہ بولا۔

کچھ دور جاکر نواب مرزا بولے "بھئی واللہ میں تو کہتا ہوں کہ یہ میرا ششرا بڑا نشیبہ در ہے۔ دیکھئے۔ ہر طرف اسے فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔ بڑی لڑکی کا میں میاں دن رات اسکے سب کام مفت کرتا ہوں۔ دوسری لڑکی کا میاں مرگیا مگر حق شوہریت کا وثیقہ تو چھوڑ گیا۔

"شوہریت یا زوجیت"

ارے وہ جوزیت ایک ہی بات ہے۔ اور اب جو دیکھئے قمر مرگیا۔ وہ تو اسی دن مرگیا تھا جس دن انور کی شادی ٹھہری اور دیکھئے کوئی سب ملا کے کوئی پچاس روپیہ کی آمدنی چھوڑ گیا جو ہماری شاش کو ملے گی سمجھئے سسرے کو ملے گی۔ اب اور افیم کھایا کرے گا اور رشگوسے اڑائے گا اور کھٹیاں۔ اور آپ نے سنا" انہوں نے عارف کی طرف نگاہ کی اور کہا "وہ اسکی پھوپھی جیسے بڑھیا۔ قبر میں تو پیر لٹکائے بیٹھی ہے اور اتنا ڈرتی ہے موت سے میں کیا کہوں اپنی طرف کے سب دروازے بند کرالئے اور حکم لگا دیا کہ کوئی نہ آنے پائے ادھر۔"

"وہ لکھنو کی تہذیب میں شاید وہ کبھی نہ مریں گی"

"میں نے تو کہا کہ آپ نہیں سمجھتے۔ وہ تہذیب وہذیب کچھ نہیں ہے۔ بالکل بدتمیز ہے خود غرض ہے، کمینی ہے اور کہیں شادی ہو تو پہلے پہو نچے گی لدکے کھٹولے پہ"

عارف پھر خاموش رہا۔

"چھوڑیئے یہ سب باتیں۔ اب آپ کی شادی ہوگی واللہ۔ مجھ سے اور آشف میاں سے جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا اور ابھی کیا ہوگا ہو کے رہے گا۔ چلے ہیں اپنی ٹمی چوسی کرنے۔ کہنے لگے یوں ہی شادی ہوجائیگی بس۔ واہ خوب میں نہیں دیکھ سکتا۔ کہتے ہیں ڈھوں ڈھوں۔ پوں

پڑں فضول خرچی ہے۔ واہ جیسے ان کا ہی تو اُٹھے گا روپیہ۔ آپ کا روپیہ الگ ہے۔ تو نہیں میرا نام نواب مرزا بہادر جو ایسی برات نہ کروں کہ دولہا گھڑی پہ ہو اور نشان کا ہاتھی دولہن کے گھر پہونچ جائے۔ سات رنگ کے باجے احسین آباد کا شاہراہ جلوس واللہ ہو کے رہے گا۔ شونے کا سہرا ہو۔ شونے چاندی کے پھول لٹاتا ہوا لے جاؤنگا۔۔ ارے آپ بولتے نہیں چپ کیوں ہیں؟"

عارف نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر کہا۔ "لیجئے آپ تانگے پر واپس جایئے گا یہ کرایہ ہے۔ اور ان کے کوٹ کی جیب میں روپیہ ڈالدیا" موٹر اس کے بنگلے کے پاس پہونچ گئی۔

موٹر بنگلے کے اندر داخل ہو رہی تھی تو نواب مرزا بولے "آپ تو چپ ہی رہے۔ میری بات کا جواب نہ دیا"

"جو آپ نے کہا۔ جو آپ کہیں وہی ٹھیک"

نواب مرزا موٹر کو موٹر خانے میں بند کر کے رپ رپ کرتے چلے گئے۔ عارف اپنے کمرے میں آیا اور شیروانی بغیر اُتارے مسہری پر پڑ گیا۔